قال اللہ تعالیٰ: يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ (المطففین)

الرحیق المختوم

رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ
سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ میں اوّل آنے والی عربی کتاب کا
اُردو ترجمہ

ترجمہ و تصنیف

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

المکتبۃ السلفیۃ

شیش محل روڈ، لاہور، پاکستان

Registration number 4371 Copyright

اِس کتاب کے جملہ حقوقِ ترجمہ، نقل و اشاعت
پاکستان میں "المکتبۃ السلفیۃ" لاہور، اور
ہندوستان میں مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری
کے حق میں محفوظ ہیں۔

محرّم الحرام ۱۴۲۱ھ / مئی ۲۰۰۰ء

قیمت: مجلّد (سفید آفسٹ پیپر) -/۲۸۰ روپے

شیش محل روڈ۔ لاہور 54000 پاکستان
ٹیلیفون: 042-7237184 ۔ فیکس: 042-7227981
باہتمام: احمد شاکر ـــــ مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور
واحد تقسیم کنندگان ـــــ دار الکتب السلفیۃ۔ شیش محل روڈ۔ لاہور

تمنّا

ہر مسلمان زندگی بھر ایسے اعمال کرنے میں کوشاں رہتا ہے جن کے باعث اُس کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب ہو جائے۔

یہی تمنا، آرزو اور خواہش "الرحیق المختوم" کی سعیِ طباعت کا باعث بنی۔

"الرحیق المختوم" سے اگر اُسوۂ حسنہ پر شوقِ عمل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں رُوحِ جہاد بھی بیدار ہو جائے تو الحمد للہ، کیونکہ یہی اِس کتابِ سیرت کا اِمتیاز ہے۔

امیدِ شفاعت: صفی الرحمٰن مبارکپوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر (طبعِ جدید)

الرحیق المختوم کی یہ تازہ اشاعت، جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کا جدید ایڈیشن ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس بابرکت کتاب کو جس مقبولیت سے نوازا اور صاحبِ ذوق قارئین نے جس طرح اِس کی پذیرائی فرمائی اِس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

طبعِ اوّل میں بعض اہلِ علم اور اصحابِ دانش بالخصوص جناب ڈاکٹر سعید اقبال قریشی اور محترم جناب محمد عالم مختار الحق نے بعض تسامحات کی نشاندہی فرمائی، اِن مقامات کا اصل عربی کتاب سے تقابل کا مرحلہ برادرم مولانا نعیم الحق نعیم نے اور صحتِ کتابت کا جناب محمد صدیق گلزار نے طے کیا۔ جزاھم اللہ تعالیٰ

طبعِ ہذا میں "الرحیق المختوم" سے مستفید ہونے والے ایک دوست جناب ذوالفقار کاظم نے دورانِ مطالعہ کتاب میں آمدہ بعض مشکل ناموں پر اعراب، نامانوس الفاظ کا ترجمہ اور وقوف وغیرہ کی از خود نشاندہی کر کے ایک نسخہ ارسال فرمایا، جن میں سے اکثر مشورے عربی کتاب سے تقابل کے بعد قبول کر لیے گئے۔

علاوہ ازیں اِس اشاعت میں کاغذ کی موجودہ ہوشربا گرانی کے سبب فی صفحہ تین سطریں اضافہ کر کے ضخامت کم کرنے کی سعی کی گئی ہے تاکہ کتاب عام قاری کی قوتِ خرید میں رہے، اس کے ساتھ ساتھ معیار میں بہتری کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اِس ترتیبِ نو کو برادرِ عزیز جناب علی احمد صابر چشتی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا نیز انہوں نے کتاب کے عربی متن اور عنوانات کی از سرِ نو کتابت فرما کر زادِ آخرت بنا لیا۔ تقبل اللہ منہ

اِس بابرکت کتاب میں اب تک جس ساتھی نے بھی تعاون کیا اس کے پیشِ نظر سیرتِ نبویہ شریفہ کی خدمت برائے حصولِ سعادت ہی رہی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

الراجی الی رحمۃ ربہ الغفار

احمد شاکر

غفرلہٗ ولوالدیہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ / اکتوبر ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
عرض ناشر	۱۲
مقدمہ طبع سوم (عربی)	۱۶
پیش لفظ	۱۹
عرض مؤلف	۲۲
اپنی سرگزشت	۲۷
زیر نظر کتاب کے بارے میں (از مؤلف)	۳۱
عرب ۔ محل وقوع اور قومیں	۳۳
عرب قومیں	۳۴
عرب مستعربہ	۳۶
عرب ۔ حکومتیں اور سرداریاں	۴۳
یمن کی بادشاہی	۴۳
حیرہ کی بادشاہی	۴۵
شام کی بادشاہی	۴۷
حجاز کی امارت	۴۸
بقیہ عرب سرداریاں	۵۴
سیاسی حالت	۵۵
عرب ۔ ادیان و مذاہب	۵۷
دین ابراہیمی میں قریش کی بدعات	۶۲
دینی حالت	۶۷
جاہلی معاشرے کی چند جھلکیاں	۶۸
اجتماعی حالات	۶۸
اقتصادی حالت	۷۱
اخلاق	۷۲
خاندانِ نبوت	۷۵
نسب	۷۵
خانوادہ	۷۶
چاہِ زمزم کی کھدائی	۷۸
واقعۂ فیل	۷۹
عبداللہ ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ محترم	۸۰
ولادت باسعادت اور حیاتِ طیبہ کے چالیس سال	۸۳
ولادتِ باسعادت	۸۳
بنی سعد میں	۸۴
واقعۂ شقِ صدر	۸۶
ماں کی آغوشِ محبت میں	۸۷
دادا کے سایۂ شفقت میں	۸۷
شفیق چچا کی کفالت میں	۸۸
روئے مبارک سے فیضانِ باراں کی طلب	۸۸
بحیرا راہب	۸۸
جنگِ فجار	۸۹
حلف الفضول	۸۹
بھاکشی کی زندگی	۹۰
حضرت خدیجہؓ سے شادی	۹۱
کعبہ کی تعمیر اور حجرِ اسود کے تنازعہ کا فیصلہ	۹۲
نبوت سے پہلے کی اجمالی سیرت	۹۳
نبوت و رسالت کی چھاؤں میں	۹۶
غارِ حرا کے اندر	۹۶
جبریلؑ وحی لاتے ہیں	۹۷
آغازِ وحی کا مہینہ، دن اور تاریخ (حاشیہ)	۹۷
وحی کی بندش	۱۰۱
جبریلؑ دوبارہ وحی لاتے ہیں	۱۰۱
وحی کی اقسام	۱۰۲
تبلیغ کا حکم اور اس کے مضمرات	۱۰۴
دعوت کے ادوار و مراحل	۱۰۷
پہلا مرحلہ:	
کاوشِ تبلیغ	۱۰۸
خفیہ دعوت کے تین سال	۱۰۸
اولین رہروانِ اسلام	۱۰۸
نماز	۱۱۰

مضمون	صفحہ
قریش کو اجمالی خبر	۱۱۱
دوسرا مرحلہ :	
کھلی تبلیغ	۱۱۲
اظہارِ دعوت کا پہلا حکم	۱۱۲
قرابت داروں میں تبلیغ	۱۱۲
کوہِ صفا پر	۱۱۳
حق کا واشگاف اعلان اور مشرکین کا ردِ عمل	۱۱۴
قریش، ابوطالب کی خدمت میں	۱۱۶
حجاج کو روکنے کے لیے مجلسِ شوریٰ	۱۱۶
محاذ آرائی کے مختلف انداز	۱۱۸
محاذ آرائی کی دوسری صورت	۱۱۹
محاذ آرائی کی تیسری صورت	۱۲۰
محاذ آرائی کی چوتھی صورت	۱۲۱
ظلم و جور	۱۲۲
دارِ ارقم	۱۳۰
پہلی ہجرتِ حبشہ	۱۳۱
دوسری ہجرتِ حبشہ	۱۳۴
مہاجرینِ حبشہ کے خلاف قریش کی سازش	۱۳۵
ابوطالب کو قریش کی دھمکی	۱۳۹
قریش ایک بار پھر ابوطالب کے سامنے	۱۴۰
نبی ﷺ کے قتل کی تجویز	۱۴۱
حضرت حمزہؓ کا قبولِ اسلام	۱۴۴
حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام	۱۴۵
قریش کا نمائندہ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں	۱۵۲
ابوطالب، بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو جمع کرتے ہیں	۱۵۵
مکمل بائیکاٹ	۱۵۷
ظلم و ستم کا پیمان	۱۵۷
تین سال شعب ابی طالب میں	۱۵۸
صحیفہ چاک کیا جاتا ہے۔	۱۵۹
ابوطالب کی خدمت میں قریش کا آخری وفد	۱۶۲
غم کا سال	۱۶۵
ابوطالب کی وفات	۱۶۵
حضرت خدیجہؓ جوارِ رحمت میں	۱۶۶

مضمون	صفحہ
غم ہی غم	۱۶۷
حضرت سودہؓ سے شادی	۱۶۸
ابتدائی مسلمانوں کا صبر و ثبات اور اس کے اسباب و عوامل ----------	۱۶۹
تیسرا مرحلہ :	
بیرونِ مکہ دعوتِ اسلام	۱۸۰
رسول اللہ ﷺ طائف میں	۱۸۰
قبائل اور افراد کو اسلام کی دعوت	۱۸۷
وہ قبائل جنہیں اسلام کی دعوت دی گئی	۱۸۷
ایمان کی شعائیں مکے سے باہر	۱۸۹
یثرب کی چھ سعادت مند روحیں	۱۹۴
حضرت عائشہؓ سے نکاح	۱۹۶
اسراء اور معراج	۱۹۷
پہلی بیعتِ عقبہ	۲۰۵
مدینہ میں اسلام کا سفیر	۲۰۶
قابلِ رشک کامیابی	۲۰۶
دوسری بیعتِ عقبہ	۲۱۰
گفتگو کا آغاز اور حضرت عباسؓ کی طرف سے معاملے کی نزاکت کی تشریح ----------	۲۱۱
بیعت کی دفعات	۲۱۲
خطرناک بیعت کی مکرر یاد دہانی	۲۱۳
بیعت کی تکمیل	۲۱۴
بارہ نقیب	۲۱۵
شیطان معاہدے کا انکشاف کرتا ہے۔	۲۱۶
قریش پر ضرب لگانے کیلیے انصار کی مستعدی	۲۱۶
رؤساءِ یثرب سے قریش کا احتجاج	۲۱۷
خبر کا یقین اور بیعت کرنے والوں کا تعاقب	۲۱۷
ہجرت کے ہراول دستے	۲۱۹
قریش کی پارلیمنٹ، دار الندوہ میں	۲۲۳
پارلیمانی بحث اور نبی ﷺ کے قتل کی ظالمانہ قرار داد پر اتفاق ----------	۲۲۴
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت	۲۲۶
رسول اللہ ﷺ کے مکان کا گھیراؤ	۲۲۷

مضمون	صفحہ
رسول اللہ ﷺ اپنا گھر چھوڑتے ہیں	۲۲۸
گھر سے غار تک	۲۲۹
غار میں	۲۳۰
قریش کی تگ و دو	۲۳۱
مدینے کی راہ میں	۲۳۲
قبا میں تشریف آوری	۲۳۸
مدینے میں داخلہ	۲۴۰
مدنی زندگی	۲۴۳
پہلا مرحلہ:	
ہجرت کے وقت مدینے کے حالات	۲۴۴
نئے معاشرے کی تشکیل	۲۵۴
مسجدِ نبوی کی تعمیر	۲۵۴
مسلمانوں کی بھائی چارگی	۲۵۵
اسلامی تعاون کا پیمان	۲۵۷
معاشرے پر معنویات کا اثر	۲۵۹
یہود کے ساتھ معاہدہ	۲۶۳
معاہدے کی دفعات	۲۶۳
مسلح کشاکش	۲۶۵
ہجرت کے بعد مسلمانوں کے خلاف قریش کی فتنہ خیزیاں اور عبداللہ بن اُبی سے نامہ و پیام	۲۶۵
مسلمانوں پر مسجدِ حرام کا دروازہ بند کیے جانے کا اعلان	۲۶۶
مہاجرین کو قریش کی دھمکی	۲۶۷
جنگ کی اجازت	۲۶۷
سرایا اور غزوات	۲۶۹
سریۂ سیف البحر	۲۶۹
سریۂ رابغ	۲۷۰
سریۂ خرّار	۲۷۰
غزوۂ ابواء یا ودّان	۲۷۱
غزوۂ بُواط	۲۷۱
غزوۂ سفوان	۲۷۲
غزوۂ ذی العشیرہ	۲۷۲
سریۂ نخلہ	۲۷۳
غزوۂ بدر کبریٰ اسلام کا پہلا فیصلہ کن معرکہ	۲۷۹

مضمون	صفحہ
غزوے کا سبب	۲۷۹
اسلامی لشکر کی تعداد اور کمان کی تقسیم	۲۷۹
بدر کی جانب اسلامی لشکر کی روانگی	۲۸۰
مکے میں خطرے کا اعلان	۲۸۱
جنگ کے لیے اہلِ مکہ کی تیاری	۲۸۱
مکی لشکر کی تعداد	۲۸۱
قبائلِ بنو بکر کا مسئلہ	۲۸۲
جیشِ مکہ کی روانگی	۲۸۲
قافلہ بچ نکلا	۲۸۲
مکی لشکر کا ارادۂ واپسی اور باہمی پھوٹ	۲۸۳
اسلامی لشکر کے لیے حالات کی نزاکت	۲۸۳
مجلسِ شوریٰ کا اجتماع	۲۸۴
اسلامی لشکر کا بقیہ سفر	۲۸۶
جاسوسی کا اقدام	۲۸۶
لشکرِ مکہ کے بارے میں اہم معلومات کا حصول	۲۸۷
بارانِ رحمت کا نزول	۲۸۸
اہم فوجی مراکز کی طرف اسلامی لشکر کی سبقت	۲۸۸
مرکزِ قیادت	۲۸۹
لشکر کی ترتیب اور شب گزاری	۲۸۹
میدانِ جنگ میں مکی لشکر کا باہمی اختلاف	۲۹۰
دونوں لشکر آمنے سامنے	۲۹۲
نقطۂ صفر اور معرکے کا پہلا ایندھن	۲۹۴
مبارزت	۲۹۴
عام ہجوم	۲۹۵
رسول اللہ ﷺ کی دُعا	۲۹۵
فرشتوں کا نزول	۲۹۶
جوابی حملہ	۲۹۷
میدان سے ابلیس کا فرار	۲۹۹
شکستِ فاش	۲۹۹
ابوجہل کی اکڑ	۲۹۹
ابوجہل کا قتل	۳۰۰
ایمان کے تابناک نقوش	۳۰۲
فریقین کے مقتولین	۳۰۶

مضمون	صفحہ
مکے میں شکست کی خبر	۳۰۷
مدینے میں فتح کی خوش خبری	۳۰۹
مالِ غنیمت کا مسئلہ	۳۱۰
اسلامی لشکر مدینے کی راہ میں	۳۱۱
تہنیت کے وفود	۳۱۲
قیدیوں کا قضیہ	۳۱۳
قرآن کا تبصرہ	۳۱۵
متفرق واقعات	۳۱۷
بدر کے بعد جنگی سرگرمیاں	۳۱۹
غزوۂ بنی سُلیم بہ مقام کدر	۳۲۰
نبی ﷺ کے قتل کی سازش	۳۲۱
غزوۂ بنی قینقاع	۳۲۳
یہود کی عیاری کا ایک نمونہ	۳۲۳
بنی قینقاع کی عہد شکنی	۳۲۵
محاصرہ، سپردگی اور جلاوطنی	۳۲۷
غزوۂ سَوِیق	۳۲۹
غزوۂ ذی امر	۳۳۰
کعب بن اشرف کا قتل	۳۳۱
غزوۂ بحران	۳۳۵
سَریّۂ زید بن حارثہ	۳۳۶
غزوۂ اُحد	۳۳۸
انتقامی جنگ کے لیے قریش کی تیاری	۳۳۸
قریش کا لشکر، سامانِ جنگ اور کمان	۳۳۹
مکی لشکر کی روانگی	۳۴۰
مدینے میں اطلاع	۳۴۰
ہنگامی صورتحال کے مقابلے کی تیاری	۳۴۰
مکی لشکر مدینے کے دامن میں	۳۴۱
مدینے کی دفاعی حکمتِ عملی کے لیے مجلس شورٰے کا اجلاس ----------	۳۴۱
اسلامی لشکر کی ترتیب اور جنگ کے لیے روانگی	۳۴۳
لشکر کا معائنہ	۳۴۴
اُحد اور مدینے کے درمیان شب گزاری	۳۴۵
عبداللہ بن اُبَی اور اس کے ساتھیوں کی سرکشی	۳۴۵

مضمون	صفحہ
بقیہ اسلامی لشکر دامنِ اُحد میں	۳۴۶
دفاعی منصوبہ	۳۴۷
نبی ﷺ شجاعت کی رُوح پھونکتے ہیں	۳۴۹
مکی لشکر کی تنظیم	۳۴۹
قریش کی سیاسی چال بازی	۳۵۰
جوش و ہمت دلانے کیلیے قریشی عورتوں کی تگ و تاز	۳۵۱
جنگ کا پہلا ایندھن	۳۵۲
معرکہ کا مرکزِ ثقل اور علم داروں کا صفایا	۳۵۲
بقیہ حصوں میں جنگ کی کیفیت	۳۵۴
شیرِ خدا حضرت حمزہؓ کی شہادت	۳۵۶
مُسلمانوں کی بالادستی	۳۵۷
عورت کی آغوش سے تلوار کی دھار پر	۳۵۷
تیر اندازوں کا کارنامہ	۳۵۷
مشرکین کی شکست	۳۵۸
تیر اندازوں کی خوفناک غلطی	۳۵۸
اسلامی لشکر مشرکین کے نرغے میں	۳۵۹
رسول اللہ ﷺ کا پُرخطر فیصلہ اور دلیرانہ اقدام	۳۶۰
مسلمانوں میں انتشار	۳۶۱
رسول اللہ ﷺ کے گرد خُوں ریز معرکہ	۳۶۳
رسول اللہ ﷺ کے پاس صحابہؓ کے اکٹھا ہونے کی ابتدا ----------	۳۶۷
مشرکین کے دباؤ میں اضافہ	۳۶۹
نادرۂ روزگار جاں بازی	۳۷۰
نبی ﷺ کی شہادت کی خبر اور معرکے پر اسکا اثر	۳۷۲
رسُول اللہ ﷺ کی پیہم معرکہ آرائی اور حالات پر قابُو	۳۷۲
اُبَی بن خلف کا قتل	۳۷۴
حضرت طلحہؓ، نبی ﷺ کو اُٹھاتے ہیں	۳۷۴
مشرکین کا آخری حملہ	۳۷۵
شہداء کا مُثلہ	۳۷۵
آخر تک جنگ لڑنے کیلیے مُسلمانوں کی مستعدی	۳۷۶
گھاٹی میں قرار یابی کے بعد	۳۷۷
ابُوسفیان کی شماتت اور حضرت عمرؓ سے دو دو باتیں	۳۷۸
بدر میں ایک اور جنگ لڑنے کا عہد و پیمان	۳۷۹

مضمون	صفحہ
مُشرکین کے موقف کی تحقیق	۳۷۹
شہیدوں اور زخمیوں کی خبرگیری	۳۸۰
رسول اللہ ﷺ اللہ عزوجل کی ثنا کرتے اور اس سے دُعا فرماتے ہیں ----------	۳۸۳
مدینے کو واپسی اور محبت و جاں سپاری کے نادر واقعات	۳۸۴
رسُول اللہ ﷺ مدینے میں	۳۸۵
مدینے میں ہنگامی حالت	۳۸۵
غزوۂ حمراء الاسد	۳۸۶
جنگِ اُحد میں فتح و شکست کا ایک تجزیہ	۳۸۹
اِس غزوے پر قرآن کا تبصرہ	۳۹۱
غزوے میں کارفرما خدائی مقاصد اور حکمتیں	۳۹۱
اُحد کے بعد کی فوجی مہمات	۳۹۴
سَریۂ ابوسلمہ	۳۹۴
عبداللہ بن انیس کی مہم	۳۹۵
رجیع کا حادثہ	۳۹۵
بئرِ معونہ کا المیہ	۳۹۸
غزوۂ بنی نضیر	۴۰۰
غزوۂ نجد	۴۰۴
غزوۂ بدر دوم	۴۰۶
غزوۂ دُومۃ الجُندل	۴۰۷
غزوۂ احزاب (جنگِ خندق)	۴۰۹
غزوۂ بنو قریظہ	۴۲۶
غزوۂ احزاب و قریظہ کے بعد کی جنگی مہمات	۴۳۴
سلام بن ابی الحقیق کا قتل	۴۳۴
سَریۂ محمد بن مسلمہؓ	۴۳۶
غزوۂ بنو لحیان	۴۳۷
سَریۂ غَمر	۴۳۸
سَریۂ ذوالقصہ (۱)	۴۳۸
سَریۂ ذوالقصہ (۲)	۴۳۹
سَریۂ جموم	۴۳۹
سَریۂ عیص	۴۳۹
سَریۂ طرف یا طرق	۴۴۰
سَریۂ وادی القریٰ	۴۴۰
سَریۂ خبط	۴۴۰
غزوۂ بنی المصطلق یا غزوۂ مریسیع ۵ھ/۶ھ	۴۴۲
غزوۂ بنی المصطلق سے پہلے منافقین کا رویّہ	۴۴۴
غزوۂ بنی المصطلق میں منافقین کا کردار	۴۴۹
مدینے سے ذلیل ترین آدمی کو نکالنے کی بات	۴۴۹
واقعۂ افک	۴۵۲
غزوۂ مُریسیع کے بعد کی فوجی مہمات	۴۵۶
سَریۂ دار بنی کلب ۔ علاقہ دومۃ الجندل	۴۵۶
سَریۂ دیار بنی سعد ۔ علاقہ فدک	۴۵۶
سَریۂ وادی القریٰ	۴۵۶
سَریۂ عرنیین	۴۵۷
صُلحِ حُدیبیہ (ذی قعدہ ۶ھ)	۴۵۹
عمرۂ حُدیبیہ کا سبب	۴۵۹
مسلمانوں میں روانگی کا اعلان	۴۵۹
مکّے کی جانب مسلمانوں کی حرکت	۴۵۹
بیت اللہ سے مُسلمانوں کو روکنے کی کوشش	۴۶۰
خُوں ریز ٹکراؤ سے بچنے کی کوشش اور راستے کی تبدیلی ----------	۴۶۰
بدیل بن ورقاء کا توسُّط	۴۶۱
قریش کے ایلچی	۴۶۲
وہی ہے جس نے اُن کے ہاتھ تم سے روکے	۴۶۳
حضرت عثمانؓ کی سفارت	۴۶۴
شہادتِ عثمانؓ کی افواہ اور بیعتِ رضوان	۴۶۵
صُلح اور دفعاتِ صلح	۴۶۵
ابو جندل کی واپسی	۴۶۵
حلال ہونے کے لیے قربانی اور بالوں کی کٹائی	۴۶۷
مہاجرہ عورتوں کی واپسی سے اِنکار	۴۶۸
اس معاہدے کی دفعات کا حاصل	۴۶۹
مُسلمانوں کا غم اور حضرت عمرؓ کا مناقشہ	۴۷۲
کمزور مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوگیا	۴۷۳
برادرانِ قریش کا قبولِ اسلام	۴۷۴
دوسرا مرحلہ :	
نئی تبدیلی	۴۷۵

مضمون	صفحہ
بادشاہوں اور اُمراء کے نام خطوط	۴۷۶
نجاشی شاہِ حبش کے نام خط	۴۷۶
مُقوقس شاہ مصر کے نام خط	۴۷۹
شاہِ فارس خسرو پرویز کے نام خط	۴۸۱
قیصر شاہِ روم کے نام خط	۴۸۳
مُنذِر بن ساوی کے نام خط	۴۸۷
ہوذہ بن علی صاحب یمامہ کے نام خط	۴۸۸
حارث بن ابی شمر غسانی حاکم دمشق کے نام خط	۴۸۹
شاہِ عمان کے نام خط	۴۸۹
صُلح حُدیبیہ کے بعد کی فوجی سرگرمیاں	۴۹۴
غزوۂ غابہ یا غزوۂ ذی قرد	۴۹۴
غزوۂ خیبر اور غزوۂ وادی القریٰ	۴۹۷
خیبر کو روانگی	۴۹۸
اسلامی لشکر کی تعداد	۴۹۸
یہود کے لیے منافقین کی سرگرمیاں	۴۹۹
خیبر کا راستہ	۴۹۹
راستے کے بعض واقعات	۵۰۰
اسلامی لشکر، خیبر کے دامن میں	۵۰۱
جنگ کی تیاری اور خیبر کے قلعے	۵۰۲
معرکے کا آغاز اور قلعہ ناعم کی فتح	۵۰۳
قلعہ صعب بن معاذ کی فتح	۵۰۵
قلعہ زبیر کی فتح	۵۰۵
قلعہ ابی کی فتح	۵۰۶
قلعہ نزار کی فتح	۵۰۶
خیبر کے نصف ثانی کی فتح	۵۰۷
صُلح کی بات چیت	۵۰۷
ابوالحقیق کے دونوں بیٹوں کی بدعہدی اور انکا قتل	۵۰۸
اموالِ غنیمت کی تقسیم	۵۰۹
جعفر بن ابی طالب اور اشعری صحابہؓ کی آمد	۵۱۰
حضرت صفیہ سے شادی	۵۱۱
زہر آلود بکری کا واقعہ	۵۱۱
جنگِ خیبر میں فریقین کے مقتولین	۵۱۲
فدک	۵۱۲

مضمون	صفحہ
وادی القریٰ	۵۱۳
تیماء	۵۱۴
مدینہ کو واپسی	۵۱۴
سَریۂ ابان بن سعید	۵۱۵
غزوۂ ذات الرقاع (۷ھ)	۵۱۶
۷ھ کے چند سرایا	۵۱۹
سَریۂ قدید (صفر یا ربیع الاوّل ۷ھ)	۵۱۹
سَریۂ حسمی (جمادی الآخرہ ۷ھ)	۵۱۹
سَریۂ تربہ (شعبان ۷ھ)	۵۲۰
سَریۂ اطراف فدک (شعبان ۷ھ)	۵۲۰
سَریۂ میفعہ (رمضان ۷ھ)	۵۲۰
سَریۂ خیبر (شوال ۷ھ)	۵۲۰
سَریۂ یمن وجبار (شوال ۷ھ)	۵۲۰
سَریۂ غابہ	۵۲۱
عمرۂ قضا	۵۲۲
چند اور سرایا	۵۲۵
سَریۂ ابوالعوجا (ذی الحجہ ۷ھ)	۵۲۵
سَریۂ غالب بن عبداللہ (صفر ۸ھ)	۵۲۵
سَریۂ ذات اطلح (ربیع الاوّل ۸ھ)	۵۲۵
سَریۂ ذات عرق (ربیع الاوّل ۸ھ)	۵۲۵
معرکہ مُوتہ	۵۲۶
معرکے کا سبب	۵۲۶
لشکر کے اُمراء اور نبی ﷺ کی وصیت	۵۲۶
اسلامی لشکر کی روانگی اور عبداللہ بن رواحہ کا گریہ	۵۲۷
اسلامی لشکر کی پیش رفت اور خوفناک ناگہانی حالت سے سابقہ ----------	۵۲۸
معان میں مجلس شوریٰ	۵۲۸
دشمن کی طرف اسلامی لشکر کی پیش قدمی	۵۲۸
جنگ کا آغاز اور سپہ سالاروں کی یکے بعد دیگرے شہادت ----------	۵۲۹
جھنڈا، اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کے ہاتھ میں	۵۳۰
خاتمۂ جنگ	۵۳۱
فریقین کے مقتولین	۵۳۲

مضمون	صفحہ
اس معرکے کا اثر	۵۳۲
سَریۂ ذات السلاسل	۵۳۲
سَریۂ خضرہ (شعبان ۸ھ)	۵۳۴
غزوۂ فتح مکہ	۵۳۵
اس غزوے کا سبب	۵۳۵
تجدیدِ صلح کے لیے ابوسفیان مدینہ میں	۵۳۸
غزوے کی تیاری اور اخفاء کی کوشش	۵۴۰
اسلامی لشکر مکہ کی راہ میں	۵۴۲
مرّالظہران میں اسلامی لشکر کا پڑاؤ	۵۴۳
ابوسفیان دربارِ نبوت میں	۵۴۴
اسلامی لشکر مرّالظہران سے مکّے کی جانب	۵۴۶
اسلامی لشکر اچانک قریش کے سر پر	۵۴۷
اسلامی لشکر ذی طویٰ میں	۵۴۸
مکّے میں اسلامی لشکر کا داخلہ	۵۴۸
مسجدِ حرام میں رسول اللہ ﷺ کا داخلہ اور بتوں سے تطہیر ----------	۵۴۹
خانۂ کعبہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز اور قریش سے خطاب ----------	۵۵۰
آج کوئی سرزنش نہیں	۵۵۱
کعبے کی کنجی (حق بحقدار رسید)	۵۵۱
کعبہ کی چھت پر اذانِ بلالی	۵۵۲
فتح یا شکرانے کی نماز	۵۵۲
اکابر مجرمین کا خون رائیگاں قرار دے دیا گیا۔	۵۵۲
صفوان بن امیہ اور فضالہ بن عمیر کا قبولِ اسلام	۵۵۴
فتح کے دوسرے دن رسول اللہ ﷺ کا خطبہ	۵۵۴
انصار کے اندیشے	۵۵۵
بیعت	۵۵۵
مکہ میں نبی ﷺ کا قیام اور کام	۵۵۷
سَرایا اور وفود	۵۵۷
تیسرا مرحلہ	۵۶۰
غزوۂ حنین	۵۶۱
دشمن کی روانگی اور اوطاس میں پڑاؤ	۵۶۱
ماہرِ جنگ کی زبانی سپہ سالار کی تغلیط	۵۶۱
دشمن کے جاسوس	۵۶۲
رسول اللہ ﷺ کے جاسوس	۵۶۲
رسول اللہ ﷺ مکہ سے حنین کی طرف	۵۶۳
اسلامی لشکر پر تیراندازوں کا اچانک حملہ	۵۶۳
دشمن کی شکستِ فاش	۵۶۶
تعاقب	۵۶۶
غنیمت	۵۶۶
غزوۂ طائف	۵۶۷
جعرانہ میں اموالِ غنیمت کی تقسیم	۵۶۹
انصار کا حزن و اضطراب	۵۷۰
وفدِ ہوازن کی آمد	۵۷۲
عمرہ اور مدینہ کو واپسی	۵۷۳
فتح مکہ کے بعد کے سرایا اور عمال کی روانگی	۵۷۴
تحصیلدارانِ زکوٰۃ	۵۷۴
سَرایا	۵۷۵
سَریۂ عُیینہ بن حصن فزاری	۵۷۵
سَریۂ قطبہ بن عامر	۵۷۶
سَریۂ ضحاک بن سفیان کلابی	۵۷۶
سَریۂ علقمہ بن مجزز مدلجی	۵۷۶
سَریۂ علی بن ابی طالب	۵۷۶
غزوۂ تبوک	۵۷۹
غزوہ کا سبب	۵۷۹
روم و غسان کی تیاریوں کی عام خبریں	۵۸۰
روم و غسان کی تیاریوں کی خاص خبریں	۵۸۱
حالات کی نزاکت میں اضافہ	۵۸۲
رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک قطعی اقدام کا فیصلہ ----------	۵۸۲
رومیوں سے جنگ کی تیاری کا اعلان	۵۸۲
غزوہ کی تیاری کے لیے مسلمانوں کی دوڑ دھوپ	۵۸۳
اسلامی لشکر تبوک کی راہ میں	۵۸۴
اسلامی لشکر تبوک میں	۵۸۶
مدینہ کو واپسی	۵۸۷
مخلفین	۵۸۸

مضمون	صفحہ
اس غزوے کا اثر	۵۹۰
اس غزوہ سے متعلق قرآن کا نزول	۵۹۱
اس سن کے بعض اہم واقعات	۵۹۱
حج ۹ھ (زیر امارت حضرت ابوبکر صدیقؓ)	۵۹۲
غزوات پر ایک نظر	۵۹۳
اللہ کے دین میں فوج در فوج داخلہ	۵۹۶
وفود	۵۹۷
دعوت کی کامیابی اور اثرات	۶۱۲
حجۃ الوداع	۶۱۴
آخری فوجی مہم	۶۲۲
رفیق اعلےٰ کی جانب	۶۲۳
الوداعی آثار	۶۲۳
مرض کا آغاز	۶۲۴
آخری ہفتہ	۶۲۴
وفات سے پانچ دن پہلے	۶۲۴
چار دن پہلے	۶۲۶
ایک یا دو دن پہلے	۶۲۷
ایک دن پہلے	۶۲۸
حیاتِ مبارکہ کا آخری دن	۶۲۸
نزعِ رواں	۶۲۹
غم ہائے بیکراں	۶۳۰
حضرت عمرؓ کا موقف	۶۳۱
حضرت ابوبکرؓ کا موقف	۶۳۱
تجہیز و تکفین اور تدفین	۶۳۲
خانۂ نبوت	۶۳۴
اخلاق و اوصاف	۶۴۴
حلیہ مبارک	۶۴۴
کمالِ نفس اور مکارمِ اخلاق	۶۴۸
کتب حوالہ	۶۵۴
...	...

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر (طبعِ اوّل)

الحمد للہ الذی ھدٰنا لھذا وما کنّا لنھتدی لولآ ان ھدٰنا اللہ
اللّٰھم صلّ علی محمدٍ النبیّ الامّی وازواجہ امھات المؤمنین
وذریتہ واھل بیتہ کما صلیت علیٰ ابراھیم انک حمید مجید۔

المکتبۃ السّلفیّہ کی پہلی کتاب "پیارے رسُول کی پیاری دعائیں" ۱۹۵۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مُرتب والدِ گرامی حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ تعالیٰ کو اس کتاب کی ترتیب و طباعت میں حُسنِ نیت کا صلہ اللہ عزّوجل نے یہ دیا کہ اس کے بعد المکتبۃ السّلفیّہ نے ایسی ایسی گرانقدر کُتب اتنے عمدہ معیار پر شائع کیں کہ پاکستان کے اکثر مذہبی و دینی کتب کے ناشرین نے اس کو مشعلِ راہ بنایا۔

المکتبۃ السّلفیّہ کا آغاز حضرت والدِ گرامی مدظلہ العالی نے "پیارے رسُول کی پیاری دعائیں" کی ترتیب و اشاعت سے کر تو دیا تھا لیکن المکتبۃ السّلفیّہ کو ایک بامقصد اور باضابطہ ادارہ تشکیل دیتے وقت انہوں نے اپنے تلمیذِ رشید (اور میرے استاذِ محترم) مولانا حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی کو رفاقت و شراکت کے لیے منتخب کر لیا۔

استاذ و شاگرد کی اسی رفاقت و شراکت ہی میں دراصل المکتبۃ السّلفیّہ کا نام متعارف، بلکہ روشن ہُوا۔ بارک اللہ سعیھم۔

"پیارے رسُول کی پیاری دعائیں" کے بعد المکتبۃ السّلفیّہ نے اُس دور کے حُسنِ کتابت و طباعت اور تصحیحِ اغلاط کا اعلیٰ معیار قائم کرتے ہُوئے الفوز الکبیر عربی (ٹائپ) اور حیاتِ ولی (اُردو) جیسی کتابوں کی اشاعت سے کام کا آغاز کیا۔

اس کے بعد المکتبۃ السّلفیّہ کو عالمِ اسلام میں متعارف کرانے والی کتاب التعلیقات السّلفیّہ علیٰ سنن النسائی کو عمدہ ترین معیار پر شائع کر کے پاکستان میں جدید حواشی کے ساتھ متونِ حدیث کی اشاعت کا آغاز اور مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کی جلد اوّل شائع کر کے شروحِ حدیث کی طباعت میں

اولیت کا شرف حاصل کیا۔ والحمد للہ علی ذلک۔

بعد ازاں قرآن فہمی کے لیے مختصر اور احکام القرآن کی جامع تفسیر تفسیر احسن التفاسیر (اردو) کو جدید اسلوب تحقیق سے شائع کرنا شروع کیا۔ نیز اردو زبان میں ائمہؒ کی تفصیلی اور تحقیقی سوانح تعلیق و حواشی کے ساتھ (حیات امام احمدؒ بن حنبل، حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، حیات امام ابو حنیفہؒ) شائع کرنے کی طرح ڈالی۔

علاوہ ازیں اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان اور شاہ ولی اللہؒ کی قلمی کتاب اتحاف النبیہ فی ما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ کو تعلیقات و حواشی سے مزین کر کے پہلی مرتبہ زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

مدارس عربیہ میں مشہور داخل نصاب کتاب دیوان الحماسہ مترجم مع عربی حواشی ہندوستان میں طبع تو ہوا تھا لیکن حل لغات کے ساتھ اس کی اشاعت بھی المکتبۃ السلفیہ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

محمدیہ پاکٹ بک بجواب احمدیہ پاکٹ بک، سبعہ معلقہ مترجم مع عربی شرح، البلاغ المبین فارسی تحفۃ الموحدین مترجم و اردو، الاتباع عربی، الایقاف مترجم رسالہ عمل بالحدیث مترجم، تقویۃ الایمان، نصیحۃ المسلمین، جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث اور حدیث کی تشریعی اہمیت جیسی کتب متذکرہ بالا ضخیم کتب کے علاوہ ہیں۔

غرضیکہ استاذ و شاگرد کی بہترین رفاقت و شراکت کا یہ دور بے مثال تھا۔

۱۹۷۰ء کے بعد راقم الحروف نے حضرت والد صاحب مدظلہ العالی کے سایۂ شفقت میں جب کام کا آغاز کیا تو اس وقت ملک میں قدیم کتب کو فلم پازٹیو پر شائع کرنے کا رجحان تھا۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ (عربی)، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (فارسی) (شاہ ولی اللہؒ) کتاب الصلوٰۃ (عربی) (ابن قیم) منہاج السنۃ النبویہ، اقتضاء الصراط المستقیم (عربی) الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان (عربی) (اردو) ابن تیمیہؒ اور صراط مستقیم (فارسی) کو فلم پازٹیو پر شائع کرنے کے علاوہ احسن التفاسیر کی بقایا ۳ جلدیں اسلامی خطبات کامل ۲ جلد، جزء القراءۃ عربی (ٹائپ) (مترجم) رد الاشراک (عربی ٹائپ) مجموعہ ثلاث رسائل السلفیہ (عربی ٹائپ) کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے رسائل (جو بقامت کہتر بہ قیمت بہتر کا مصداق تھے) بھی شائع کئے اور امکانی حد تک المکتبۃ السلفیہ کے ماضی کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ والحمد للہ علی ذالک۔

۱۹۷۹ء میں جب علم ہوا کہ رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ نے جس عربی کتاب کو ــــ دنیا بھر میں ــــ اول انعام سے نوازا وہ ہمارے ہندوستانی مصنف کی ہے تو اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی لہر دل و دماغ

سے ہو کر گزر گئی۔

۱۹۸۰ء میں جب مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری سے بیت اللہ شریف میں بحیثیت مصنف "الرحیق المختوم" تعارف ہوا تو وہ گزری ہوئی لہر الفاظ کا لبادہ اوڑھ کر فوراً مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔

مولانائے محترم نے خود ہی ترجمہ کر کے "مسودہ" المکتبۃ السلفیۃ کو عطا کرنے کا وعدہ فرما لیا اور جب مولانا موصوف دسمبر ۱۹۸۵ء میں لاہور تشریف لائے تو اپنا وعدہ وفا کر دیا جزاہم اللہ تعالیٰ۔

مسودہ ملنے کے ۲۰-۲۱ ماہ بعد "الرحیق المختوم" کا اردو ایڈیشن پیش خدمت ہے۔

اس کی طباعت میں جو حسن و کمال آپ کو نظر آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور ساتھ ساتھ والدِ گرامی حفظہ اللہ کی سرپرستی، اُستاذِ محترم مولانا حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی کی راہ نمائی، برادرِ عزیز خالد جاوید یوسفی کی مخلصانہ توجہ اور فاضل دوست مولانا حافظ صلاح الدین یوسف کے علمی مشوروں کا نتیجہ ہے اور جو کوتاہی ہے اس کا یہ راقم آثم ہی ذمہ دار ہے۔

برادر گرامی پروفیسر عبدالجبار شاکر کا بھی بہت ممنون ہوں جنہوں نے بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود کتاب پڑھ کر مختصر لیکن جامع تبصرہ سے ——— فلیپ کی صورت میں ——— نوازا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اس کے خطاط صاحبان مشتاق احمد بھٹہ، محمد صدیق گلزار، محمد ریاض، محمد الیاس صاحبان اور خصوصاً مشتاق احمد بھٹہ صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے بار بار تصحیح کتابت نہ صرف بڑی خندہ پیشانی بلکہ سعادت سمجھ کر کی۔ ایسے ہی عزیز برخوردار ابن یوسف (آرٹسٹ) کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے کتاب کے حسن میں عملاً حصہ لیکر زادِ آخرت بنایا۔

آخر میں اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو زوال پذیر امتِ مسلمہ کی اصلاح کا باعث بنائے اور فاضل مصنف حفظہ اللہ، ناشر، ان کے والدین، اساتذہ اور ہر اس شخص کو نبی اکرم ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے جس نے کسی بھی مرحلہ پر تعاون فرمایا ہو۔ آمین ثم آمین!

اللھم صل علی محمد وبارك وسلم علیه

الراجی الی رحمة ربه الغافر

بندۂ اثم احمد شاکر غفر اللہ لہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع سوم (عربی)

(از عزت مآب ڈاکٹر **عبداللہ عمر نصیف** سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی، مکہ المکرمہ)

الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، وأشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له. واشهد أن محمدا عبده ورسوله وصفيه وخليله، أدى الرسالة وبلغ الأمانة، ونصح الأمة، وتركها على المحجة البيضاء ليلها كنهارها. صلى الله عليه وعلى آله وصحبه اجمعين، ورضي عن كل من تبع سنته وعمل بها إلى يوم الدين، وعنا معهم بعفوك ورضاك يا ارحم الراحمين. أما بعد

سُنّت نبویہ مطہرہ جو ایک تجدد پذیر عطیہ اور تا قیامت باقی رہنے والا توشہ ہے۔ اور جس کو بیان کرنے اور جس کے مختلف عنوانات پر کتابیں اور صحیفے لکھنے کے لیے لوگوں میں نبی ﷺ کی بعثت کے وقت سے مقابلہ اور تنافس جاری ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ سنت مطہرہ مسلمانوں کے سامنے وہ عملی نمونہ اور واقعاتی پروگرام رکھتی ہے جس کے سانچے میں ڈھل کر مسلمانوں کی رفتار و گفتار اور کردار و اطوار کو نکلنا چاہیے۔ اور اپنے پروردگار سے ان کا تعلق اور اپنے کنبہ و قبیلہ، برادران و اخوان اور افرادِ اُمت سے ان کا ربط اس کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ○

"یقیناً تمہارے ہر اس شخص کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں بہترین اسوہ ہے جو اللہ اور روزِ آخرت کی اُمید رکھتا ہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتا ہو۔"

اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کیسے تھے انہوں نے فرمایا کان خلقه القرآن۔ بس قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا۔

لہٰذا جو شخص اپنی دنیا اور آخرت کے جملہ معاملات میں ربانی شاہراہ پر چل کر اس دنیا سے نجات چاہتا ہو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ رسول اعظم ﷺ کے اسوہ کی پیروی کرے۔

اور خوب اچھی طرح سمجھ بوجھ کر اس یقین کے ساتھ نبی ﷺ کی سیرت کو اپنائے کہ یہی پروردگار کا سیدھا راستہ ہے جس پر ہمارے آقا اور پیشوا رسول اللہ ﷺ عملاً اور واقعۃً تمام شعبہائے زندگی میں گامزن تھے۔ لہٰذا اسی میں قائدین و متبعین، حکام و محکومین، رہبران و مرشدین اور مجاہدین کی رشد و ہدایت ہے۔ اور اسی میں سیاست و حکومت، دولت و اقتصاد، معاشرتی معاملات، انسانی تعلقات، اخلاق فاضلہ اور بین الاقوامی روابط کے جملہ میدانوں کے لیے اسوۂ و نمونہ ہے۔

آج جبکہ مسلمان اس ربانی منہج سے دور ہٹ کر جہل و پسماندگی کے کھڈ میں جا گرے ہیں ان کے لیے کیا ہی بہتر ہوگا کہ وہ ہوش کے ناخن لیں۔ اور اپنے تعلیمی نصابوں اور مختلف اجتماعات و مجالس میں اس بنا پر سیرت نبوی کو سرفہرست رکھیں کہ یہ محض ایک فکری متاع ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہی اللہ کی طرف واپسی کی راہ ہے۔ اور اسی میں لوگوں کی اصلاح و فلاح ہے۔ کیونکہ یہی اخلاق و عمل کے میدان میں اللہ عزوجل کی کتاب قرآن مجید کی ترجمانی کا عملی اسلوب ہے۔ جس کے نتیجہ میں مومن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی شریعت کا تابع فرمان بن جاتا ہے۔ اور اسے انسانی زندگی کے جملہ معاملات میں حکم بنا لیتا ہے۔

یہ کتاب "الرحیق المختوم" اپنے فاضل مؤلف شیخ صفی الرحمٰن مبارک پوری کی ایک خوشگوار کوشش اور قابل قدر کارنامہ ہے جسے موصوف نے رابطہ عالم اسلامی کے منعقد کردہ مقابلہ سیرت نویسی ۱۳۹۶ھ کی دعوت عام پر لبیک کہتے ہوئے انجام دیا۔ اور پہلے انعام سے سرفراز ہوئے۔ جس کی تفصیل رابطہ عالم اسلامی کے سابق سیکرٹری جنرل مرحوم فضیلۃ الشیخ محمد علی الحرکان تغمدہ اللہ برحمتہ وجزاہ عنا خیر الجزاء کے مقدمہ طبع اول میں مذکور ہے۔

اس کتاب کو لوگوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور یہ ان کی مدح و ستائش کا مرکز بن گئی۔ چنانچہ پہلے ایڈیشن کے کل کے کل (دس ہزار) نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ اور اس کے بعد جناب محترم ح ـــ ح (حسان حموی حفظہ اللہ) نے از راہ کرم مزید پانچ ہزار نئے نسخوں کی طباعت کا بیڑہ اٹھایا فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

اس موقع پر محترم موصوف ح ـــ ح نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس تیسرے ایڈیشن کا دیباچہ لکھ دوں۔ چنانچہ ان کی خواہش کے احترام میں میں نے یہ مختصر سا دیباچہ قلم بند کر دیا۔ مولیٰ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ اس عمل کو اپنے رخ کریم کے لیے خالص بنائے۔ اور اس سے مسلمانوں کو ایسا نفع پہنچائے کہ ان کی موجودہ خستہ حالی بہتری میں تبدیل ہو جائے۔ امت محمدیہ کو اس کا گم گشتہ مجد و شرف

اور اقوامِ عالم کی قیادت کا مقامِ بلند واپس مل جائے۔ اور وہ اللہ عزّ وجل کے اس ارشاد کی عملی تصویر بن جائے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ○

تم خیرِ امت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو۔ بُرائی سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وصلی اللہ علی المبعوث رحمۃ للعالمین، رسولِ الہدیٰ ومرشد الانسانیۃ إلی طریق النجاۃ والفلاح، وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم والحمد للہ رب العالمین۔

ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف
سیکرٹری جنرل رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ

اورینٹ پریس، لاہور

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معالی الشیخ محمد علی الحرکان سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

الحمد لله رب العلمين ، خالق السمٰوٰت والارض وجاعل الظلمات والنور، وصلى الله على سيدنا محمد خاتم الأنبياء والرسل أجمعين ، بشر وانذر، ووعد وأوعد ، أنقذ الله به البشر من الضلالة ، وهدى الناس إلى الصراط المستقيم، صراط الله الذى له ما فى السمٰوٰت وما فى الارض ، الا الى الله تصير الامور- وبعد :

چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مقام شفاعت اور درجہ بلند عطا فرمایا ہے۔ اور آپ سے ہم مسلمانوں کو محبت کرنے کی ہدایت دی ہے۔ اور آپ کی پیروی کو اپنی محبت کی نشانی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ

یعنی اے پیغمبر کہہ دو! اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں محبوب رکھے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو تمہارے لیے بخش دے گا۔

اس لیے یہ بھی ایک سبب ہے جو دلوں کو آپ کا گرویدہ و وارفتہ بنا کر ان اسباب و ذرائع کی جستجو میں ڈال دیتا ہے جو آپ کے ساتھ تعلق خاطر کو پختہ تر کر دیں۔ چنانچہ طلوع اسلام ہی سے مسلمان آپ کے محاسن کے اظہار اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کی نشر و اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ نام ہے آپ ﷺ کے اقوال و افعال اور اخلاق کریمانہ کا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ یعنی قرآن کریم ہی آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔ اور معلوم ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے کلمات تامہ کا نام ہے۔ لہٰذا جس ذات گرامی کا یہ وصف ہے وہ یقیناً سارے انسانوں سے بہتر اور کامل ہے۔ اور ساری خلق خدا کی محبت کی سب سے زیادہ حقدار ہے۔

یہ گراں مایہ محبت ہمیشہ مسلمانوں کا سرمایۂ دل وجان رہی۔ اور اسی کے افق سے سیرت نبویہ شریفہ کی پہلی کانفرنس کا نور پھوٹا۔ یہ کانفرنس ۱۳۹۶ھ میں پاکستان کی سرزمین پر منعقد ہوئی۔ اور رابطہ نے اس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ذیل کی شرائط پر پورے اترنے والے سیرت کے پانچ سب سے عمدہ مقالات پر ڈیڑھ لاکھ سعودی ریال کے مالی انعامات دیئے جائیں گے۔ شرائط یہ ہیں۔

(۱) مقالہ مکمل ہو۔ اور اس میں تاریخی واقعات زمانۂ وقوع کے لحاظ سے ترتیب وار بیان کئے گئے ہوں۔

(۲) مقالہ عمدہ ہو۔ اور اس سے پہلے شائع نہ کیا گیا ہو۔

(۳) مقالے کی تیاری میں جن مخطوطات اور علمی مآخذ پہ اعتماد کیا گیا ہو ان سب کے حوالے مکمل دیئے گئے ہوں۔

(۴) مقالہ نگار اپنی زندگی کے مکمل اور مفصل حالات قلم بند کرے۔ اور اپنی علمی اسناد اور اپنی تالیفات کا ــــ اگر ہوں تو ــــ ذکر کرے۔

(۵) مقالے کا خط صاف اور واضح ہو۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ ٹائپ کیا ہوا ہو۔

(۶) مقالے عربی اور دوسری زندہ زبانوں میں قبول کئے جائیں گے۔

(۷) یکم ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ سے مقالات کی وصولی شروع کی جائے گی۔ اور یکم محرم ۱۳۹۷ھ کو ختم کر دی جائے گی۔

(۸) مقالات رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سیکرٹریٹ کو مہر بند لفافے کے اندر پیش کئے جائیں۔ رابطہ ان پر اپنا ایک خاص نمبر شمار ڈالے گا۔

(۹) اکابر علماء کی ایک اعلیٰ کمیٹی تمام مقالات کی چھان بین اور جانچ پڑتال کرے گی۔

رابطہ کا یہ اعلان محبتِ نبویؐ سے سرشار اہل علم کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔ اور انہوں نے اس مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ادھر رابطہ عالمِ اسلامی بھی عربی، انگریزی، اُردو اور دیگر زبانوں میں مقالات کی وصولی اور استقبال کے لیے تیار تھا۔

پھر ہمارے محترم بھائیوں نے مختلف زبانوں میں مقالات بھیجنے شروع کئے۔ جن کی تعداد ۱۷۱ تک جا پہنچی۔ ان میں ۸۴ مقالے عربی زبان میں تھے، ۶۴ اُردو میں، ۲۱ انگریزی میں، ایک فرانسیسی میں اور ایک ہوسا زبان میں۔

رابطہ نے ان مقالات کو جانچنے اور استحقاقِ انعام کے لحاظ سے ان کی ترتیب قائم کرنے کیلئے کبار علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اور انعام پانے والوں کی ترتیب یہ رہی۔

۱۔ پہلا انعام۔ شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری، جامعہ سلفیہ، ہند۔ پچاس ہزار سعودی ریال۔

۲۔ دوسرا انعام۔ ڈاکٹر ماجد علی خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ہند۔ چالیس ہزار سعودی ریال۔

۳۔ تیسرا انعام۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، صدر جامعہ اسلامیہ بہاولپور پاکستان۔ تیس ہزار سعودی ریال

۴۔ چوتھا انعام۔ استاد حامد محمود، محمد منصور لیمود مصر۔ ۔ ۔ ۔ بیس ہزار سعودی ریال

۵۔ پانچواں انعام۔ استاد عبدالسلام ہاشم حافظ، مدینہ منورہ، مملکت سعودیہ عربیہ: دس ہزار سعودی ریال

رابطہ نے ان کامیاب افراد کے ناموں کا اعلان، ماہ شعبان ۱۳۹۸ھ میں کراچی (پاکستان) کے اندر منعقد پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس میں کیا۔ اور اشاعت کے لیے تمام اخبارات کو اس کی اطلاع بھیج دی۔

پھر تقسیم انعامات کے لیے رابطہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے مستقر پر امیر سعود بن عبدالمحسن بن عبدالعزیز کی سرپرستی میں سنیچر ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ کی صبح ایک بڑی تقریب منعقد کی۔ امیر سعود مکہ مکرمہ کے گورنر امیر فواز بن عبدالعزیز کے سیکرٹری ہیں۔ اور اس تقریب میں ان کے نائب کی حیثیت سے موصوف نے انعامات تقسیم کیے۔

اس موقع پر رابطہ کے سیکرٹریٹ کی طرف سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان کامیاب مقالات کو مختلف زبانوں میں طبع کرا کر تقسیم کیا جائے گا۔ چنانچہ اس کو رُوبہ عمل لاتے ہوئے شیخ صفی الرحمان مبارکپوری جامعہ سلفیہ ہند کا (عربی) مقالہ سب سے پہلے طبع کرا کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ کیونکہ موصوف ہی نے پہلا انعام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد بقیہ مقالے بھی ترتیب وار طبع کیے جائیں گے۔

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے اعمال اپنے لیے خالص بنائے۔ اور انہیں شرفِ قبولیت سے نوازے۔ یقیناً وہ بہترین مولیٰ اور بہترین مددگار ہے وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہٖ وصحبہ وسلم۔

محمد علی الحرکان

سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی

مکہ مکرمہ

عرضِ مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن والاہ ۔ اما بعد

یہ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ (مارچ ۱۹۷۶ء) کی بات ہے کہ کراچی میں عالم اسلام کی پہلی سیرت کانفرنس ہوئی۔ جس میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کانفرنس کے اختتام پر ساری دنیا کے اہلِ قلم کو دعوت دی کہ وہ سیرتِ نبویؐ کے موضوع پر دنیا کی کسی بھی زندہ زبان میں مقالے لکھیں پہلی دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو علی الترتیب پچاس، چالیس، تیس بیس اور دس ہزار ریال کے انعامات دیئے جائیں گے۔ یہ اعلان رابطہ کے سرکاری ترجمان اخبار العالم الاسلامی کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ لیکن مجھے اس تجویز اور اعلان کا بروقت علم نہ ہو سکا۔

کچھ دنوں بعد جب میں بنارس سے اپنے وطن مُبارکپور گیا تو میرے پھوپھا زاد بھائی اور محترم اُستاد مولانا عبدالرحمان صاحب مُبارکپوری حفظہ اللہ (ابن شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی حفظہ اللہ) نے مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ اور زور دیا کہ میں بھی اس مقابلے میں حصہ لوں۔ میں نے اپنی علمی کم مائیگی اور ناتجربہ کاری کا عذر کیا۔ مگر مولانا مصر رہے، اور بار بار کی معذرت پر فرمایا کہ میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ انعام حاصل ہو۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اسی بہانے "ایک کام" ہو جائے۔ میں نے ان کے اصرارِ مسلسل پر خاموشی تو اختیار کر لی۔ لیکن نیت یہی تھی کہ اس مقابلے میں حصہ نہیں لوں گا۔

چند دن بعد جمعیت اہل حدیث ہند کے آرگن اور نقیب پندرہ روزہ ترجمان دہلی میں رابطہ کی اس تجویز اور اعلان کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ جامعہ سلفیہ کے متوسط اور منتہی طلبہ میں سے عموماً جس کسی سے سامنا ہوتا وہ مجھے اس مقابلے میں شرکت کا مشورہ دیتا۔ خیال ہُوا کہ شاید خلق کی یہ زبان "خدا کا نقارہ" ہے۔ تاہم مقابلے میں حصہ نہ لینے کے اپنے قلبی فیصلے پر میں قریب قریب اٹل رہا۔ کچھ دنوں بعد طلبہ کے "مشورے" اور "تقاضے" بھی تقریباً ختم ہی ہو گئے۔ مگر چند ایک طالب علم اپنے تقاضے پر قائم رہے۔ بعض نے مقالے کے تصنیفی خاکے کو موضوعِ گفتگو بنا رکھا تھا۔ اور بعض بعض کی ترغیب اصرار کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ بالآخر میں خاصی ہچکچاہٹ کے ساتھ آمادہ ہو گیا۔ کام شروع کیا۔ لیکن تھوڑا تھوڑا کبھی کبھی اور آہستہ خرامی کے ساتھ۔ چنانچہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلے

ہی میں تھا کہ رمضان کی تعطیل کلاں کا وقت آگیا۔ ادھر رابطہ نے آنے والے محرم الحرام کی پہلی تاریخ کو مقالات کی وصولی کی آخری تاریخ قرار دیا تھا۔ اس طرح مہلتِ کار کے کوئی ساڑھے پانچ ماہ گذر چکے تھے۔ اور اب زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین ماہ میں مقالہ مکمل کر کے حوالۂ ڈاک کر دینا ضروری تھا تاکہ وقت پر پہنچ جائے۔ اور ادھر ابھی سارا کام باقی تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس مختصر عرصے میں ترتیب و تسوید، نظرثانی اور نقل و صفائی کا کام ہو سکے گا۔ مگر اصرار کرنے والوں نے چلتے چلتے تاکید کی کہ کسی طرح کی غفلت یا تذبذب کے بغیر کام میں جُت جاؤں۔ رمضان بعدہٗ سہارا" دیا جائے گا۔ میں نے بھی فرصت کے ایام غنیمت سمجھے۔ اشہبِ قلم کو مہمیز لگائی۔ اور کد و کاوش کے بحرِ بیکراں میں کود پڑا۔ پوری تعطیل سُہانے خواب کے چند لمحوں کی طرح گذر گئی۔ اور جب یہ حضرات واپس پلٹے تو مقالے کا دو تہائی حصّہ مرتب ہو چکا تھا۔ چونکہ نظرثانی اور تبییض کا موقع نہ تھا اس لیے اصل مسودہ ہی ان حضرات کے حوالے کر دیا کہ نقل و صفائی اور تقابُل کا کام کر ڈالیں۔ باقی ماندہ حصّے کے کچھ دیگر لوازمات کی فراہمی و تیاری میں بھی ان سے کسی قدر تعاون لیا۔ جامعہ کی ڈیوٹی اور ہماہمی شروع ہو چکی تھی۔ اس لیے زمانۂ تعطیل کی رفتار برقرار رکھنی ممکن نہ تھی۔ تاہم ڈیڑھ ماہ بعد جب عید اضحیٰ کی تعطیل کا وقت آیا تو "شب بیداری" کی "برکت" سے مقالہ تیاری کے آخری مرحلے میں تھا۔ جسے سرگرمی کی ایک جست نے تمام و کمال کو پہنچا دیا۔ اور میں نے آغاز محرم سے بارہ تیرہ دن پہلے یہ مقالہ حوالۂ ڈاک کر دیا۔

مہینوں بعد مجھے رابطہ کے دو رجسٹرڈ مکتوب ہفتہ عشرہ آگے پیچھے موصول ہوئے۔ خلاصہ یہ تھا کہ میرا مقالہ، رابطہ کے مقررہ شرائط کے مطابق ہے۔ اس لیے شریکِ مقابلہ کر لیا گیا ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد دن پر دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ مگر رابطہ مُہر بلب۔ میں نے دوبارہ خط لکھ کر معلوم کرنا بھی چاہا کہ اس سلسلے میں کیا ہو رہا ہے تو مُہرِ سکوت نہ ٹوٹی۔ پھر میں خود بھی اپنے مشاغل اور مسائل میں اُلجھ کر یہ بات تقریباً فراموش کر گیا کہ میں نے کسی "مقابلہ" میں حصّہ لیا ہے۔

اوائل شعبان ۱۳۹۸ھ (۶/۷/۸ جولائی ۱۹۷۸ء) کو کراچی (پاکستان) میں پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ مجھے اس کی کارروائیوں سے دلچسپی تھی۔ اس لیے اس سے متعلق اخبار کے گوشوں میں دبی ہوئی خبریں بھی ڈھونڈھ کر پڑھتا تھا۔ ایک روز بھدوہی اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں — جو لیٹ تھی — اخبار دیکھنے بیٹھ گیا۔ اچانک ایک چھوٹی سی خبر پر نظر پڑی کہ اس کانفرنس کے کسی اجلاس کے اندر رابطہ نے سیرت نگاری کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے پانچ ناموں کا اعلان کر دیا ہے۔ اور ان میں ایک مقالہ نگار ہندوستانی

بھی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر اندر ہی اندر طلب و جستجو کا ایک ہنگامۂ محشر بپا ہو گیا۔ بنارس واپس آکر تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر لاحاصل۔

۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء کو چاشت کے وقت — پوری رات مناظرہ بجرڈیہہ کے شرائط طے کرنے کے بعد بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک حجرے سے متصل سیڑھیوں پر طلبہ کا شور و ہنگامہ سنائی پڑا۔ اور آنکھ کھل گئی۔ اتنے میں طلبہ کا ریلا حجرے کے اندر تھا۔ ان کے چہروں پر بے پناہ مسرت کے آثار اور زبانوں پر مبارکبادی کے کلمات تھے۔

"کیا ہوا؟ کیا مخالف مناظر نے مناظرہ کرنے سے انکار کر دیا؟" میں نے لیٹے ہی لیٹے سوال کیا۔

"نہیں، بلکہ آپ سیرت نگاری کے مقابلے میں اوّل آگئے۔"

"اللہ! تیرا شکر ہے۔" "آپ حضرات کو اس کا علم کیسے ہوا؟" میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

"مولوی عزیز شمس یہ خبر لائے ہیں۔"

"مولوی عزیز یہاں آچکے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

اور چند لمحوں بعد مولوی عزیز مجھے تفصیلات سنا رہے تھے۔

پھر ۲۲ شعبان ۱۳۹۸ھ (۲۹ جولائی ۱۹۷۸ء) کو رابطہ کا رجسٹرڈ مکتوب وارد ہوا جس میں کامیابی کی اطلاع کے ساتھ یہ مژدہ بھی رقم تھا کہ ماہ محرم ۱۳۹۹ھ میں مکہ مکرمہ کے اندر رابطہ کے مستقر پر تقسیم انعامات کے لیے ایک تقریب منعقد کی جائے گی۔ اور اس میں مجھے شرکت کرنی ہے یہ تقریب محرم کے بجائے ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۹۹ھ کو منعقد ہوئی۔

اس تقریب کی بدولت مجھے پہلی بار حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۰ ربیع الآخر یوم جمعرات کو عصر سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ کی پُر نور فضاؤں میں داخل ہوا۔ تیسرے دن ۸½ بجے رابطہ کے مستقر پر حاضری کا حکم تھا۔ یہاں ضروری کارروائیوں کے بعد تقریباً دس بجے تلاوتِ قرآن پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ سعودی عدلیہ کے چیف جسٹس شیخ عبداللہ بن حمید صدر مجلس تھے۔ مکہ کے نائب گورنر امیر سعود بن عبدالمحسن۔ جو مرحوم ملک عبدالعزیز کے پوتے ہیں — تقسیم انعامات کے لیے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مختصر سی تقریر کی۔ ان کے بعد رابطہ کے نائب سیکرٹری جنرل شیخ علی المختار نے خطاب فرمایا۔ انہوں نے قدرے تفصیل سے بتایا کہ یہ انعامی مقابلہ کیوں منعقد کرایا گیا۔ اور فیصلے کے لیے کیا طریقہ کار اپنایا گیا۔ انہوں نے وضاحت

فرمائی کہ رابطہ کو اعلان مقابلہ کے بعد ایک ہزار سے زائد (یعنی ۱۱۸۲) مقالات موصول ہوئے جن کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ابتدائی کمیٹی نے ایک سو تراسی (۱۸۳) مقالات کو مقابلے کے لیے منتخب کیا۔ اور آخری فیصلے کے لیے انہیں وزیر تعلیم شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ کی سرکردگی میں قائم ماہرین کی ایک آٹھ رکنی کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ کمیٹی کے یہ آٹھوں ارکان ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کی شاخ کلیۃ الشریعہ (اور اب جامعہ اُم القریٰ) مکہ مکرمہ کے استاد اور سیرتِ نبوی ﷺ اور تاریخ اسلام کے ماہر اور متخصص ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں :

ڈاکٹر ابراہیم علی شعوط	ڈاکٹر احمد سید دراج
ڈاکٹر عبدالرحمٰن فہمی محمد	ڈاکٹر فائق بکر صوات
ڈاکٹر محمد سعید صدیقی	ڈاکٹر شاکر محمود عبدالمنعم
ڈاکٹر فکری احمد عکاز	ڈاکٹر عبدالفتاح منصور

ان اساتذہ نے مسلسل چھان بین کے بعد متفقہ طور پر پانچ مقالات کو ذیل کی ترتیب کے ساتھ انعام کا مستحق قرار دیا۔

۱۔ الرحیق المختوم (عربی) تالیف صفی الرحمٰن مبارکپوری جامعہ سلفیہ، بنارس، ہند (اول)

۲۔ خاتم النبیین ﷺ (انگریزی) تالیف ڈاکٹر ماجد علی خاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ہند (دوم)

۳۔ پیغمبر اعظم و آخر (اردو) تالیف ڈاکٹر نصیر احمد ناصر وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور پاکستان (سوم)

۴۔ منتقی النقول فی سیرۃ اعظم رسول (عربی) تالیف شیخ حامد محمود بن محمد منصور لیمود، جیزہ مصر (چہارم)

۵۔ سیرۃ نبی الہدیٰ والرحمۃ (عربی) استاد عبدالسلام ہاشم حافظ مدینہ منورہ، مملکت سعودیہ عربیہ (پنجم)

نائب سیکرٹری جنرل محترم شیخ علی المختار نے ان توضیحات کے بعد حوصلہ افزائی، مبارکباد، اور دعائیہ کلمات پر اپنی تقریر ختم کر دی۔

اس کے بعد مجھے اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ میں نے اپنی مختصر سی تقریر میں رابطہ کو ہندوستان کے اندر دعوت و تبلیغ کے بعض ضروری اور متروک گوشوں کی طرف توجہ دلائی۔ اور اس کے متوقع اثرات و نتائج پر روشنی ڈالی۔ رابطہ کی طرف سے اس کا حوصلہ افزا جواب دیا گیا۔

اس کے بعد امیر محترم سعود بن عبدالمحسن نے ترتیب وار پانچوں انعامات تقسیم فرمائے۔ اور تلاوت قرآن مجید

پر تقریب کا اختتام ہوگیا۔

۷ ربیع الآخر یوم جمعرات کو ہمارے قافلے کا رُخ مدینہ منورہ کی طرف تھا۔ راستے میں بدر کی تاریخی رزمگاہ کا مختصراً مشاہدہ کرکے آگے بڑھے تو عصر سے کچھ پہلے حرم نبوی کے در و بام کا جلال و جمال نگاہوں کے سامنے تھا۔ چند دن بعد ایک صبح خیبر بھی گئے۔ اور وہاں کا تاریخی قلعہ اندر و باہر سے دیکھا پھر کچھ تفریح کرکے سرِ شام مدینہ منورہ کو واپس ہوئے۔ اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی اس جلوہ گاہ، جبریل امین کے اس مہبط، قدوسیوں کی اس فرودگاہ اور اسلام کے اس مرکز انقلاب میں دو ہفتے گذار کر طائر شوق نے پھر حرم کعبہ کی راہ لی۔ یہاں طواف و سعی کے "ہنگامے" میں مزید ایک ہفتہ گزارنے کا شرف حاصل ہوا۔ عزیزوں دوستوں، بزرگوں اور علماء و مشائخ نے کیا مکہ، کیا مدینہ، ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یوں میرے خوابوں اور آرزوؤں کی سرزمین حجاز مقدس کے اندر ایک ماہ کا عرصہ چشم زدن میں گزر گیا۔ اور میں پھر صنم کدۂ ہند میں واپس آگیا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

حجاز سے واپس ہوا تو ہندوستان و پاکستان کے اردو خواں طبقے کی طرف سے کتاب کو اردو جامہ پہنانے کا تقاضا شروع ہوگیا۔ جو کئی برس گذر جانے کے باوجود برابر قائم رہا۔ ادھر نئی نئی مصروفیات اس قدر دامنگیر ہوتی گئیں کہ ترجمہ کے لیے فرصت کے لمحات میسر ہوتے نظر نہ آئے۔ بالآخر مشاغل کے اسی ہجوم میں ترجمہ شروع کر دیا گیا۔ اور اللہ کا بے پایاں شکر ہے کہ چند ماہ کی جزوی کوشش سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا

وَلِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔

اخیر میں میں ان تمام بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کام میں کسی بھی طرح مجھ سے تعاون کیا۔ خصوصاً استاذ محترم مولانا عبدالرحمان صاحب رحمانی، اور عزیزان گرامی شیخ عزیر صاحب اور حافظ محمد الیاس صاحب فاضلان مدینہ یونیورسٹی کا کہ ان کے مشورے اور ہمت افزائی نے مجھے وقت مقررہ پر اس مقالے کی تیاری میں بڑی مدد پہنچائی۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے، ہمارا حامی و ناصر ہو۔ کتاب کو شرف قبول بخشے اور مولف و معاونین اور مستفیدین کے لیے فلاح و نجاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

صفی الرحمن المبارکفوری

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

اپنی سرگزشت

الحمد لله رب العلمين والصلاة والسلام على سيد الأولين والآخرين محمد خاتم النبيين، وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد:

چونکہ رابطۂ عالم اسلامی نے سیرت نویسی کے مقابلے میں حصہ لینے والوں کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی بھی قلم بند کریں۔ اس لیے ذیل کی سطور میں اپنی سادہ زندگی کے چند خاکے پیش کر رہا ہوں۔

سلسلۂ نسب صفی الرحمٰن بن عبداللہ بن محمد اکبر بن محمد علی بن عبدالمومن بن فقیر اللہ مبارک پوری اعظمی۔

پیدائش سند میں میری تاریخ پیدائش ۶ر جون ۱۹۴۳ء درج ہے۔ مگر یہ تخمینی اندراج ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ پیدائش ۱۹۴۲ء کے وسط کی ہے۔ مقامِ پیدائش موضع حسین آباد ہے۔ جو مبارکپور کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کا ایک معروف علمی اور صنعتی قصبہ ہے۔

تعلیم و تعلّم میں نے بچپن میں قرآن مجید کا کچھ حصہ اپنے دادا اور چچا سے پڑھا۔ پھر ۱۹۴۸ء میں مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں داخل ہوا۔ وہاں چھ سال رہ کر پرائمری درجات اور مڈل کورس کی تعلیم مکمل کی۔ قدرے فارسی بھی پڑھی۔ اس کے بعد جون ۱۹۵۴ء میں مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخل ہوا اور وہاں عربی زبان و قواعد، نحو و صرف اور بعض دوسرے فنون کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ دو سال بعد مدرسہ فیض عام مئو پہنچا۔ اس مدرسہ کو اس علاقہ میں ایک اہم دینی درسگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اور مئوناتھ بھنجن، قصبہ مبارکپور سے ۴۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

فیض عام میں میرا داخلہ مئی ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ میں نے وہاں پانچ سال گزارے۔ اور عربی زبان و قواعد اور شرعی علوم و فنون یعنی تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں میری تعلیم مکمل ہوگئی۔ اور مجھے باقاعدہ شہادۃ التخرج (یعنی سندِ تکمیل) دیدی گئی۔ یہ سندِ فضیلت فی الشریعۃ اور فضیلت فی العلوم کی سند ہے۔ اور تدریس و افتاء کی اجازت پر مشتمل ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تمام امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل ہوتی رہی۔

دورانِ تعلیم، میں نے الہ آباد بورڈ کے امتحانات میں بھی شرکت کی۔ فروری ۱۹۵۹ء میں مولوی اور فروری ۱۹۶۰ء میں عالم کے امتحانات دیئے۔ اور دونوں میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوا۔

پھر ایک طویل عرصے کے بعد مدرسین سے متعلق جدید حالات کے پیشِ نظر میں نے فروری ۱۹۷۶ء میں فاضلِ ادب (اور فروری ۱۹۷۸ء میں فاضلِ دینیات) کا امتحان دیا۔ اور بحمداللہ (دونوں میں) فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوا۔

کارگاہِ علم و حیات میں

۱۹۶۱ء میں "مدرسہ فیض عام" سے فارغ ہو کر میں نے ضلع الہ آباد پھر شہر ناگپور میں درس و تدریس اور تقریر و خطابت کا شغل اختیار کیا۔ دو سال بعد مارچ ۱۹۶۳ء میں مادر علمی مدرسہ فیض عام کے ناظم اعلیٰ نے مجھے تدریس کے کام پر مدعو کر لیا لیکن میں نے وہاں بمشکل دو سال گذارے تھے کہ حالات نے علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ اگلا سال "جامعۃ الرشاد" اعظم گڑھ کی نذر ہوا۔ اور فروری ۱۹۶۶ء سے مدرسہ دارالحدیث مئو کی دعوت پر وہاں مدرس ہو گیا۔ تین سال یہاں گذارے۔ اور تدریس کے علاوہ بحیثیت نائب صدر مدرس تعلیمی امور اور داخلی انتظامات کی نگہداشت میں بھی شریک رہا۔

آخری ایام میں مدرسہ کی انتظامیہ کے درمیان اتنے سخت اختلافات برپا ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا مدرسہ بند ہو جائے گا۔ ان اختلافات سے بددل ہو کر میں نے عین عید کے روز استعفاء دیدیا۔ اور چند دن بعد مدرسہ دارالحدیث سے مستعفی ہو کر مدرسہ فیض العلوم سیونی کی خدمت پر جا مامور ہوا۔ جو مئوناتھ بھنجن سے کوئی سات سو کیلومیٹر دور مدھیہ پردیش میں واقع ہے۔

سیونی میں میری تقرری جنوری ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ میں نے وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ صدر مدرس کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام داخلی و خارجی انتظامات کی ذمہ داری بھی سنبھالی اور جمعہ کا خطبہ دینا اور گرد و پیش کے دیہاتوں میں جا جا کر دعوت و تبلیغ کا کام کرنا بھی اپنے معمولات میں شامل کیا

میں نے سیونی میں چار سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پھر ۱۹۷۲ء کے اخیر میں سالانہ تعطیل پر وطن واپس آیا تو مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور کے اراکین نے یہاں کے تعلیمی انتظامات سنبھالنے اور تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے حد درجہ اصرار کیا۔ اور مجھے یہ پیش کش قبول کرنی پڑی۔ اب میں نے اپنی اولین مادر علمی کے اندر نئی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ دو سال بعد جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ نے

مدرسہ دار التعلیم کے سرپرست سے گفتگو کی کہ مجھے جامعہ سلفیہ منتقل کر دیں۔ جامعہ کی خیر خواہی اور دیرینہ روابط کے پیش نظر بات طے ہوگئی۔ اور میں اکتوبر ۱۹۷۴ء میں جامعہ سلفیہ آگیا۔ جب سے یہیں کام کر رہا ہوں۔

تالیفات

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے اس طویل عرصے میں درس و تدریس کے پہلو بہ پہلو تالیف و تصنیف کا بھی کچھ نہ کچھ شغل جاری رکھا۔ چنانچہ مختلف مضامین و مقالات کے علاوہ اب تک آٹھ عدد (بلکہ اب کوئی بیس عدد) کتابوں اور رسائل کی تالیف یا ترجمے کا کام بھی ہو چکا ہے، جو یہ ہیں۔

(۱) شرح ازہار العرب (عربی)، ازہار العرب علامہ محمد سورتی ؒ کا جمع کردہ نفیس عربی اشعار کا ایک منتخب اور ممتاز مجموعہ ہے۔ شرح ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی، مگر قدرے ناقص رہی۔ اور طبع نہیں کرائی جاسکی۔

(۲) المصابیح فی مسالۃ التراویح للسیوطی کا اردو ترجمہ (۱۹۶۳ء) چند بار طبع ہو چکا ہے۔

(۳) ترجمہ الکلم الطیب لابن تیمیہ ؒ (۱۹۶۶ء) غیر مطبوع۔

(۴) ترجمہ و توضیح کتاب الاربعین للنووی (۱۹۶۹ء) غیر مطبوع۔

(۵) صحف یہود و نصاریٰ میں محمد ﷺ کے متعلق بشارتیں (اردو، ۱۹۷۰ء) غیر مطبوع۔

(۶) تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب ؒ (۱۹۷۲ء) یہ کتاب تین بار طبع ہو چکی ہے۔ یہ اصلاً محکمہ شرعیہ قطر کے قاضی شیخ احمد بن حجر کی عربی تالیف کا ترجمہ ہے۔ لیکن اس میں کسی قدر ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے۔

(۷) تاریخ آل سعود (اردو، ۱۹۷۲ء) تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

(۸) اتحاف الکرام تعلیق بلوغ المرام لابن حجر عسقلانی (عربی) ۱۹۷۴ء مطبوع۔

(۹) قادیانیت اپنے آئینہ میں (اردو ۱۹۷۶ء) مطبوع۔

(۱۰) فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (اردو، ۱۹۷۶ء) مطبوع۔

(۱۱) پیش نظر کتاب جو رابطۂ عالم اسلامی میں پیش کرنے کے لیے تالیف کی گئی (اور اس کے بعد مزید چند رسالے سپرد قلم کیے گئے جو یہ ہیں۔

(۱۲) انکار حدیث کیوں؟ (اردو ۱۹۷۶ء) مطبوع

(۱۳) انکار حدیث حق یا باطل (اردو ۱۹۷۷ء) مطبوع

(۱۴) رزم حق و باطل (مناظرہ بجرڈیہہ کی روداد ۱۹۷۸ء) مطبوع

(۱۵) ابراز الحق والصواب فی مسالۃ السفور والحجاب (عربی ۱۹۷۸ء) پردے سے متعلق علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی حفظہ اللہ کی رائے پر نقد ہے۔ اور مجلہ الجامعۃ السلفیہ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

(۱۶) تطور الشعوب والدیانات فی الہند ومجال الدعوۃ الاسلامیۃ فیہا (عربی ۱۹۷۹ء) چند قسطیں مجلہ الجامعۃ السلفیہ میں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱۷) الفرقۃ الناجیہ والفرق الاسلامیۃ الأخری (عربی ۱۹۸۲ء) غیر مطبوع

(۱۸) اسلام اور عدم تشدد (اردو ۱۹۸۴ء) مطبوع

(۱۹) بہجۃ النظر فی مصطلح اہل الأثر (عربی) مطبوع

(۲۰) اہل تصوف کی کارستانیاں (اردو ۱۹۸۶ء) مطبوع

(۲۱) الاحزاب السیاسیۃ فی الاسلام (عربی ۱۹۸۶ء) زیر طبع

علاوہ ازیں ماہنامہ "محدث" بنارس کی (اسکے پورے زمانۂ اشاعت میں یعنی ۴½ برس تک) ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔

واللہ الموفق وازمۃ الامور کلہا بیدہ۔ ربنا تقبلہ منا بقبول حسن وانبتہ نباتا حسنا۔

زیرِ نظر کتاب کے بارے میں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله الذی ارسل رسوله بالهدٰی ودین الحق لیظهره علی الدین کله فجعله شاهدًا ومبشرًا ونذیرًا، وداعیًا إلی الله بإذنه وسراجًا منیرا، وجعل فیه أسوة حسنة لمن کان یرجوا الله والیوم الآخر وذکر الله کثیرا، اللّٰهم صل وسلم و بارك علیه وعلی آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلی یوم الدین و فجر لهم ینابیع الرحمة والرضوان تفجیرا - أمّا بعد:

یہ بڑی مسرت اور شادمانی کی بات ہے کہ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ میں پاکستان کے اندر منعقدہ سیرت کانفرنس کے اختتام پر رابطہ عالم اسلامی نے سیرت کے موضوع پر مقالہ نویسی کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ قلم میں ایک طرح کی امنگ اور ان کی فکری کاوشوں میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہ بڑا مبارک قدم ہے۔ کیونکہ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت سیرتِ نبوی اور اسوۂ محمدی ہی وہ واحد منبع ہے جس سے عالم اسلام کی زندگی اور انسانی معاشرے کی سعادت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات بابرکات پر بے شمار درود و سلام ہو۔

پھر یہ میری سعادت و خوش بختی ہوگی کہ میں بھی اس مبارک مقابلے میں شرکت کروں۔ لیکن میری بساط ہی کیا ہے کہ میں سید الاولین والآخرین ﷺ کی حیات مبارکہ پر روشنی ڈال سکوں۔ میں تو اپنی ساری خوش بختی و کامرانی اسی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ ﷺ کے انوار کا کچھ حصہ نصیب ہو جائے۔ تاکہ میں تاریکیوں میں بھٹک کر ہلاک ہونے کے بجائے آپ ﷺ کے ایک اُمتی کی حیثیت سے آپ کی روشن شاہراہ پر چلتا ہوا زندگی گذاروں۔ اور اسی راہ میں میری موت بھی آئے۔ اور پھر آپ ﷺ کی شفاعت کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے گناہوں پر قلمِ عفو پھیر دے۔

ایک چھوٹی سی بات اپنی اس کتاب کے اندازِ تحریر کے متعلق بھی عرض کرنے کی ضرورت

محسوس کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں نے کتاب لکھنے سے پہلے ہی یہ بات طے کر لی تھی کہ اسے بارِ خاطر بن جانے والے طول اور ادائیگی مقصود سے قاصر رہ جانے والے اختصار دونوں سے بچتے ہوئے متوسط درجے کی ضخامت میں مرتب کروں گا۔ لیکن جب کتبِ سیرت پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ واقعات کی ترتیب اور جزئیات کی تفصیل میں بڑا اختلاف ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ جہاں جہاں ایسی صورت پیش آئے وہاں بحث کے ہر پہلو پر نظر دوڑا کر اور بھرپور تحقیق کر کے جو نتیجہ اخذ کروں اسے اصل کتاب میں درج کر دوں۔ اور دلائل و شواہد کی تفصیلات اور ترجیح کے اسباب کا ذکر نہ کروں۔ ورنہ کتاب غیر مطلوب حد تک طویل ہو جائے گی۔ البتہ جہاں یہ اندیشہ ہو کہ میری تحقیق قارئین کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث بنے گی، یا جن واقعات کے سلسلے میں عام اہل قلم نے کوئی ایسی تصویر پیش کی ہو جو میرے نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو وہاں دلائل کی طرف بھی اشارہ کر دوں۔

یا اللہ! میرے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی مقدر فرما۔ تو یقیناً غفور و ودود ہے۔ عرش کا مالک ہے اور بزرگ و برتر ہے۔

صفی الرحمٰن مبارکپوری

جامعہ سلفیہ
بنارس، ہند

جمعۃ المبارک
۲۴ رجب ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۳ جولائی ۱۹۷۶ء

عَرب — محلِّ وُقوع اور قومیں

سیرت نبوی درحقیقت اس پیغامِ ربانی کے عملی پرتو سے عبارت ہے، جسے رسول اللہ ﷺ نے انسانی جمعیت کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جس کے ذریعے انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں اور بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کر دیا تھا۔ چونکہ اس سیرتِ طیبہ کی مکمل صورت گری ممکن نہیں جب تک کہ اس پیغامِ ربانی کے نزول سے پہلے کے حالات اور بعد کے حالات کا تقابل نہ کیا جائے اس لیے اصل بحث سے پہلے پیش نظر باب میں اسلام سے پہلے کی عرب اقوام اور ان کے نشو و نما کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ان حالات کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے جن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔

عرب کا محلِ وقوع

لفظ عرب کے لغوی معنی ہیں صحرا اور بے آب و گیاہ زمین۔ عہدِ قدیم سے یہ لفظ جزیرہ نمائے عرب اور اس میں بسنے والی قوموں پر بولا گیا ہے۔

عرب کے مغرب میں بحر احمر اور جزیرہ نمائے سینا ہے۔ مشرق میں خلیج عرب اور جنوبی عراق کا ایک بڑا حصہ ہے۔ جنوب میں بحر عرب ہے جو درحقیقت بحر ہند کا پھیلاؤ ہے۔ شمال میں ملک شام اور کسی قدر شمالی عراق ہے۔ ان میں سے بعض سرحدوں کے متعلق اختلاف بھی ہے۔ کُل رقبے کا اندازہ دس لاکھ سے تیرہ لاکھ مربع میل تک کیا گیا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اندرونی طور پر یہ ہر چہار جانب سے صحرا اور ریگستان سے گھرا ہوا ہے جس کی بدولت یہ ایسا محفوظ قلعہ بن گیا ہے کہ بیرونی قوموں کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور اپنا اثر و نفوذ پھیلانا سخت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلب جزیرۃ العرب کے باشندے عہدِ قدیم سے اپنے جملہ معاملات میں مکمل طور پر آزاد و خود مختار نظر آتے ہیں حالانکہ یہ ایسی دو عظیم طاقتوں کے ہمسایہ تھے کہ اگر یہ ٹھوس قدرتی رکاوٹ نہ ہوتی تو ان کے حملے روک لینا باشندگانِ عرب کے بس کی بات نہ تھی۔

بیرونی طور پر جزیرہ نمائے عرب پرانی دنیا کے تمام معلوم براعظموں کے بیچوں بیچ واقع ہے اور

خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے ان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کا شمال مغربی گوشہ، براعظم افریقہ میں داخلے کا دروازہ ہے۔ شمال مشرقی گوشہ یورپ کی کنجی ہے۔ مشرقی گوشہ ایران، وسط ایشیا اور مشرق بعید کے دروازے کھولتا ہے اور ہندوستان اور چین تک پہنچاتا ہے۔ اسی طرح ہر براعظم سمندر کے راستے بھی جزیرہ نمائے عرب سے جڑا ہوا ہے اور ان کے جہاز عرب بندرگاہوں پر براہ راست لنگر انداز ہوتے ہیں۔

اس جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے جزیرۃ العرب کے شمالی اور جنوبی گوشے مختلف قوموں کی آماجگاہ اور تجارت و ثقافت اور فنون و مذاہب کے لین دین کا مرکز رہ چکے ہیں۔

عرب قومیں

مؤرخین نے نسلی اعتبار سے عرب اقوام کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

(۱) عرب بائدہ ـــــ یعنی وہ قدیم عرب قبائل اور قومیں جو بالکل ناپید ہوگئیں اور ان کے متعلق ضروری تفصیلات بھی دستیاب نہیں۔ مثلاً عاد، ثمود، طسم، جدیس، عمالقہ وغیرہ۔

(۲) عرب عاربہ ـــــ یعنی وہ عرب قبائل جو یعرب بن یشجب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انہیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔

(۳) عرب مستعربہ ـــــ یعنی وہ عرب قبائل جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ انہیں عدنانی عرب کہا جاتا ہے۔

عرب عاربہ یعنی قحطانی عرب کا اصل گہوارہ ملک یمن تھا۔ یہیں ان کے خاندان اور قبیلے مختلف شاخوں میں پھوٹے، پھیلے اور بڑھے۔ ان میں سے دو قبیلوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔

(الف) حمیر ـــــ جس کی مشہور شاخیں زید الجمہور، قضاعہ اور سکاسک ہیں۔

(ب) کہلان ـــــ جس کی مشہور شاخیں ہمدان، انمار، طی، مذحج، کندہ، لخم، جذام، ازد، اوس، خزرج اور اولادِ جفنہ ہیں، جنہوں نے آگے چل کر ملک شام کے اطراف میں بادشاہت قائم کی اور آلِ غسان کے نام سے مشہور ہوئے۔

عام کہلانی قبائل نے بعد میں یمن چھوڑ دیا اور جزیرۃ العرب کے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ ان کے عمومی ترکِ وطن کا واقعہ سیلِ عرم سے کسی قدر پہلے اس وقت پیش آیا جب رومیوں نے مصر و شام پر قبضہ کرکے اہل یمن کی تجارت کے بحری راستے پر اپنا تسلط جما لیا، اور بری شاہراہ کی سہولیات غارت کرکے اپنا دباؤ اس قدر بڑھا دیا کہ کہلانیوں کی تجارت تباہ ہو کر رہ گئی۔

کچھ عجیب نہیں کہ کہلانی اور حمیری خاندانوں میں چشمک بھی رہی ہو اور یہ بھی کہلانیوں کے ترکِ وطن کا ایک مؤثر سبب بنی ہو۔ اس کا اشارہ اس سے بھی ملتا ہے کہ کہلانی قبائل نے تو ترکِ وطن کیا۔ لیکن حمیری قبائل اپنی جگہ برقرار رہے۔

جن کہلانی قبائل نے ترکِ وطن کیا ان کی چار قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

۱- **اَزْد** ـــــ انہوں نے اپنے سردار عمران بن عمرو مزیقیاء کے مشورے پر ترکِ وطن کیا۔ پہلے تو یہ یمن ہی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے اور حالات کا پتا لگانے کے لیے آگے آگے ہراول دستوں کو بھیجتے رہے لیکن آخر کار شمال کا رُخ کیا اور پھر مختلف شاخیں گھومتے گھماتے مختلف جگہ دائمی طور پر سکونت پذیر ہوگئیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ثعلبہ بن عمرو اس نے اَوّلاً حجاز کا رُخ کیا اور ثعلبیہ اور ذی قار کے درمیان اقامت اختیار کی۔ جب اس کی اولاد بڑی ہوگئی اور خاندان مضبوط ہوگیا تو مدینہ کی طرف کوچ کیا، اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ اسی ثعلبہ کی نسل سے اَوْس اور خَزْرَج ہیں جو ثعلبہ کے صاحبزادے حارثہ کے بیٹے ہیں۔

حارثہ بن عمرو یعنی خُزاعہ اور اس کی اولاد یہ لوگ پہلے سرزمین حجاز میں گردش کرتے ہوئے مَرّ الظّہران میں خیمہ زن ہوئے۔ پھر حرم پر دھاوا بول دیا اور بنو جُرْہُم کو نکال کر خود مکہ میں بود و باش اختیار کر لی۔

عمران بن عمرو اس نے اور اسکی اولاد نے عمان میں سکونت اختیار کی اسلیے یہ لوگ ازدِ عمان کہلاتے ہیں۔

نصر بن ازد اس سے تعلق رکھنے والے قبائل نے تہامہ میں قیام کیا۔ یہ لوگ اَزدِ شَنُوءَۃ کہلاتے ہیں۔

جفنہ بن عمرو اس نے ملک شام کا رُخ کیا۔ اور اپنی اولاد سمیت وہیں متوطن ہوگیا۔ یہی شخص غسّانی بادشاہوں کا جدِّ اعلیٰ ہے۔ انہیں آلِ غسّان اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے شام منتقل ہونے سے پہلے حجاز میں غسّان نامی ایک چشمے پر کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔

۲- **لخم و جذام** ـــــ ان ہی لخمیوں میں نصر بن ربیعہ تھا جو حیرہ کے شاہانِ آلِ مُنذِر کا جدِّ اعلیٰ ہے۔

۳- **بنو طَیّ** ـــــ اس قبیلے نے بنو اَزد کے ترکِ وطن کے بعد شمال کا رخ کیا اور اجا اور سلمیٰ نامی دو پہاڑیوں کے اطراف میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگیا، یہانتک کہ یہ دونوں پہاڑیاں قبیلہ طی کی نسبت سے مشہور ہوگئیں۔

۴- **کِندہ** ـــــ یہ لوگ پہلے بحرین ـــــ موجودہ اَلْاَحْسَاء ـــــ میں خیمہ زن ہوئے۔ لیکن مجبوراً وہاں

سے دستکش ہوکر حضر موت گئے۔ مگر وہاں بھی امان نہ ملی اور آخر کار نجد میں ڈیرے ڈالنے پڑے۔ یہاں ان لوگوں نے ایک عظیم الشان حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ مگر یہ حکومت پائیدار نہ ثابت ہوئی اور اس کے آثار جلد ہی ناپید ہو گئے۔

کہلان کے علاوہ حمیر کا بھی صرف ایک قبیلہ قضاعہ ایسا ہے — اور اسکا حمیری ہونا بھی مختلف فیہ ہے — جس نے یمن سے ترکِ وطن کر کے حدود عراق میں بادیۃ السماوہ کے اندر بود و باش اختیار کی۔[1]

عرب مستعربہ ان کے جدِ اعلیٰ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اصلاً عراق کے ایک شہر اُور کے باشندے تھے۔ یہ شہر دریائے فرات کے مغربی ساحل پر کوفے کے قریب واقع تھا۔ اس کی کھدائی کے دوران جو کتبات برآمد ہوئے ہیں ان سے اس شہر کے متعلق بہت سی تفصیلات منظر عام پر آئی ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی بعض تفصیلات اور باشندگان ملک کے دینی اور اجتماعی حالات سے بھی پردہ ہٹا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں سے ہجرت کر کے شہر حَرّان تشریف لے گئے تھے اور پھر وہاں سے فلسطین جا کر اسی ملک کو اپنی پیغمبرانہ سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا اور دعوت و تبلیغ کے لیے یہیں سے اندرون و بیرون ملک مصروف تگ و تاز رہا کرتے تھے۔ ایک بار آپ مصر تشریف لے گئے۔ فرعون نے آپ کی بیوی حضرت سارہؓ کی کیفیت سنی تو ان کے بارے میں بدنیت ہو گیا اور اپنے دربار میں بُرے ارادے سے بلایا لیکن اللہ نے حضرت سارہؓ کی دعا کے نتیجے میں غیبی طور پر فرعون کی ایسی گرفت کی کہ وہ ہاتھ پاؤں مارنے اور پھینکنے لگا۔ اس کی نیت بد اس کے منہ پر مار دی گئی اور وہ حادثے کی نوعیت سے سمجھ گیا کہ حضرت سارہؓ اللہ تعالیٰ کی نہایت خاص اور مقرب بندی ہیں اور وہ حضرت سارہؓ کی اس خصوصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہؓ[2] کو ان کی خدمت میں دے دیا۔ پھر حضرت سارہؓ نے حضرت ہاجرہؓ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔[3]

---

[1] ان قبائل کی اور ان کے ترک وطن کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ للخضری ۱/۱۱-۱۳ قلب جزیرۃ العرب ص ۲۳۱-۲۳۵۔ ترک وطن کے ان واقعات کے زمانہ اور اسباب کے تعین میں تاریخی مآخذ کے درمیان بڑا سخت اختلاف ہے۔ ہم نے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے جو بات راجح محسوس کی اسے درج کر دیا ہے۔

[2] مشہور ہے کہ حضرت ہاجرہؓ لونڈی تھیں لیکن علامہ منصور پوری نے مفصل تحقیق کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ لونڈی نہیں بلکہ آزاد تھیں اور فرعون کی بیٹی تھیں۔ دیکھئے رحمۃ للعالمین ۲/۳۶-۳۷۔

[3] ایضاً ۲/۳۴ واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صحیح بخاری ۱/۴۸۴۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سارہؓ اور حضرت ہاجرہؓ کو ہمراہ لے کر فلسطین واپس تشریف لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ایک فرزند ارجمند۔۔ اسماعیلؑ ۔۔ عطا فرمایا لیکن اس پر حضرت سارہؓ کو جو بے اولاد تھیں بڑی غیرت آئی اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجبور کیا کہ حضرت ہاجرہؓ کو ان کے نوزائیدہ بچے سمیت جلا وطن کر دیں۔ حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ انہیں حضرت سارہؓ کی بات ماننی پڑی اور وہ حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو ہمراہ لے کر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں ایک بے آب و گیاہ وادی میں بیت اللہ شریف کے قریب ٹھہرا دیا۔ اُس وقت بیت اللہ شریف نہ تھا۔ صرف ٹیلے کی طرح اُبھری ہوئی زمین تھی۔ سیلاب آتا تھا تو دائیں بائیں سے کترا کر نکل جاتا تھا۔ وہیں مسجد حرام کے بالائی حصے میں زمزم کے پاس ایک بہت بڑا درخت تھا۔ آپ نے اسی درخت کے پاس حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑا تھا۔ اس وقت مکہ میں نہ پانی تھا نہ آدم اور آدم زاد۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک توشہ دان میں کھجور اور ایک مشکیزے میں پانی رکھ دیا۔ اس کے بعد فلسطین واپس چلے گئے۔ لیکن چند ہی دن میں کھجور اور پانی ختم ہو گیا اور سخت مشکل پیش آئی مگر اس مشکل وقت پر اللہ کے فضل سے زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور ایک عرصہ تک کے لیے سامانِ رزق اور متاعِ حیات بن گیا۔ تفصیلات معلوم و معروف ہیں[۴]

کچھ عرصے بعد یمن سے ایک قبیلہ آیا جسے تاریخ میں جرہم ثانی کہا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ اسماعیل علیہ السلام کی ماں سے اجازت لے کر مکہ میں ٹھہر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ پہلے مکہ کے گرد و پیش کی وادیوں میں سکونت پذیر تھا۔ صحیح بخاری میں اتنی صراحت موجود ہے کہ رہائش کی غرض سے یہ لوگ مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی آمد کے بعد اور ان کے جوان ہونے سے پہلے وارد ہوئے تھے۔ لیکن اس وادی سے ان کا گذر اس سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا[۵]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے متروکات کی نگہداشت کے لیے وقتاً فوقتاً مکہ تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس طرح ان کی آمد کتنی بار ہوئی۔ البتہ تاریخی مآخذ میں چار بار ان کی آمد کی تفصیل محفوظ ہے جو یہ ہے۔

۱۔ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھلایا

---

[۴] ملاحظہ ہو صحیح بخاری، کتاب الانبیاء ۱/۴۷۴، ۴۷۵ [۵] صحیح بخاری ۱/۴۷۵

کہ وہ اپنے صاحبزادے (حضرت اسماعیل علیہ السلام) کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ خواب ایک طرح کا حکمِ الٰہی تھا اور باپ بیٹے دونوں اس حکمِ الٰہی کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے۔ اور جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو اللہ نے پکارا: "اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش تھی اور اللہ نے انہیں فدیے میں ایک عظیم ذبیحہ عطا فرمایا۔"[۶]

مجموعہ بائیبل کی کتاب پیدائش میں مذکور ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے اور قرآن کا سیاق بتلاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے پیش آیا تھا۔ کیونکہ پورا واقعہ بیان کر چکنے کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت کا ذکر ہے۔

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جوان ہونے سے پہلے کم از کم ایک بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کا سفر ضرور کیا تھا۔ بقیہ تین سفروں کی تفصیل صحیح بخاری کی ایک طویل روایت میں ہے جو ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے[۷]۔ اس کا خلاصہ یہ ہے!

۲۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہو گئے۔ جُرہُم سے عربی سیکھ لی اور ان کی نگاہوں میں جچنے لگے تو ان لوگوں نے اپنے خاندان کی ایک خاتون سے آپؑ کی شادی کر دی۔ اسی دوران حضرت ہاجرہؓ کا انتقال ہو گیا۔ ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال ہوا کہ اپنا ترکہ دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مکہ تشریف لے گئے۔ لیکن حضرت اسماعیلؑ سے ملاقات نہ ہوئی۔ بہو سے حالات دریافت کئے۔ اس نے تنگ دستی کی شکایت کی۔ آپؑ نے وصیت کی کہ اسماعیل علیہ السلام آئیں تو کہنا اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔ اس وصیت کا مطلب حضرت اسماعیل علیہ السلام سمجھ گئے۔ بیوی کو طلاق دے دی اور ایک دوسری عورت سے شادی کر لی جو جُرہُم کے سردار مضاض بن عمرو کی صاحبزادی تھی[۸]۔

۳۔ اس دوسری شادی کے بعد ایک بار پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لے گئے مگر اس دفعہ بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات نہ ہوئی۔ بہو سے احوال دریافت کئے تو اس نے اللہ کی حمد و ثنا کی۔ آپ نے وصیت کی کہ اسماعیل علیہ السلام اپنے دروازے کی چوکھٹ برقرار رکھیں اور فلسطین واپس ہو گئے۔

---

[۶] سورۂ صافات: ۱۰۳-۱۰۷ (فَلَمَّآ اَسْلَمَا ... بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ) [۷] صحیح بخاری ۱/۴۷۵-۴۷۶ [۸] قلب جزیرۃ العرب ص ۲۳۰

۴۔ اس کے بعد پھر تشریف لائے تو اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب درخت کے نیچے تیر گھڑ رہے تھے۔ دیکھتے ہی لپک پڑے اور وہی کیا جو ایسے موقع پر ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ اور بیٹا باپ کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ ملاقات اتنے طویل عرصے کے بعد ہوئی تھی کہ ایک نرم دل اور شفیق باپ اپنے بیٹے سے اور ایک اطاعت شعار بیٹا اپنے باپ سے بمشکل ہی اتنی لمبی جدائی برداشت کر سکتا ہے۔ اسی دفعہ دونوں نے مل کر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ بنیاد کھود کر دیواریں اٹھائیں اور ابراہیم علیہ السلام نے ساری دنیا کے لوگوں کو حج کے لیے آواز دی۔

اللہ تعالیٰ نے مضاض کی صاحبزادی سے اسماعیل علیہ السلام کو بارہ بیٹے عطا فرمائے[۹] جن کے نام یہ ہیں۔ نابت یا نبایوط، قیدار، ادبائیل، مبشام، مشماع، دوما، میشا، حدد، تیما، یطور، نفیس، قیدمان

ان بارہ بیٹوں سے بارہ قبیلے وجود میں آئے اور سب نے مکہ ہی میں بود و باش اختیار کی۔ ان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر یمن اور مصر و شام کی تجارت پر تھا۔ بعد میں یہ قبائل جزیرۃ العرب کے مختلف اطراف میں — بلکہ بیرونِ عرب بھی — پھیل گئے اور ان کے حالات، زمانے کی دبیز تاریکیوں میں دب کر رہ گئے۔ صرف نابت اور قیدار کی اولاد اس گمنامی سے مستثنیٰ ہیں۔

نبطیوں کے تمدن کو شمالی حجاز میں فروغ اور عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے ایک طاقتور حکومت قائم کر کے گرد و پیش کے لوگوں کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ بطرا ان کا دارالحکومت تھا۔ کسی کو ان کے مقابلے کی تاب نہ تھی۔ پھر رومیوں کا دور آیا اور انہوں نے نبطیوں کو قصۂ پارینہ بنا دیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک دلچسپ بحث اور گہری تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ آلِ غسان اور انصار یعنی اوس و خزرج قحطانی عرب نہ تھے۔ بلکہ اس علاقے میں نابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی جو نسل بچی کھچی رہ گئی تھی وہی تھے[۱۰]

قیدار بن اسماعیل علیہ السلام کی نسل مکہ ہی میں پھلتی پھولتی رہی یہاں تک کہ عدنان اور پھر ان کے بیٹے معد کا زمانہ آگیا۔ عدنانی عرب کا سلسلۂ نسب صحیح طور پر یہیں تک محفوظ ہے۔

عدنان، نبی ﷺ کے سلسلۂ نسب میں اکیسویں پشت پر پڑتے ہیں۔ بعض روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ جب اپنا سلسلۂ نسب ذکر فرماتے تو عدنان پر پہنچ کر رک جاتے اور آگے نہ بڑھتے۔ فرماتے کہ ماہرینِ انساب غلط کہتے ہیں[۱۱] مگر علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ عدنان سے

---

۹ ایضاً ایضاً۔ ۱۰ دیکھئے تاریخ ارض القرآن ۲/۷۸-۸۶

۱۱ طبری: تاریخ الامم والملوک ۲/۱۹۱-۱۹۴، الاعلام ۵/۶

آگے بھی نسب بیان کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق عدنان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان چالیس پشتیں ہیں۔

بہرحال مُعَدّ کے بیٹے نزار سے ـــــ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ مُعَدّ کی کوئی اولاد نہ تھی ـــــ کئی خاندان وجود میں آئے۔ درحقیقت نزار کے چار بیٹے تھے اور ہر بیٹا ایک بڑے قبیلے کی بنیاد ثابت ہوا۔ چاروں کے نام یہ ہیں۔ اِیاد، اَنمار، رَبیعہ اور مُضَر۔ ان میں سے مؤخر الذکر دو قبیلوں کی شاخیں اور شاخوں کی شاخیں بہت زیادہ ہوئیں۔ چنانچہ رَبیعہ سے اَسَد بن ربیعہ، عنزہ، عبدالقیس، وائل، بکر، تَغلب اور بنو حَنیفہ وغیرہ وجود میں آئے۔

مُضَر کی اولاد دو بڑے قبیلوں میں تقسیم ہوئی۔

۱۔ قیس عیلان بن مضر۔ ۲۔ الیاس بن مضر۔

قیس عیلان سے بنو سُلَیم، بنو ہَوازِن، بنو غَطَفان، غطفان سے عَبس، ذُبیان ـــــ اَشجَع اور غَنی بن اَعصُر کے قبائل وجود میں آئے۔

الیاس بن مضر سے تمیم بن مرہ، ہُذَیل بن مدرکہ، بنو اسد بن خُزَیمہ اور کنانہ بن خُزَیمہ کے قبائل وجود میں آئے۔ پھر کنانہ سے قُرَیش کا قبیلہ وجود میں آیا۔ یہ قبیلہ فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد ہے۔

پھر قریش بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہوئے۔ مشہور قُرَیشی شاخوں کے نام یہ ہیں۔ جمح، سَہم، عَدِی، مخزوم، تَیم، زُہرہ اور قُصَی بن کلاب کے خاندان۔ یعنی عبدالدار، اسد بن عبدالعزیٰ اور عبدِمناف۔ یہ تینوں قُصَی کے بیٹے تھے۔ ان میں سے عبدِمناف کے چار بیٹے ہوئے، جن سے چار ذیلی قبیلے وجود میں آئے۔ یعنی عَبدِشمس، نَوفَل، مُطَّلِب اور ہاشم۔ انہیں ہاشم کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضور محمد ﷺ کا انتخاب فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کا انتخاب فرمایا پھر اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ کی نسل سے قریش کو چنا پھر قریش میں سے بنو ہاشم کا انتخاب کیا اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب کیا۔[۱۳]

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے خلق کی تخلیق فرمائی تو مجھے سب سے اچھے گروہ میں بنایا' پھر ان کے بھی دو گروہوں میں سے زیادہ اچھے گروہ کے اندر رکھا' پھر قبائل کو چنا تو مجھے سب سے اچھے قبیلے کے اندر بنایا' پھر گھرانوں کو چنا مجھے سب سے اچھے

---

[۱۲] محاضرات خضری ۱/۱۴، ۱۵ [۱۳] صحیح مسلم ۲/۲۴۵، جامع ترمذی ۲/۲۰۱

گھرانے میں بنایا' لہٰذا میں اپنی ذات کے اعتبار سے بھی سب سے اچھا ہوں' اور اپنے گھرانے کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر ہوں[۱۴]"

بہر حال عدنان کی نسل جب زیادہ بڑھ گئی تو وہ چارے پانی کی تلاش میں عرب کے مختلف اطراف میں بکھر گئی چنانچہ قبیلہ عبدالقیس نے، بکر بن وائل کی کئی شاخوں نے اور بنو تمیم کے خاندانوں نے بحرین کا رُخ کیا اور اسی علاقے میں جا بسے۔

بنو حنیفہ بن صعب بن علی بن بکر نے یمامہ کا رُخ کیا اور اس کے مرکز حجر میں سکونت پذیر ہو گئے۔

بکر بن وائل کی بقیہ شاخوں نے، یمامہ سے لے کر بحرین، ساحل کاظمہ، خلیج، سوادِ عراق، اُبلّہ اور ہیت تک کے علاقوں میں بود و باش اختیار کی۔

بنو تغلب جزیرہ فراتیہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ البتہ ان کی بعض شاخوں نے بنو بکر کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

بنو تمیم نے بادیہ بصرہ کو اپنا وطن بنایا۔

بنو سُلَیم نے مدینہ کے قریب ڈیرے ڈالے۔ ان کا مسکن وادی القریٰ سے شروع ہو کر خیبر اور مدینہ کے مشرق سے گذرتا ہوا حرہ بنو سُلَیم سے متصل دو پہاڑوں تک منتہی ہوتا تھا۔

بنو ثقیف نے طائف کو وطن بنا لیا اور بنو ہوازن نے مکہ کے مشرق میں وادی اوطاس کے گرد و پیش ڈیرے ڈالے۔ ان کا مسکن مکہ۔ بصرہ شاہراہ پر واقع تھا۔

بنو اسد تیماء کے مشرق اور کوفہ کے مغرب میں خیمہ زن ہوئے۔ ان کے اور تیماء کے درمیان بنو طی کا ایک خاندان سجنز آباد تھا۔ بنو اسد کی آبادی اور کوفے کے درمیان پانچ دن کی مسافت تھی۔

بنو ذُبیان تیماء کے قریب حوران کے اطراف میں آباد ہوئے۔

تہامہ میں بنو کنانہ کے خاندان رہ گئے تھے۔ ان میں سے قریشی خاندانوں کی بود و باش مکہ اور اس کے اطراف میں تھی۔ یہ لوگ پراگندہ تھے، ان کی کوئی شیرازہ بندی نہ تھی تا آنکہ قُصَیّ بن کلاب ابھر کر منظر عام پر آیا اور قریشیوں کو متحد کر کے شرف و عزت اور بلندی و وقار سے بہرہ ور کیا[۱۵]

○

---

[۱۴] ترمذی ۲/۲۰۱ [۱۵] محاضرات خضری ۱/۱۵، ۱۶

خط کشیدہ الفاظ مقامات کے نام ہیں۔
باقی قبائل کے نام ہیں۔

ابتدائے نبوت کے زمانے کا عرب

عرب ـ حکومتیں اور سرداریاں

اسلام سے پہلے عرب کے جو حالات تھے ان پر گفتگو کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی حکومتوں سرداریوں اور مذاہب و ادیان کا بھی ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ ظہورِ اسلام کے وقت جو پوزیشن تھی وہ بآسانی سمجھ میں آسکے۔

جس وقت جزیرۃ العرب پر خورشیدِ اسلام کی تابناک شعاعیں ضوفگن ہوئیں وہاں دو قسم کے حکمران تھے۔ ایک تاج پوش بادشاہ جو درحقیقت مکمل طور پر آزاد و خود مختار نہ تھے اور دوسرے قبائلی سردار جنہیں اختیارات و امتیازات کے اعتبار سے وہی حیثیت حاصل تھی جو تاج پوش بادشاہوں کی تھی لیکن ان کی اکثریت کو ایک مزید امتیاز یہ بھی حاصل تھا کہ وہ پورے طور پر آزاد و خود مختار تھے۔ تاجپوش حکمران یہ تھے، شاہانِ یمن، شاہانِ آلِ غسان (شام) اور شاہانِ حیرہ (عراق) بقیہ عرب حکمران تاجپوش نہ تھے۔

یمن کی بادشاہی

عرب عاربہ میں سے جو قدیم ترین یمانی قوم معلوم ہو سکی وہ قوم سبا ہے۔ اور (عراق) سے جو کتبات برآمد ہوئے ہیں ان میں ڈھائی ہزار سال قبلِ مسیح اس قوم کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کے عروج کا زمانہ گیارہ صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اس کی تاریخ کے اہم ادوار یہ ہیں:

۱۔ ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دور ـــ اس دور میں شاہانِ سبا کا لقب مکرب سبا تھا۔ ان کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مآرب کے مغرب میں ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دور میں مآرب کے مشہور بند کی بنیاد رکھی گئی جسے یمن کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں سلطنتِ سبا کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ انہوں نے عرب کے اندر اور عرب سے باہر جگہ جگہ اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں۔

۲۔ ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور ـــ اس دور میں سبا کے بادشاہوں نے مکرب کا لفظ چھوڑ کر ملک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا اور صرواح کے بجائے مآرب کو اپنا دارالسلطنت بنایا

اس شہر کے کھنڈر آج بھی صنعاء کے ۲۰ میل مشرق میں پائے جاتے ہیں۔

۳۔ ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دور — اس دور میں سبا کی مملکت پر قبیلہ حمیر کو غلبہ حاصل رہا اور اس نے مآرب کے بجائے رَیدان کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ پھر ریدان کا نام ظفار پڑ گیا جس کے کھنڈرات آج بھی شہر "ریم" کے قریب ایک مُدوّر پہاڑی پر پائے جاتے ہیں۔

یہی دور ہے جس میں قوم سبا کا زوال شروع ہوا۔ پہلے نبطیوں نے شمالی حجاز پر اپنا اقتدار قائم کر کے سبا کو ان کی نوآبادیوں سے نکال باہر کیا پھر رومیوں نے مصر و شام اور شمالی حجاز پر قبضہ کر کے ان کی تجارت کے بحری راستے کو مخدوش کر دیا اور اس طرح انکی تجارت رفتہ رفتہ تباہ ہو گئی۔ ادھر قحطانی قبائل خود بھی باہم دست و گریباں تھے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ قحطانی قبائل اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اِدھر اُدھر پراگندہ ہو گئے۔

۴۔ ۳۰۰ء کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور — اس دور میں یمن کے اندر مسلسل اضطراب و انتشار برپا رہا۔ انقلابات آئے، خانہ جنگیاں ہوئیں اور بیرونی قوموں کو مداخلت کے مواقع ہاتھ آئے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یمن کی آزادی سلب ہو گئی۔ چنانچہ یہی دور ہے جس میں رومیوں نے عدن پر فوجی تسلط قائم کیا اور ان کی مدد سے حبشیوں نے حمیر و ہمدان کی باہمی کشاکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۳۴۰ء میں پہلی بار یمن پر قبضہ کیا جو ۳۷۰ء تک برقرار رہا۔ اس کے بعد یمن کی آزادی تو بحال ہو گئی مگر "مآرب" کے مشہور بند میں رخنے پڑنا شروع ہو گئے یہاں تک کہ بالآخر ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند ٹوٹ گیا اور وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید (سورہ سبا) میں سَیلِ عَرِم کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ بڑا زبردست حادثہ تھا۔ اس کے نتیجے میں بستیوں کی بستیاں ویران ہو گئیں اور بہت سے قبائل اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

پھر ۵۲۳ء میں ایک اور سنگین حادثہ پیش آیا یعنی یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر ایک ہیبت ناک حملہ کر کے انہیں عیسائی مذہب چھوڑنے پر مجبور کرنا چاہا اور جب وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے تو ذونواس نے خندقیں کھدوا کر انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے الاؤ میں جھونک دیا۔ قرآنِ مجید نے سورۂ بروج کی آیات قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ الخ میں اسی لرزہ خیز واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس واقعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت، جو رومی بادشاہوں کی قیادت میں بلادِ عرب کی فتوحات اور توسیع پسندی کے لیے پہلے ہی سے چست و چابکدست تھی، انتقام لینے پر تُل گئی اور حبشیوں کو یمن پر حملے کی ترغیب دیتے ہوئے انہیں بحری بیڑہ مہیا کیا۔ حبشیوں نے رومیوں کی شہ

پاکر ۵۲۵ء میں ارباط کی زیر قیادت ستر ہزار فوج سے یمن پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ قبضہ کے بعد ابتداءً تو شاہ حبش کے گورنر کی حیثیت سے ارباط نے یمن پر حکمرانی کی لیکن پھر اس کی فوج کے ایک ماتحت کمانڈر ــــ ابرہہ ــــ نے اسے قتل کر کے خود اقتدار پر قبضہ کر لیا اور شاہ حبش کو بھی اپنے اس تصرف پر راضی کر لیا۔

یہ وہی ابرہہ ہے جس نے بعد میں خانۂ کعبہ کو ڈھانے کی کوشش کی اور ایک لشکر جرار کے علاوہ چند ہاتھیوں کو بھی فوج کشی کیلیے ساتھ لایا جس کی وجہ سے یہ لشکر اصحاب فیل کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ادھر واقعۂ فیل میں حبشیوں کی جو تباہی ہوئی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل یمن نے حکومتِ فارس سے مدد مانگی اور حبشیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے سیف ذی یزن حمیری کے بیٹے معدیکرب کی قیادت میں حبشیوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے معدیکرب کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

آزادی کے بعد معدیکرب نے کچھ حبشیوں کو اپنی خدمت اور شاہی جلو کی زینت کے لیے روک لیا لیکن یہ شوق مہنگا ثابت ہوا۔ ان حبشیوں نے ایک روز معدیکرب کو دھوکے سے قتل کر کے ذی یزن کے خاندان سے حکمرانی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔ ادھر کسریٰ نے اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صنعاء پر ایک فارسی النسل گورنر مقرر کر کے یمن کو فارس کا ایک صوبہ بنا لیا۔ اس کے بعد یمن پر یکے بعد دیگرے فارسی گورنروں کا تقرر ہوتا رہا یہاں تک کہ آخری گورنر باذان نے ۶۲۸ء میں اسلام قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ہی یمن فارسی اقتدار سے آزاد ہو کر اسلام کی عملداری میں آگیا۔[1]

حیرہ کی بادشاہی

عراق اور اس کے نواحی علاقوں پر کوروش کبیر (خورس یا سائرس ذوالقرنین ۵۵۷ ق م ــــ ۵۲۹ ق م) کے زمانے ہی سے اہل فارس کی حکمرانی چلی آرہی تھی۔ کوئی نہ تھا جو ان کے مدِ مقابل آنے کی جرأت کرتا یہاں تک کہ ۳۲۶ ق م میں سکندر مقدونی نے دارا اول کو شکست دے کر فارسیوں کی طاقت توڑ دی جس کے نتیجے میں ان کا ملک ٹکڑے ٹکڑے

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے تاریخ ارض القرآن جلد اول میں صفحہ ۱۳۳ سے خاتمۂ کتاب تک مختلف تاریخی شواہد کی روشنی میں قوم سبا کے حالات بڑی بسط و تفصیل سے رقم فرمائے ہیں۔ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن ۴/۱۹۵ - ۱۹۸ میں کچھ تفصیلات جمع کی ہیں لیکن تاریخی مآخذ میں سنین وغیرہ کے سلسلے میں بڑے اختلافات ہیں حتیٰ کہ بعض محققین نے ان تفصیلات کو "پہلوں کا افسانہ" قرار دیا ہے۔

ہوگیا اور طوائف الملوکی شروع ہوگئی۔ یہ انتشار ۲۳۰ء تک جاری رہا اور اسی دوران قحطانی قبائل نے ترکِ وطن کرکے عراق کے ایک بہت بڑے شاداب سرحدی علاقے پر بود و باش اختیار کی۔ پھر عدنانی تارکینِ وطن کا ریلا آیا اور انہوں نے لڑ بھڑ کر جزیرہ فراتیہ کے ایک حصے کو اپنا مسکن بنالیا۔

ادھر ۲۲۶ء میں اردشیر نے جب ساسانی حکومت کی داغ بیل ڈالی تو رفتہ رفتہ فارسیوں کی طاقت ایک بار پھر پلٹ آئی۔ اردشیر نے فارسیوں کی شیرازہ بندی کی اور اپنے ملک کی سرحد پر آباد عربوں کو زیر کیا۔ اسی کے نتیجے میں قضاعہ نے ملک شام کی راہ لی، جبکہ حیرہ اور انبار کے عرب باشندوں نے باجگذار بننا گوارا کیا۔

اردشیر کے عہد میں حیرہ، بادیۃ العراق اور جزیرہ کے ربیعی اور مضری قبائل پر جذیمۃ الوضاح کی حکمرانی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردشیر نے محسوس کر لیا تھا کہ عرب باشندوں پر براہِ راست حکومت کرنا اور انہیں سرحد پر لوٹ مار سے باز رکھنا ممکن نہیں بلکہ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ خود کسی ایسے عرب کو ان کا حکمران بنا دیا جائے جسے اپنے کنبے قبیلے کی حمایت و تائید حاصل ہو۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بوقت ضرورت رومیوں کے خلاف ان سے مدد لی جاسکے گی اور شام کے روم نواز عرب حکمرانوں کے مقابل عراق کے ان عرب حکمرانوں کو کھڑا کیا جاسکے گا۔

شاہانِ حیرہ کے پاس فارسی فوج کی ایک یونٹ ہمیشہ رہا کرتی تھی جس سے بادیہ نشین عرب باغیوں کی سرکوبی کا کام لیا جاتا تھا۔

۲۶۸ء کے عرصے میں جذیمہ فوت ہوگیا اور عمرو بن عدی بن نصر لخمی اس کا جانشین ہوا۔ یہ قبیلہ لخم کا پہلا حکمران تھا اور شاپور اردشیر کا ہمعصر تھا۔ اس کے بعد قباذ بن فیروز کے عہد تک حیرہ پر لخمیوں کی مسلسل حکمرانی رہی۔ قباذ کے عہد میں مزدک کا ظہور ہوا جو اباحیت کا علمبردار تھا۔ قباذ اور اس کی بہت سی رعایا نے مزدک کی ہمنوائی کی۔ پھر قباذ نے حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء کو پیغام بھیجا کہ تم بھی یہی مذہب اختیار کر لو۔ منذر بڑا غیرت مند تھا انکار کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قباذ نے اسے معزول کرکے اس کی جگہ مزدکی کی دعوت کے ایک پیروکار حارث بن عمرو بن حجر کندی کو حیرہ کی حکمرانی سونپ دی۔

قباذ کے بعد فارس کی باگ ڈور کسریٰ نوشیرواں کے ہاتھ آئی۔ اسے اس مذہب سے سخت نفرت تھی۔ اس نے مزدک اور اس کے ہمنواؤں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کروا دیا۔ منذر کو دوبارہ حیرہ کا حکمران بنا دیا اور حارث بن عمرو کو اپنے ہاں بلا بھیجا لیکن وہ بنو کلب کے علاقے میں بھاگ گیا اور وہیں اپنی زندگی گذار دی۔

مُنذر بن ماءالسماء کے بعد نُعمان بن مُنذر کے عہد تک حیرہ کی حکمرانی اسی کی نسل میں چلتی رہی، پھر زید بن عدی عبادی نے کسریٰ سے نُعمان بن منذر کی جھوٹی شکایت کی۔ کسریٰ بھڑک اٹھا اور نعمان کو اپنے پاس طلب کیا۔ نعمان چپکے سے بنو شیبان کے سردار ہانی بن مسعود کے پاس پہنچا اور اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کو اس کی امانت میں دے کر کسریٰ کے پاس گیا۔ کسریٰ نے اسے قید کر دیا اور وہ قید ہی میں فوت ہو گیا۔

ادھر کسریٰ نے نعمان کو قید کرنے کے بعد اس کی جگہ ایاس بن قبیصہ طائی کو حیرہ کا حکمران بنایا اور اسے حکم دیا کہ ہانی بن مسعود سے نعمان کی امانت طلب کرے۔ ہانی غیرت مند تھا اس نے صرف انکار ہی نہیں کیا۔ بلکہ اعلانِ جنگ بھی کر دیا۔ پھر کیا تھا ایاس اپنے جلو میں کسریٰ کے لاؤ لشکر اور مرزبانوں کی جماعت لے کر روانہ ہوا اور ذی قار کے میدان میں فریقین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں بنو شیبان کو فتح حاصل ہوئی اور فارسیوں نے شرمناک شکست کھائی۔ یہ پہلا موقع تھا جب عرب نے عجم پر فتح حاصل کی تھی۔ یہ واقعہ نبی ﷺ کی پیدائش کے تھوڑے ہی دنوں بعد کا ہے۔ آپ ﷺ کی پیدائش حیرہ پر ایاس کی حکمرانی کے آٹھویں مہینہ میں ہوئی تھی۔

ایاس کے بعد کسریٰ نے حیرہ پر ایک فارسی حاکم مقرر کیا لیکن ۶۳۲ء میں لخمیوں کا اقتدار پھر بحال ہو گیا اور مُنذر بن معرور نامی اس قبیلے کے ایک شخص نے باگ ڈور سنبھالی، مگر ابھی اس کو برسرِ اقتدار آئے صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلام کا سیلِ رواں لے کر حیرہ میں داخل ہو گئے۔

شام کی بادشاہی

جس زمانے میں عرب قبائل کی ہجرت زوروں پر تھی قبیلہ قضاعہ کی چند شاخیں حدودِ شام میں آ کر آباد ہو گئیں۔ ان کا تعلق بنی سُلیم بن حلوان سے تھا اور ان ہی میں ایک شاخ بنو ضجعم بن سلیم تھی جسے ضجاعمہ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ قضاعہ کی اس شاخ کو رومیوں نے صحرائے عرب کے بدوؤں کی لوٹ مار روکنے اور فارسیوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اپنا ہمنوا بنایا اور اسی کے ایک فرد کے سر پر حکمرانی کا تاج رکھ دیا۔ اس کے بعد مدتوں ان کی حکمرانی رہی۔ ان کا مشہور ترین بادشاہ زیاد بن ہبولہ گذرا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ضجاعمہ کا دورِ حکومت پوری دوسری صدی عیسوی پر محیط رہا ہے۔ اس کے بعد اس دیار میں آلِ غسان کی آمد آمد ہوئی اور ضجاعمہ کی حکمرانی جاتی رہی۔ آلِ غسان نے بنو ضجعم کو شکست دے کر ان کی ساری قلمرو پر قبضہ کر لیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر رومیوں نے بھی آلِ غسان کو دیارِ شام کے عرب باشندوں کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ آلِ غسان کا پایہ تخت دُومۃ الجندل

تھا۔ اور رومیوں کے آلۂ کار کی حیثیت سے دیارِ شام پر ان کی حکمرانی مسلسل قائم رہی تا آنکہ خلافت فاروقی میں ۱۳ھ میں یرموک کی جنگ پیش آئی اور آلِ غسان کا آخری حکمران جبلہ بن ایہم حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا[۲] (اگرچہ اس کا غرور اسلامی مساوات کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکا۔ اور وہ مرتد ہوگیا۔)

حجاز کی امارت

یہ بات تو معروف ہے کہ مکہ میں آبادی کا آغاز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ہوا۔ آپؑ نے ۱۳۷ سال کی عمر پائی[۳] اور تاحیات مکہ کے سربراہ اور بیت اللہ کے متولی رہے[۴]۔ آپؑ کے بعد آپؑ کے دو صاحبزادگان ـــــ نابت پھر قیذار، یا قیذار پھر نابت ـــــ یکے بعد دیگرے مکہ کے والی ہوئے۔ ان کے بعد ان کے نانا مضاض بن عمرو جرہمی نے زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح مکہ کی سربراہی بنو جرہم کی طرف منتقل ہوگئی اور ایک عرصے تک انہیں کے ہاتھ میں رہی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام چونکہ اپنے والد کے ساتھ مل کر بیت اللہ کے بانی و معمار تھے اس لیے ان کی اولاد کو ایک باوقار مقام ضرور حاصل رہا، لیکن اقتدار و اختیار میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا[۵]۔

پھر دن پر دن اور سال پر سال گذرتے گئے لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد گوشۂ گمنامی سے نہ نکل سکی، یہاں تک کہ بخت نصر کے ظہور سے کچھ پہلے بنو جرہم کی طاقت کمزور پڑ گئی اور مکہ کے افق پر عدنان کا سیاسی ستارہ جگمگانا شروع ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بختِ نصر نے ذاتِ عرق میں عربوں سے جو معرکہ آرائی کی تھی اس میں عرب فوج کا کمانڈر جرہمی نہ تھا[۶]۔

پھر بختِ نصر نے جب ۵۸۸ ق م میں دوسرا حملہ کیا تو بنو عدنان بھاگ کر یمن چلے گئے۔ اس وقت بنو اسرائیل کے نبی حضرت یرمیاہ تھے۔ وہ عدنان کے بیٹے معد کو اپنے ساتھ ملک شام لے گئے اور جب بختِ نصر کا زور ختم ہوا اور معد مکہ آئے تو انہیں مکہ میں قبیلہ جرہم کا صرف ایک شخص جرشم بن جلہمہ ملا۔ معد نے اس کی لڑکی معانہ سے شادی کی اور اسی کے بطن سے نزار پیدا ہوا[۷]۔

اس کے بعد مکہ میں جرہم کی حالت خراب ہوتی گئی۔ انہیں تنگ دستی نے آگھیرا، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے زائرینِ بیت اللہ پر زیادتیاں شروع کردیں اور خانۂ کعبہ کا مال کھانے سے بھی دریغ نہ کیا[۸]۔ ادھر بنو عدنان اندر ہی اندر ان کی ان حرکتوں پر کڑھتے اور بھڑکتے رہے اسی لیے جب بنو خزاعہ

---

[۲] محاضرات خضری ۱/۳۴، تاریخ ارض القرآن ۲/۸۰-۸۲

[۳] پیدائش و مجموعہ بائیبل، ۲۵: ۱۷ [۴] قلب جزیرۃ العرب ص ۲۳۰، ۲۳۷

[۵] ایضاً ایضاً و ابن ہشام ۱/۱۱۳-۱۱۱، ابن ہشام نے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے صرف نابت کی ترلیت کا ذکر کیا ہے۔

[۶] قلب جزیرۃ العرب ص ۲۳۰ - [۷] رحمۃ للعالمین ۲/۴۰ [۸] قلب جزیرۃ العرب، ص ۲۳۱

نے مَرّالظہران میں پڑاؤ کیا اور دیکھا کہ بنو عدنان بنو جرہم سے نفرت کرتے ہیں تو اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک عدنانی قبیلے (بنو بکر بن عبد مناف بن کنانہ) کو ساتھ لے کر بنو جرہم کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور انہیں مکہ سے نکال کر اقتدار پر خود قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ دوسری صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔

بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا اور اس میں کئی تاریخی چیزیں دفن کر کے اس کے نشانات بھی مٹا دیئے۔ محمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عمرو بن حارث بن مضاض[۹] جرہمی نے خانہ کعبہ کے دونوں ہرن[۱۰] اور اس کے کونے میں لگا ہوا پتھر — حجر اسود — نکال کر زمزم کے کنویں میں دفن کر دیا اور اپنے قبیلہ بنو جرہم کو ساتھ لے کر یمن چلا گیا۔ بنو جرہم کو مکہ سے جلا وطنی اور وہاں کی حکومت سے محروم ہونے کا بڑا قلق تھا چنانچہ عمرو مذکور نے اسی سلسلے میں یہ اشعار کہے۔

كان لم يكن بين الحجون إلى الصفا — انيس ولم يسمر بمكة سامر

بلى نحن كنا اهلها فابادنا — صروف الليالي والجدود العواثر[۱۱]

"لگتا ہے حجون سے صفا تک کوئی آشنا تھا ہی نہیں اور نہ کسی قصہ گو نے مکہ کی شبانہ محفلوں میں قصہ گوئی کی۔ کیوں نہیں! یقیناً ہم ہی اس کے باشندے تھے لیکن زمانے کی گردشوں اور ٹوٹی ہوئی قسمتوں نے ہمیں اُجاڑ پھینکا۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح ہے۔ اس حساب سے کہ میں قبیلۂ جرہم کا وجود کوئی دو ہزار ایک سو برس تک رہا اور ان کی حکمرانی لگ بھگ دو ہزار برس تک رہی۔

بنو خزاعہ نے مکہ پر قبضہ کرنے کے بعد بنو بکر کو شامل کئے بغیر تنہا اپنی حکمرانی قائم کی، البتہ تین اہم اور امتیازی مناصب ایسے تھے جو مُضری قبائل کے حصے میں آئے۔

۱۔ حاجیوں کو عرفات سے مزدلفہ لے جانا اور یوم النفر — ۱۳ ذی الحجہ کو جو کہ حج کے سلسلہ کا آخری دن ہے — منیٰ سے روانگی کا پروانہ دینا۔ یہ اعزاز الیاس بن مضر کے خاندان بنو غوث بن مرہ کو حاصل تھا جو صوفہ کہلاتے تھے۔ اس اعزاز کی توضیح یہ ہے کہ ۱۳ ذی الحجہ کو حاجی کنکری نہ مار سکتے تھے جب تک کہ پہلے صوفہ کا ایک ایک آدمی کنکری نہ مار لیتا۔ پھر حاجی کنکری مار کر فارغ ہو جاتے اور منیٰ سے

---

۹ یہ وہ مضاض جرہمی نہیں ہے جس کا ذکر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واقعے میں گذر چکا ہے۔

۱۰ مسعودی نے لکھا ہے کہ اہل فارس پچھلے دور میں خانہ کعبہ کے لیے اموال و جواہرات بھیجتے رہتے تھے۔ ساسان بن بابک نے سونے کے بنے ہوئے دو ہرن، جواہرات، تلواریں اور بہت سا سونا بھیجا تھا۔ عمرو نے یہ سب زمزم کے کنویں میں ڈال دیا تھا۔ (مروج الذہب ۱/۲۰۵)

۱۱ ابن ہشام ۱/۱۱۴، ۱۱۵۔

روانگی کا ارادہ کرتے تو صوفہ کے لوگ منیٰ کی واحد گذرگاہ عقبہ کے دونوں جانب گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے اور جب تک خود گذر نہ لیتے کسی کو گذرنے نہ دیتے۔ ان کے گذر لینے کے بعد بقیہ لوگوں کے لیے راستہ خالی ہوتا۔ جب صوفہ ختم ہو گئے تو یہ اعزاز بنو تمیم کے ایک خاندان بنو سعد بن زید مناۃ کی طرف منتقل ہو گیا۔

۲۔ ۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو مزدلفہ سے منیٰ کی جانب افاضہ (روانگی) یہ اعزاز بنو عدوان کو حاصل تھا۔

۳۔ حرام مہینوں کو آگے پیچھے کرنا۔ یہ اعزاز بنو کنانہ کی ایک شاخ بنو تمیم بن عدی کو حاصل تھا۔[۱۲]

مکہ پر بنو خزاعہ کا اقتدار کوئی تین سو برس تک قائم رہا[۱۳] اور یہی زمانہ تھا جب عدنانی قبائل مکہ اور حجاز سے نکل کر نجد، اطرافِ عراق اور بحرین وغیرہ میں پھیلے اور مکہ کے اطراف میں صرف قریش کی چند شاخیں باقی رہیں جو خانہ بدوش تھیں۔ ان کی الگ الگ ٹولیاں تھیں اور بنو کنانہ میں ان کے چند متفرق گھرانے تھے مگر مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا یہاں تک کہ قُصَّی بن کلاب کا ظہور ہوا۔[۱۴]

قُصَّی کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ ابھی گود ہی میں تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی والدہ نے بنو عُذرہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی۔ یہ قبیلہ چونکہ ملک شام کے اطراف میں رہتا تھا اس لیے قُصَّی کی والدہ وہیں چلی گئی اور وہ قُصَّی کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔ جب قُصَّی جوان ہوا تو مکہ واپس آیا۔ اس وقت مکہ کا والی حُلَیل بن حبشیہ خزاعی تھا۔ قُصَّی نے اس کے پاس اس کی بیٹی حبی سے نکاح کے لیے پیغام بھیجا۔ حُلَیل نے منظور کر لیا اور شادی کر دی۔[۱۵] اس کے بعد جب حُلَیل کا انتقال ہوا تو مکہ اور بیت اللہ کی تولیت کے لیے خزاعہ اور قریش کے درمیان جنگ ہو گئی اور اس کے نتیجے میں مکہ اور بیت اللہ پر قُصَّی کا اقتدار قائم ہو گیا۔

جنگ کا سبب کیا تھا؟ اس بارے میں تین بیانات ملتے ہیں: ایک یہ کہ جب قُصَّی کی اولاد خوب پھل پھول گئی اس کے پاس دولت کی بھی فراوانی ہو گئی اور اس کا وقار بھی بڑھ گیا اور ادھر حُلَیل کا انتقال ہو گیا تو قُصَّی نے محسوس کیا کہ اب بنو خزاعہ اور بنو بکر کے بجائے میں کعبہ کی تولیت اور مکہ کی حکومت کا کہیں زیادہ حقدار ہوں۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ قریش خالص اسماعیلی عرب ہیں اور بقیہ آلِ اسماعیل کے سردار بھی ہیں لہٰذا سربراہی کے مستحق وہی ہیں، چنانچہ اس نے قریش

---

۱۲ ابن ہشام ۱/۴۴، ۱۱۹-۱۲۲ ۱۳ یاقوت: مادہ مکہ

۱۴ محاضرات خضری ۱/۳۵، ابن ہشام ۱/۱۱۷ ۱۵ ابن ہشام ۱/۱۱۷، ۱۱۸

اور بنو خزاعہ کے کچھ لوگوں سے گفتگو کی کہ کیوں نہ بنو خزاعہ اور بنو بکر کو مکہ سے نکال باہر کیا جائے۔ ان لوگوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔[۱۶]

دوسرا بیان یہ ہے کہ ــــ خزاعہ کے بقول ــــ خود حُلَیل نے قُصَی کو وصیت کی تھی کہ وہ کعبہ کی نگہداشت کرے گا اور مکہ کی باگ ڈور سنبھالے گا۔[۱۷]

تیسرا بیان یہ ہے کہ حُلَیل نے اپنی بیٹی حبی کو بیت اللہ کی تولیت سونپی تھی اور ابو غبشان خزاعی کو اس کا وکیل بنایا تھا۔ چنانچہ حبی کے نائب کی حیثیت سے وہی خانہ کعبہ کا کلید بردار تھا جب حُلَیل کا انتقال ہو گیا تو قُصَی نے ابو غبشان سے ایک مشک شراب کے بدلے کعبہ کی تولیت خرید لی لیکن خزاعہ نے یہ خرید و فروخت منظور نہ کی اور قُصَی کو بیت اللہ سے روکنا چاہا۔ اس پر قُصَی نے بنو خزاعہ کو مکہ سے نکالنے کے لیے قریش اور بنو کنانہ کو جمع کیا اور وہ قُصَی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جمع ہو گئے۔[۱۸]

بہر حال وجہ جو بھی ہو، واقعات کا سلسلہ اس طرح ہے کہ جب حُلَیل کا انتقال ہو گیا اور صوفہ نے وہی کرنا چاہا جو وہ ہمیشہ کرتے آئے تھے تو قُصَی نے قریش اور کنانہ کے لوگوں کو ہمراہ لیا اور عقبہ کے نزدیک جہاں وہ جمع تھے ان سے آکر کہا کہ تم سے زیادہ ہم اس اعزاز کے حقدار ہیں۔ اس پر صوفہ نے لڑائی چھیڑ دی مگر قُصَی نے انہیں مغلوب کر کے ان کا اعزاز چھین لیا۔ یہی موقع تھا جب خزاعہ اور بنو بکر نے قُصَی سے دامن کشی اختیار کر لی۔ اس پر قُصَی نے انہیں بھی للکارا، پھر کیا تھا، فریقین میں سخت جنگ چھڑ گئی اور طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد صلح کی آوازیں بلند ہوئیں اور بنو بکر کے ایک شخص یَعْمَر بن عوف کو حَکَم بنایا گیا۔ یَعْمَر نے فیصلہ کیا کہ خزاعہ کے بجائے قُصَی خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کے اقتدار کا زیادہ حقدار ہے۔ نیز قُصَی نے جتنا خون بہایا ہے سب رائیگاں قرار دے کر پاؤں تلے روندرہا ہوں۔ البتہ خزاعہ اور بنو بکر نے جن لوگوں کو قتل کیا ہے ان کی دِیَت ادا کریں اور خانہ کعبہ کو بلا روک ٹوک قُصَی کے حوالہ کر دیں ــــ اسی فیصلے کی وجہ سے یَعْمَر کا لقب شَدّاخ پڑ گیا۔[۱۹] شَدّاخ کے معنی ہیں پاؤں تلے روندنے والا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں قُصَی اور قریش کو مکہ پر مکمل نفوذ اور سیادت حاصل ہو گئی، اور قصی بیت اللہ

---

۱۶ ایضاً ایضاً ۱۷ ایضاً ۱/۱۱۸ ۱۸ رحمۃ للعالمین ۲/۵۵

۱۹ ابن ہشام ۱/۱۲۳، ۱۲۴

کا دینی سربراہ بن گیا جس کی زیارت کے لیے عرب کے گوشے گوشے سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مکہ پر قُصَی کے تسلّط کا یہ واقعہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط یعنی ۴۴۰ء کا ہے[۲۰]

قُصَی نے مکہ کا بندوبست اس طرح کیا کہ قریش کو اطرافِ مکہ سے بلا کر پورا شہر ان پر تقسیم کر دیا اور ہر خاندان کی بود و باش کا ٹھکانا مقرر کر دیا۔ البتہ مہینے آگے پیچھے کرنے والوں کو، نیز آلِ صفوان، بنو عدوان اور بنو مرہ بن عوف کو ان کے مناصب پر برقرار رکھا۔ کیونکہ قُصَی سمجھتا تھا کہ یہ بھی دین ہے جس میں ردّ و بدل کرنا درست نہیں[۲۱]

قُصَی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے حرم کعبہ کے شمال میں دار الندوہ تعمیر کیا۔ (اس کا دروازہ مسجد کی طرف تھا) دار الندوہ درحقیقت قریش کی پارلیمنٹ تھی جہاں تمام بڑے بڑے اور اہم معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ قریش پر دار الندوہ کے بڑے احسانات ہیں کیونکہ یہ ان کی وحدت کا ضامن تھا اور یہیں ان کے الجھے ہوئے مسائل بحسن و خوبی طے ہوتے تھے[۲۲]

قُصَی کو سربراہی اور عظمت کے حسبِ ذیل مظاہر حاصل تھے:

۱۔ دار الندوہ کی صدارت، جہاں بڑے بڑے معاملات کے متعلق مشورے ہوتے تھے اور جہاں لوگ اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھی کرتے تھے۔

۲۔ لِوَاء یعنی جنگ کا پرچم قُصَی ہی کے ہاتھوں باندھا جاتا تھا۔

۳۔ حجابت ـــــ یعنی خانہ کعبہ کی پاسبانی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا دروازہ قصی ہی کھولتا تھا اور وہی خانہ کعبہ کی خدمت اور کلید برداری کا کام انجام دیتا تھا۔

۴۔ سقایہ (پانی پلانا) ـــــ اس کی صورت یہ تھی کہ کچھ حوض میں حاجیوں کے لیے پانی بھر دیا جاتا تھا اور اس میں کچھ کھجور اور کشمش ڈال کر اسے شیریں بنا دیا جاتا تھا۔ جب حُجّاج مکہ آتے تھے تو اسے پیتے تھے[۲۳]

۵۔ رِفادہ (حاجیوں کی میزبانی) ـــــ اس کے معنی یہ ہیں کہ حاجیوں کے لیے بطور ضیافت کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے قُصَی نے قریش پر ایک خاص رقم مقرر کر رکھی تھی، جو موسم حج میں قُصَی کے پاس جمع کی جاتی تھی۔ قُصَی اس رقم سے حاجیوں کے لیے کھانا تیار کراتا تھا جو لوگ

---

[۲۰] قلب جزیرۃ العرب ص ۲۳۲ [۲۱] ابن ہشام ۱/۱۲۴، ۱۲۵

[۲۲] ایضاً ۱/۱۲۵، محاضرات خضری ۱/۳۶، اخبار الکرام ص ۱۵۲ [۲۳] محاضرات خضری ۱/۳۶

تنگ دست ہوتے، یا جن کے پاس توشہ نہ ہوتا وہ یہی کھانا کھاتے تھے۔[۲۴]

یہ سارے مناصب قُصَی کو حاصل تھے۔ قُصَی کا پہلا بیٹا عبدالدار تھا، مگر اس کے بجائے دوسرا بیٹا عبدمناف، قُصَی کی زندگی ہی میں شرف وسیادت کے مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اس لیے قُصَی نے عبدالدار سے کہا کہ یہ لوگ اگرچہ شرف وسیادت میں تم پر بازی لے جا چکے ہیں۔ مگر میں تمہیں ان کے ہم پلہ کر کے رہوں گا۔ چنانچہ قُصَی نے اپنے سارے مناصب اور اعزازات کی وصیت عبدالدار کے لیے کر دی، یعنی دارالندوہ کی ریاست، خانہ کعبہ کی حجابت، لواء، سقایت اور رفادہ سب کچھ عبدالدار کو دے دیا۔ چونکہ کسی کام میں قُصَی کی مخالفت نہیں کی جاتی تھی اور نہ اس کی کوئی بات مسترد کی جاتی تھی، بلکہ اس کا ہر اقدام، اس کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی واجب الاتباع دین سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں نے کسی نزاع کے بغیر اس کی وصیت قائم رکھی۔ لیکن جب عبدِمناف کی وفات ہوگئی تو اس کے بیٹوں کا ان مناصب کے سلسلے میں اپنے چچیرے بھائیوں یعنی عبدالدار کی اولاد سے جھگڑا ہوا۔ اس کے نتیجے میں قریش دو گروہ میں بٹ گئے اور قریب تھا کہ دونوں میں جنگ ہو جاتی مگر پھر انہوں نے صلح کی آواز بلند کی اور ان مناصب کو باہم تقسیم کر لیا۔ چنانچہ سقایت اور رفادہ کے مناصب بنو عبدمناف کو دیئے گئے اور دارالندوہ کی سربراہی لواء اور حجابت بنو عبدالدار کے ہاتھ میں رہی۔ پھر بنو عبدِمناف نے اپنے حاصل شدہ مناصب کے لیے قرعہ ڈالا تو قرعہ ہاشم بن عبدمناف کے نام نکلا۔ لہٰذا ہاشم ہی نے اپنی زندگی بھر سقایہ ورفادہ کا انتظام کیا۔ البتہ جب ہاشم کا انتقال ہوگیا تو انکے بھائی مُطَّلِب نے ان کی جانشینی کی، مگر مُطَّلِب کے بعد ان کے بھتیجے عبدالمطلب بن ہاشم نے ـــــ جو رسول اللہ ﷺ کے دادا تھے ـــــ یہ منصب سنبھال لیا اور ان کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین ہوئی یہاں تک کہ جب اسلام کا دَور آیا تو حضرت عَبّاس بن عبدالمطلب اس منصب پر فائز تھے۔[۲۵]

ان کے علاوہ کچھ اور مناصب بھی تھے جنہیں قریش نے باہم تقسیم کر رکھا تھا۔ ان مناصب اور انتظامات کے ذریعے قریش نے ایک چھوٹی سی حکومت ـــــ بلکہ حکومت نما انتظامیہ ـــــ قائم کر رکھی تھی جس کے سرکاری ادارے اور تشکیلات کچھ اسی ڈھنگ کی تھیں جیسی آج کل پارلیمانی مجلسیں اور ادارے ہوا کرتے ہیں۔ ان مناصب کا خاکہ حسب ذیل ہے:

---

[۲۴] ابن ہشام ۱/۱۳۰ [۲۵] ایضاً ۱/۱۲۹-۱۳۲، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۷۸، ۱۷۹

۱۔ ایسار ـــــ یعنی فال گیری اور قسمت دریافت کرنے کے لیے بتوں کے پاس جو تیر رکھے رہتے تھے ان کی تولیت۔ یہ منصب بنو جمح کو حاصل تھا۔

۲۔ مالیات کا نظم ـــــ یعنی بتوں کے تقرب کے لیے جو نذرانے اور قربانیاں پیش کی جاتی تھیں ان کا انتظام کرنا، نیز جھگڑے اور مقدمات کا فیصلہ کرنا۔ یہ کام بنو سہم کو سونپا گیا تھا۔

۳۔ شوریٰ ـــــ یہ اعزاز بنو اسد کو حاصل تھا۔

۴۔ اشناق ـــــ یعنی دیت اور جرمانوں کا نظم۔ اس منصب پر بنو تیم فائز تھے۔

۵۔ عقاب ـــــ یعنی قومی پرچم کی علمبرداری۔ یہ بنو اُمیّہ کا کام تھا۔

۶۔ قبہ ـــــ یعنی فوجی کیمپ کا انتظام اور شہسواروں کی قیادت۔ یہ بنو مخزوم کے حصے میں آیا تھا۔

۷۔ سفارت ـــ بنو عدی کا منصب تھا۔[۲۶]

بقیہ عرب سرداریاں ہم پچھلے صفحات میں قحطانی اور عدنانی قبائل کے ترکِ وطن کا ذکر کر چکے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ پورا ملک عرب ان قبائل کے درمیان تقسیم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی امارتوں اور سرداریوں کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ جو قبائل حیرہ کے اردگرد آباد تھے انہیں حکومتِ حیرہ کے تابع مانا گیا۔ اور جن قبائل نے بادیۃ الشام میں سکونت اختیار کی تھی انہیں غسانی حکمرانوں کے تابع قرار دیا گیا مگر یہ ماتحتی صرف نام کی تھی، عملاً نہ تھی۔ ان دو مقامات کو چھوڑ کر اندرون عرب آباد قبائل بہر طور آزاد تھے۔

ان قبائل میں سرداری نظام رائج تھا۔ قبیلے خود اپنا سردار مقرر کرتے تھے۔ اور ان سرداروں کے لیے ان کا قبیلہ ایک مختصر سی حکومت ہوا کرتا تھا۔ سیاسی وجود و تحفظ کی بنیاد، قبائلی وحدت پر مبنی عصبیت اور اپنی سرزمین کی حفاظت و دفاع کے مشترکہ مفادات تھے۔

قبائلی سرداروں کا درجہ اپنی قوم میں بادشاہوں جیسا تھا۔ قبیلہ صلح و جنگ میں بہر حال اپنے سردار کے فیصلے کے تابع ہوتا تھا اور کسی حال میں اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا تھا۔ سردار کو وہی مطلق العنانی اور استبداد حاصل تھا جو کسی ڈکٹیٹر کو حاصل ہوا کرتا ہے حتیٰ کہ بعض سرداروں کا یہ حال تھا کہ اگر وہ بگڑ جاتے تو ہزاروں تلواریں یہ پوچھے بغیر بے نیام ہو جاتیں کہ سردار کے غصے کا سبب کیا ہے۔

---

[۲۶] تاریخ ارض القرآن ۲/۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶

تاہم چونکہ ایک ہی کنبے کے چچیرے بھائیوں میں سرداری کے لیے کشاکش بھی ہوا کرتی تھی اس لیے اس کا تقاضا تھا کہ سردار اپنے قبائلی عوام کے ساتھ رواداری برتے۔ خوب مال خرچ کرے مہمان نوازی میں پیش پیش رہے، کرم و بردباری سے کام لے، شجاعت کا عملی مظاہرہ کرے اور غیر تمندانہ اُمور کی طرف سے دفاع کرے تاکہ لوگوں کی نظر میں عموماً، اور شعراء کی نظر میں خصوصاً خوبی و کمالات کا جامع بن جائے (کیونکہ شعراء اس دور میں قبیلے کی زبان ہوا کرتے تھے) اور اس طرح سردار اپنے مدِمقابل حضرات سے بلند و بالا درجہ حاصل کر لے۔

سرداروں کے کچھ مخصوص اور امتیازی حقوق بھی ہوا کرتے تھے جنہیں ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

لك المرباع فينا والصفايا وحكمك والنشيطة والفضول

"ہمارے درمیان تمہارے لیے مالِ غنیمت کا چوتھائی ہے اور منتخب مال ہے اور وہ مال ہے جس کا تم فیصلہ کر دو اور جو سرِراہ ہاتھ آجائے۔ اور جو تقسیم سے بچ رہے"

مِرباع: مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ۔

صَفِیّ: وہ مال جسے تقسیم سے پہلے ہی سردار اپنے لیے منتخب کر لے۔

نشیطہ: وہ مال جو اصل قوم تک پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں سردار کے ہاتھ لگ جائے۔

فضول: وہ مال جو تقسیم کے بعد بچ رہے اور غازیوں کی تعداد پر برابر تقسیم نہ ہو۔ مثلاً تقسیم سے بچے ہوئے اونٹ گھوڑے وغیرہ ان سب اقسام کے مال سردارِ قبیلہ کا حق ہوا کرتے تھے۔

سیاسی حالت | جزیرۃ العرب کی حکومتوں اور حکمرانوں کا ذکر ہو چکا بیجا نہ ہوگا کہ اب ان کے کسی قدر سیاسی حالات بھی ذکر کر دیئے جائیں۔

جزیرۃ العرب کے وہ تینوں سرحدی علاقے جو غیر ممالک کے پڑوس میں پڑتے تھے ان کی سیاسی حالت سخت اضطراب و انتشار اور انتہائی زوال و انحطاط کا شکار تھی۔ انسان، مالک اور غلام یا حاکم اور محکوم کے دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ سارے فوائد سربراہوں ـــــ اور خصوصاً غیر ملکی سربراہوں ـــــ کو حاصل تھے اور سارا بوجھ غلاموں کے سر تھا۔ اسے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ رعایا درحقیقت ایک کھیتی تھی جو حکومت کے لیے محاصل اور آمدنی فراہم کرتی تھی اور حکومتیں اسے لذتوں، شہوتوں، عیش رانی اور ظلم و جور کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ اور ان پر ہر طرف سے ظلم کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر نہ لا سکتے تھے۔

بلکہ ضروری تھا کہ طرح طرح کی ذلت و رُسوائی اور ظلم و چیرہ دستی برداشت کریں اور زبان بند رکھیں، کیونکہ جبر و استبداد کی حکمرانی تھی اور انسانی حقوق نام کی کسی چیز کا کہیں کوئی وجود نہ تھا۔

ان علاقوں کے پڑوس میں رہنے والے قبائل تذبذب کا شکار تھے۔ انہیں اغراض و خواہشات اِدھر سے اُدھر، اور اُدھر سے اِدھر پھینکتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ عراقیوں کے ہمنوا ہو جاتے تھے اور کبھی شامیوں کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

جو قبائل اندرونِ عرب آباد تھے ان کے بھی جوڑ ڈھیلے اور شیرازہ منتشر تھا۔ ہر طرف قبائلی جھگڑوں، نسلی فسادات اور مذہبی اختلافات کی گرم بازاری تھی، جس میں ہر قبیلے کے افراد بہر صورت اپنے اپنے قبیلے کا ساتھ دیتے تھے خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ چنانچہ ان کا ترجمان کہتا ہے ؎

وَمَا أَنَا إِلَّا مِنْ غَزِيَّةَ إِنْ غَوَتْ غَوَيْتُ، وَإِنْ تَرْشُدْ غَزِيَّةُ أَرْشُدِ

"میں بھی تو قبیلہ غزیہ ہی کا ایک فرد ہوں۔ اگر وہ غلط راہ پر چلے گا تو میں بھی غلط راہ پر چلوں گا اور اگر وہ صحیح راہ پر چلے گا تو میں بھی صحیح راہ پر چلوں گا۔"

اندرونِ عرب کوئی بادشاہ نہ تھا جو ان کی آواز کو قوت پہنچاتا اور نہ کوئی مرجع ہی تھا جس کی طرف مشکلات و شدائد میں رجوع کیا جاتا اور جس پر وقت پڑنے پر اعتماد کیا جاتا۔

ہاں حجاز کی حکومت کو قدر و احترام کی نگاہ سے یقیناً دیکھا جاتا تھا اور اسے مرکز دین کا قائد و پاسبان بھی تصور کیا جاتا تھا۔ یہ حکومت درحقیقت ایک طرح کی دنیوی قیادت اور دینی پیشوائی کا معجون مرکّب تھی۔ اسے اہل عرب پر دینی پیشوائی کے نام سے بالادستی حاصل تھی اور حرم اور اطرافِ حرم پر اس کی باقاعدہ حکمرانی تھی۔ وہی زائرین بیت اللہ کی ضروریات کا انتظام اور شریعت ابراہیمی کے احکام کا نفاذ کرتی تھی اور اس کے پاس پارلیمانی اداروں جیسے ادارے اور تشکیلات بھی تھیں۔ لیکن یہ حکومت اتنی کمزور تھی کہ اندرونِ عرب کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہ رکھتی تھی جیسا کہ حبشیوں کے حملے کے موقع پر ظاہر ہُوا۔

○

عرب ـــ اَدیان و مذاہب

عام باشندگانِ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، اس لیے صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے اور توحید پر کاربند تھے، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے خدائی درس و نصیحت کا ایک حصہ بھلا دیا۔ پھر بھی ان کے اندر توحید اور کچھ دینِ ابراہیمی کے شعائر باقی رہے، تاآنکہ بنو خزاعہ کا سردار عمرو بن لحی منظرِ عام پر آیا۔ اس کی نشو و نما بڑی نیکوکاری، صدقہ و خیرات اور دینی امور سے گہری دلچسپی پر ہوئی تھی، اس لیے لوگوں نے اسے محبت کی نظر سے دیکھا اور اسے اکابر علماء اور افاضل اولیاء میں سے سمجھ کر اس کی پیروی کی۔ پھر اس شخص نے ملک شام کا سفر کیا۔ دیکھا تو وہاں بتوں کی پوجا کی جا رہی تھی۔ اس نے سمجھا کہ یہ بھی بہتر اور برحق ہے کیونکہ ملک شام پیغمبروں کی سرزمین اور آسمانی کتابوں کی نزول گاہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ ہُبَل بُت بھی لے آیا۔ اور اسے خانہ کعبہ کے اندر نصب کر دیا اور اہل مکہ کو اللہ کے ساتھ شرک کی دعوت دی۔ اہل مکہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس کے بعد بہت جلد باشندگانِ حجاز بھی اہل مکہ کے نقشِ قدم پر چل پڑے، کیونکہ وہ بیت اللہ کے والی اور حرم کے باشندے تھے[1]۔ اس طرح عرب میں بُت پرستی کا آغاز ہوا۔

ہُبَل کے علاوہ عرب کے قدیم ترین بتوں میں سے مَنَاۃ ہے۔ یہ بحرِ احمر کے ساحل پر قُدَید کے قریب مُشَلَّل میں نصب[2] تھا۔ اس کے بعد طائف میں لات نامی بُت وجود میں آیا۔ پھر وادیٔ نخلہ میں عُزّیٰ کی تنصیب عمل میں آئی۔ یہ تینوں عرب کے سب سے بڑے بُت تھے۔ اس کے بعد حجاز کے ہر خطے میں شرک کی کثرت اور بتوں کی بھرمار ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک جن عمرو بن لحی کے تابع تھا۔ اس نے بتایا کہ قومِ نوح کے بُت ـــ یعنی وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر ـــ جدہ میں مدفون ہیں۔ اس اطلاع پر عمرو بن لحی جدہ گیا اور ان بتوں کو کھود نکالا۔ پھر انہیں تہامہ لایا اور جب حج کا زمانہ آیا تو انہیں مختلف قبائل کے حوالے کیا۔ یہ قبائل ان بتوں کو اپنے اپنے علاقوں میں

---

[1] مختصر سیرۃ الرسول، تالیف شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، ص ۱۲ [2] صحیح بخاری ۱/۲۲۲

لے گئے۔ اس طرح ہر ہر قبیلے میں، پھر ہر ہر گھر میں ایک ایک بُت ہو گیا۔

پھر مشرکین نے مسجدِ حرام کو بھی بتوں سے بھر دیا چنانچہ جب مکہ فتح کیا گیا تو بیت اللہ کے گرداگرد تین سو ساٹھ بُت تھے جنہیں خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے توڑا۔ آپ ہر ایک کو چھڑی سے ٹھوکر مارتے جاتے تھے اور وہ گرتا جاتا تھا۔ پھر آپؐ نے حکم دیا اور ان سارے بتوں کو مسجد حرام سے باہر نکال کر جلا دیا گیا[۲]

غرض شرک اور بُت پرستی اہلِ جاہلیت کے دین کا سب سے بڑا مظہر بن گئی تھی جنہیں گھمنڈ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔

پھر اہلِ جاہلیت کے یہاں بت پرستی کے کچھ خاص طریقے اور مراسم بھی رائج تھے جو زیادہ تر عمرو بن لُحَیّ کی اختراع تھے۔ اہل جاہلیت سمجھتے تھے کہ عمرو بن لُحَیّ کی اختراعات دینِ ابراہیمیؑ میں تبدیلی نہیں بلکہ بدعتِ حسنہ ہیں۔ ذیل میں ہم اہلِ جاہلیت کے اندر رائج بُت پرستی کے چند اہم مراسم کا ذکر کر رہے ہیں:

۱۔ دورِ جاہلیت کے مشرکین بتوں کے پاس مجاور بن کر بیٹھتے تھے، ان کی پناہ ڈھونڈتے تھے، انہیں زور زور سے پکارتے تھے اور حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے ان سے فریاد اور التجائیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے ہماری مراد پوری کرا دیں گے۔

۲۔ بتوں کا حج و طواف کرتے تھے، ان کے سامنے عجز و نیاز سے پیش آتے تھے اور انہیں سجدہ کرتے تھے۔

۳۔ بتوں کے لیے نذرانے اور قربانیاں پیش کرتے اور قربانی کے ان جانوروں کو کبھی بتوں کے آستانوں پر لیجا کر ذبح کرتے تھے اور کبھی کسی بھی جگہ ذبح کر لیتے تھے مگر بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ ذبح کی ان دونوں صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کیا ہے۔ ارشاد ہے: وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۵:۳) یعنی "وہ جانور بھی حرام ہیں جو آستانوں پر ذبح کیے گئے ہوں"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (۶:۱۲۱) یعنی "اُس جانور کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو"۔

۴۔ بُتوں سے تقرب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مشرکین اپنی صوابدید کے مطابق اپنے کھانے پینے

---

[۲] مختصر سیرۃ الرسول از شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ص ۱۳، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۴

کی چیزوں اور اپنی کھیتی اور چوپائے کی پیداوار کا ایک حصہ بتوں کے لیے خاص کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا دلچسپ رواج یہ تھا کہ وہ اللہ کے لیے بھی اپنی کھیتی اور جانوروں کی پیداوار کا ایک حصہ خاص کرتے تھے پھر مختلف اسباب کی بنا پر اللہ کا حصہ تو بتوں کی طرف منتقل کر سکتے تھے لیکن بتوں کا حصہ کسی بھی حال میں اللہ کی طرف منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ (۶:۱۳۶)

"اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کئے ہیں اس کا ایک حصہ انہوں نے اللہ کے لیے مقرر کیا اور کہا یہ اللہ کے لیے ہے ـــــ ان کے خیال میں ـــــ اور یہ ہمارے شرکاء کے لیے ہے۔ تو جو ان کے شرکاء کے لیے ہوتا ہے وہ تو اللہ تک نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء تک پہنچ جاتا ہے۔ کتنا بُرا ہے وہ فیصلہ جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

۵۔ بتوں کے تقرب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مشرکین کھیتی اور چوپائے کے اندر مختلف قسم کی نذریں مانتے تھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ (۶:۱۳۸)

"ان مشرکین نے کہا کہ یہ چوپائے اور کھیتیاں ممنوع ہیں۔ انہیں وہی کھا سکتا ہے جسے ہم چاہیں ـــــ ان کے خیال میں ـــــ اور یہ وہ چوپائے ہیں جن کی پیٹھ حرام کی گئی ہے (نہ ان پر سواری کی جا سکتی ہے نہ سامان لادا جا سکتا ہے) اور کچھ چوپائے ایسے ہیں جن پر یہ لوگ اللہ پر افترا کرتے ہوئے ـــــ اللہ کا نام نہیں لیتے۔"

۶۔ ان ہی جانوروں میں بَحِیرَہ، سائبہ، وَصِیلَہ اور حامی تھے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بَحِیرَہ سائبہ کی بچی کو کہا جاتا ہے۔ اور سائبہ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس سے دس بار پے در پے مادہ بچے پیدا ہوں، درمیان میں کوئی نر نہ پیدا ہو۔ ایسی اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اس پر سواری نہیں کی جاتی تھی، اس کے بال نہیں کاٹے جاتے تھے۔ اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ نہیں پیتا تھا۔ اس کے بعد یہ اونٹنی جو مادہ بچہ جنتی اس کا کان چیر دیا جاتا اور اسے بھی اس کی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اس پر سواری نہ کی جاتی۔ اس کا بال نہ کاٹا جاتا۔ اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ

نہ بیتا۔ یہی بحیرہ ہے اور اس کی ماں سائبہ ہے۔

وصیلہ اُس بکری کو کہا جاتا تھا جو پانچ دفعہ پے درپے دو دو مادہ بچے جنتی (یعنی پانچ بار میں دس مادہ بچے پیدا ہوتے) درمیان میں کوئی نر نہ پیدا ہوتا۔ اس بکری کو اس لیے وصیلہ کہا جاتا تھا کہ وہ سارے مادہ بچوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتی تھی۔ اس کے بعد اس بکری سے جو بچے پیدا ہوتے انہیں صرف مرد کھا سکتے تھے عورتیں نہیں کھا سکتی تھیں۔ البتہ اگر کوئی بچہ مُردہ پیدا ہوتا تو اس کو مرد عورت سبھی کھا سکتے تھے۔

حامی اُس نر اونٹ کو کہتے تھے جس کی جُفتی سے پے درپے دس مادہ بچے پیدا ہوتے، درمیان میں کوئی نر نہ پیدا ہوتا۔ ایسے اونٹ کی پیٹھ محفوظ کر دی جاتی تھی۔ نہ اس پر سواری کی جاتی تھی، نہ اس کا بال کاٹا جاتا تھا۔ بلکہ اسے اونٹوں کے ریوڑ میں جُفتی کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور اس کے سوا اس سے کوئی دوسرا فائدہ نہ اٹھایا جاتا تھا۔ دورِ جاہلیت کی بُت پرستی کے ان طریقوں کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ (۵:۱۰۳)

"اللہ نے نہ کوئی بحیرہ، نہ کوئی سائبہ نہ کوئی وصیلہ اور نہ کوئی حامی بنایا ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓي اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَاۗءُ ط (۶:۱۳۹)

"ان (مشرکین) نے کہا کہ ان چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ البتہ اگر وہ مردہ ہو تو اس میں مرد عورت سب شریک ہیں۔"

چوپایوں کی مذکورہ اقسام یعنی بحیرہ، سائبہ وغیرہ کے کچھ دوسرے مطالب بھی بیان کئے گئے ہیں[1] جو ابن اسحاق کی مذکورہ تفسیر سے قدرے مختلف ہیں۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ۱/۹۰۰۸۹

حضرت سعید بن مُسَیَّب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ یہ جانور ان کے طاغوتوں کے لیے تھے۔[5]
اور صحیح بخاری میں مرفوعاً مروی ہے کہ عَمرو بن لُحَیّ پہلا شخص ہے جس نے بتوں کے نام پر جانور چھوڑے۔[6]

عرب اپنے بتوں کے ساتھ یہ سب کچھ اس عقیدے کے ساتھ کرتے تھے کہ یہ بُت انہیں اللہ کے قریب کر دیں گے اور اللہ کے حضور ان کی سفارش کر دیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین کہتے تھے:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط (۳۹:۳)

"ہم ان کی عبادت محض اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔"

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط (۱۰:۱۸)

"یہ مشرکین اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نفع پہنچا سکیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔"

مشرکینِ عرب اَزلام یعنی فال کے تیر بھی استعمال کرتے تھے۔ (اَزلام، زَلَم کی جمع ہے۔ اور زَلَم اُس تیر کو کہتے ہیں جس میں پَر نہ لگے ہوں) فال گیری کے لیے استعمال ہونے والے یہ تیر تین قسم کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جن پر صرف "ہاں" یا "نہیں" لکھا ہوتا تھا۔ اس قسم کے تیر سفر اور نکاح وغیرہ جیسے کاموں کے لیے استعمال کئے جاتے تھے۔ اگر فال میں "ہاں" نکلتا تو مطلوبہ کام کر ڈالا جاتا اگر "نہیں" نکلتا تو سال بھر کے لیے ملتوی کر دیا جاتا اور آئندہ پھر فال نکالی جاتی۔

فال گیری کے تیروں کی دُوسری قسم وہ تھی جن پر پانی اور دِیَت وغیرہ درج ہوتے تھے اور تیسری قسم وہ تھی جس پر یہ درج ہوتا تھا کہ "تم میں سے ہے" یا "تمہارے علاوہ سے ہے" یا "ملحق" ہے۔ ان تیروں کا مصرف یہ تھا کہ جب کسی کے نسب میں شبہہ ہوتا تو اسے ایک سو اُونٹوں سمیت ہُبَل کے پاس لے جاتے۔ اونٹوں کو تیر والے مہنت کے حوالے کرتے اور وہ تمام تیروں کو ایک ساتھ ملا کر گھماتا جھنجھوڑتا، پھر ایک تیر نکالتا۔ اب اگر یہ نکلتا کہ "تم میں سے ہے" تو وہ ان کے قبیلے کا ایک معزز فرد قرار پاتا اور اگر یہ برآمد ہوتا کہ "تمہارے غیر سے ہے" تو حلیف

---

[5] صحیح بخاری ۱/۴۹۹ [6] ایضاً ایضاً

قرار پاتا اور اگر یہ نکلتا کہ "ملحق" ہے تو ان کے اندر اپنی حیثیت پر برقرار رہتا، نہ قبیلے کا فرد مانا جاتا نہ حلیف۔[۷]

اسی سے ملتا جلتا ایک رواج مشرکین میں جُوا کھیلنے اور جوئے کے تیر استعمال کرنے کا تھا۔ اسی تیر کی نشاندہی پر وہ جُوئے کا اُونٹ ذبح کرکے اس کا گوشت بانٹتے تھے۔[۸]

مشرکینِ عرب کاہنوں، عرّافوں اور نجومیوں کی خبروں پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ کاہن اسے کہتے ہیں جو آنے والے واقعات کی پیش گوئی کرے اور رازہائے سربستہ سے واقفیت کا دعویدار ہو۔ بعض کاہنوں کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ایک جن ان کے تابع ہے جو انہیں خبریں پہنچاتا رہتا ہے، اور بعض کاہن کہتے تھے کہ انہیں ایسا فہم عطا کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ غیب کا پتا لگا لیتے ہیں۔ بعض اس بات کے مدعی تھے کہ جو آدمی ان سے کوئی بات پوچھنے آتا ہے اسکے قول و فعل سے یا اس کی حالت سے، کچھ مقدمات اور اسباب کے ذریعے وہ جائے واردات کا پتا لگا لیتے ہیں۔ اس قسم کے آدمی کو عرّاف کہا جاتا تھا۔ مثلاً وہ شخص جو چوری کے مال، چوری کی جگہ اور گم شدہ جانور وغیرہ کا پتا ٹھکانا بتاتا۔

نجومی اسے کہتے ہیں جو تاروں پر غور کرکے اور ان کی رفتار و اوقات کا حساب لگا کر پتا لگاتا ہے کہ دنیا میں آئندہ کیا حالات و واقعات پیش آئیں گے۔[۹] ان نجومیوں کی خبروں کو ماننا درحقیقت تاروں پر ایمان لانا ہے اور تاروں پر ایمان لانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مشرکینِ عرب نچھتروں پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم پر فلاں اور فلاں نچھتر سے بارش ہوئی ہے۔[۱۰]

مشرکین میں بدشگونی کا بھی رواج تھا۔ اسے عربی میں طِیَرَۃ کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مشرکین کسی چڑیا یا ہرن کے پاس جا کر اسے بھگاتے تھے۔ پھر اگر وہ داہنے جانب بھاگتا تو اسے اچھائی اور کامیابی کی علامت سمجھ کر اپنا کام کر گذرتے اور اگر بائیں جانب بھاگتا تو اسے نحوست کی علامت سمجھ کر اپنے کام سے باز رہتے۔ اسی طرح اگر کوئی چڑیا یا جانور راستہ کاٹ دیتا تو اسے بھی منحوس سمجھتے۔

---

۷ محاضرات خضری ۱/۵۶، ابن ہشام ۱/۱۰۲، ۱۰۳

۸ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جوا کھیلنے والے ایک اونٹ ذبح کرکے اسے دس یا اٹھائیس حصوں پر تقسیم کرتے۔ پھر تیروں سے قرعہ اندازی کرتے۔ کسی تیر پر جیت کا نشان بنا ہوتا اور کوئی تیر بے نشان ہوتا۔ جس کے نام پر جیت کے نشان والا تیر نکلتا وہ تو کامیاب مانا جاتا اور اپنا حصہ لیتا اور جس کے نام پر بے نشان تیر نکلتا اسے قیمت دینی پڑتی۔

۹ مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۲/۳۰۲ طبع لکھنؤ۔

۱۰ ملاحظہ ہو صحیح مسلم مع شرح نووی: کتاب الایمان، باب بیان کفر من قال مطرنا بالنوء ۱/۹۵

اسی سے ملتی جلتی ایک حرکت یہ بھی تھی کہ مشرکین، خرگوش کے ٹخنے کی ہڈی لٹکاتے تھے اور بعض دنوں، مہینوں، جانوروں، گھروں اور عورتوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ بیماریوں کی چھوت کے قائل تھے اور رُوح کے اُلّو بن جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یعنی ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے، اس کو سکون نہیں ملتا اور اس کی رُوح اُلّو بن کر بیابانوں میں گردش کرتی رہتی ہے اور "پیاس، پیاس" یا "مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ" کی صدا لگاتی رہتی ہے۔ جب اس کا بدلہ لے لیا جاتا ہے تو اسے راحت اور سکون مل جاتا ہے۔[۱۱]

دینِ ابراہیمی میں قریش کی بدعات

یہ تھے اہلِ جاہلیت کے عقائد و اعمال، اس کے ساتھ ہی ان کے اندر دینِ ابراہیمی کے کچھ باقیات بھی تھے۔ یعنی انہوں نے یہ دین پورے طور پر نہیں چھوڑا تھا۔ چنانچہ وہ بیت اللہ کی تعظیم اور اس کا طواف کرتے تھے۔ حج و عمرہ کرتے تھے، عرفات و مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور ہَدی کے جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔ البتہ انہوں نے اس دینِ ابراہیمی میں بہت سی بدعتیں ایجاد کر کے شامل کر دی تھیں۔ مثلاً:-

○ قریش کی ایک بدعت یہ تھی کہ وہ کہتے تھے ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، حرم کے پاسبان، بیت اللہ کے والی اور مکہ کے باشندے ہیں، کوئی شخص ہمارا ہم مرتبہ نہیں اور نہ کسی کے حقوق ہمارے حقوق کے مساوی ہیں ـــــ اور اسی بنا پر یہ اپنا نام حُمْس (بہادر اور گرم جوش) رکھتے تھے ـــــ لہٰذا ہمارے شایانِ شان نہیں کہ ہم حدودِ حرم سے باہر جائیں چنانچہ حج کے دوران یہ لوگ عرفات نہیں جاتے تھے اور نہ وہاں سے اِفاضہ کرتے تھے بلکہ مُزدلفہ ہی میں ٹھہر کر وہیں سے افاضہ کر لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بدعت کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (۲:۱۹۹) یعنی "تم لوگ بھی وہیں سے اِفاضہ کرو جہاں سے سارے لوگ افاضہ کرتے ہیں۔"[۱۲]

○ ان کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ حُمس (قریش) کے لیے احرام کی حالت میں پنیر اور گھی بنانا درست نہیں اور نہ یہ درست ہے کہ بال والے گھر (یعنی کمبل کے خیمے) میں داخل

---

[۱۱] صحیح بخاری ۲/۸۵۱، ۸۵۷ مع شروح۔ [۱۲] ابن ہشام ۱/۱۹۹، صحیح بخاری ۱/۲۲۶

ہوں اور نہ یہ درست ہے کہ سایہ حاصل کرنا ہو تو چمڑے کے خیمے کے سوا کہیں اور سایہ حاصل کریں[۱۳]

○ ان کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بیرونِ حرم کے باشندے حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں اور بیرونِ حرم سے کھانے کی کوئی چیز لے کر آئیں تو اسے ان کے لیے کھانا درست نہیں[۱۴]

○ ایک بدعت یہ بھی تھی کہ انہوں نے بیرونِ حرم کے باشندوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ حرم میں آنے کے بعد پہلا طواف حمس سے حاصل کئے ہوئے کپڑوں ہی میں کریں۔ چنانچہ اگر ان کا کپڑا دستیاب نہ ہوتا تو مرد ننگے طواف کرتے۔ اور عورتیں اپنے سارے کپڑے اتار کر صرف ایک چھوٹا سا کھلا ہوا کرتا پہن لیتیں۔ اور اسی میں طواف کرتیں اور دوران طواف یہ شعر پڑھتی جاتیں:

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ اَوْ كُلُّهٗ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا اُحِلُّهٗ

"آج کچھ یا کل شرمگاہ کھل جائے گی۔ لیکن جو کھل جائے میں اسے (دیکھنا) حلال نہیں قرار دیتی"

اللہ تعالیٰ نے اس خرافات کے خاتمے کے لیے فرمایا: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ .. (۷/۳۱) "اے آدم کے بیٹو! ہر مسجد کے پاس اپنی زینت اختیار کر لیا کرو"

بہر حال اگر کوئی عورت یا مرد برتر اور معزز بن کر، بیرونِ حرم سے لائے ہوئے اپنے ہی کپڑوں میں طواف کر لیتا تو طواف کے بعد ان کپڑوں کو پھینک دیتا، ان سے نہ خود فائدہ اٹھاتا نہ کوئی اور[۱۵]

○ قریش کی ایک بدعت یہ بھی تھی کہ وہ حالتِ احرام میں گھر کے اندر دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ گھر کے پچھواڑے ایک بڑا سا سوراخ بنا لیتے اور اسی سے آتے جاتے تھے اور اپنے اس اُلٹ پنے کو نیکی سمجھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اس سے بھی منع فرمایا۔ (۲ : ۱۸۹)

یہی دین ـــــ یعنی شرک و بُت پرستی اور توہمات و خرافات پر مبنی عقیدہ و عمل والا دین ـــــ عام اہلِ عرب کا دین تھا۔

اس کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف اطراف میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت اور صابئیت نے بھی ڈیرے کے مواقع پا لیے تھے، لہٰذا ان کا تاریخی خاکہ بھی مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔

جزیرۃ العرب میں یہود کے کم از کم دو اَدوار ہیں۔ پہلا دور اس وقت سے تعلق رکھتا ہے

---

[۱۳] ابن ہشام ۱/۲۰۲ [۱۴] ایضاً ایضاً [۱۵] ایضاً ۱/۲۰۲، ۲۰۳ و صحیح بخاری ۱/۲۲۶

جب فلسطین میں بابل اور آشور کی حکومت کی فتوحات کے سبب یہودیوں کو ترکِ وطن کرنا پڑا۔ اس حکومت کی سخت گیری اور بخت نصر کے ہاتھوں یہودی بستیوں کی تباہی و ویرانی، ان کے ہیکل کی بربادی اور ان کی اکثریت کی ملک بابل کو جلا وطنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کی ایک جماعت فلسطین چھوڑ کر حجاز کے شمالی اطراف میں آبسی[۱۶]

دوسرا دور اُس وقت شروع ہوتا ہے جب ٹائیٹس رومی کی زیرِ قیادت ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا۔ اس موقع پر رومیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی دار و گیر اور ان کے ہیکل کی بربادی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ متعدد یہودی قبیلے حجاز بھاگ آئے اور یثرب، خیبر اور تیماء میں آباد ہو کر یہاں اپنی باقاعدہ بستیاں بسالیں اور قلعے اور گڑھیاں تعمیر کرلیں۔ ان تارکینِ وطن یہود کے ذریعے عرب باشندوں میں کسی قدر یہودی مذہب کا بھی رواج ہوا اور اسے بھی ظہورِ اسلام سے پہلے اور اس کے ابتدائی دور کے سیاسی حوادث میں ایک قابلِ ذکر حیثیت حاصل ہوگئی۔ ظہورِ اسلام کے وقت مشہور یہودی قبائل یہ تھے۔ خیبر، نضیر، مصطلق، قریظہ اور قینقاع۔ سمہودی نے وفاء الوفا ص۱۱۶ میں ذکر کیا ہے کہ یہود قبائل کی تعداد بیس سے زیادہ تھی[۱۷]

یہودیت کو یمن میں بھی فروغ حاصل ہُوا۔ یہاں اس کے پھیلنے کا سبب تبان اسعد ابو کرب تھا۔ یہ شخص جنگ کرتا ہوا یثرب پہنچا۔ وہاں یہودیت قبول کرلی اور بنو قریظہ کے دو یہودی علماء کو اپنے ساتھ یمن لے آیا اور ان کے ذریعے یہودیت کو یمن میں وسعت اور پھیلاؤ حاصل ہوا۔ ابو کرب کے بعد اس کا بیٹا یوسف ذونواس یمن کا حاکم ہُوا تو اس نے یہودیت کے جوش میں نجران کے عیسائیوں پر ہلّہ بول دیا اور انہیں مجبور کیا کہ یہودیت قبول کریں، مگر انہوں نے انکار کردیا۔ اس پر ذونواس نے خندق کھدوائی اور اس میں آگ جلوا کر بوڑھے، بچے مرد عورت سب کو بلا تمیز آگ کے الاؤ میں جھونک دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حادثے کا شکار ہونے والوں کی تعداد بیس سے چالیس ہزار کے درمیان تھی۔ یہ اکتوبر ۵۲۳ء کا واقعہ ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۂ بروج میں اسی واقعے کا ذکر کیا ہے[۱۸]

جہاں تک عیسائی مذہب کا تعلق ہے تو بلادِ عرب میں اس کی آمد حبشی اور رومی قبضہ گیروں

---

[۱۶] قلب جزیرۃ العرب ص ۲۵۱ [۱۷] ایضاً ایضاً

[۱۸] ابن ہشام ۱/۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۳۶، نیز ملاحظہ فرمایئے کتب تفسیر، تفسیر سورۂ بروج

اور فاتحین کے ذریعے ہوئی ہم بتا چکے ہیں کہ یمن پر حبشیوں کا قبضہ پہلی بار ۳۴۰ء میں ہوا۔ اور ۳۷۸ء تک برقرار رہا۔ اس دوران یمن میں مسیحی مشن کام کرتا رہا۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک مستجاب الدعوات اور صاحبِ کرامات زاہد جس کا نام فیمیون تھا، نجران پہنچا اور وہاں کے باشندوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی۔ اہلِ نجران نے اس کی اور اس کے دین کی سچائی کی کچھ ایسی علامات دیکھیں کہ وہ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہو گئے۔[19]

پھر ذُونواس کی کارروائی کے ردِ عمل کے طور پر حبشیوں نے دوبارہ یمن پر قبضہ کیا اور اَبرَہَہ نے حکومتِ یمن کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ بڑے پیمانے پر عیسائیت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اسی جوش و خروش کا نتیجہ تھا کہ اس نے یمن میں ایک کعبہ تعمیر کیا اور کوشش کی کہ اہلِ عرب کو مکہ اور بیت اللہ سے روک کر اسی کا حج کرنے اور مکہ کے بیت اللہ شریف کو ڈھا دے۔ لیکن اس کی اس جرأت پر اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی سزا دی کہ اولین و آخرین کے لیے عبرت بن گیا۔

دوسری طرف رومی علاقوں کی ہمسائیگی کے سبب آلِ غسّان، بنو تغلب اور بنو طی وغیرہ قبائل عرب میں بھی عیسائیت پھیل گئی تھی۔ بلکہ حیرہ کے بعض عرب بادشاہوں نے بھی عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔

جہاں تک مجوسی مذہب کا تعلق ہے تو اسے زیادہ تر اہلِ فارس کے ہمسایہ عربوں میں فروغ حاصل ہوا تھا۔ مثلاً عراق عرب، بحرین، (الاحساء) ہجر اور خلیج عربی کے ساحلی علاقے۔ ان کے علاوہ یمن پر فارسی قبضے کے دوران وہاں بھی اکا دکا افراد نے مجوسیت قبول کی۔

باقی رہا صابی مذہب تو عراق وغیرہ کے آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران جو کتبات برآمد ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلدانی قوم کا مذہب تھا۔ دورِ قدیم میں شام و یمن کے بہت سے باشندے بھی اسی مذہب کے پیرو تھے، لیکن جب یہودیت اور پھر عیسائیت کا دور دورہ ہوا تو اس مذہب کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کی شمعِ فروزاں گل ہو کر رہ گئی۔ تاہم مجوس کے ساتھ خلط ملط ہو کر یا ان کے پڑوس میں عراق عرب اور خلیج عربی کے ساحل پر اس مذہب کے کچھ نہ کچھ پیرو کار باقی رہے۔[20]

---

[19] ابن ہشام ۱/۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴ [20] تاریخ ارض القرآن ۲/۱۹۲ — ۲۰۸

دینی حالت

جس وقت اسلام کا نیّرِ تاباں طلوع ہوا ہے یہی مذاہب وادیان تھے جو عرب میں پائے جاتے تھے۔ لیکن یہ سارے ہی مذاہب شکست و ریخت سے دوچار تھے۔ مشرکین جن کا دعویٰ تھا کہ ہم دینِ ابراہیمی پر ہیں شریعتِ ابراہیمی کے اوامر و نواہی سے کوسوں دُور تھے۔ اس شریعت نے جن مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی تھی ان سے ان مشرکین کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان میں گناہوں کی بھرمار تھی اور طولِ زمانہ کے سبب ان میں بھی بُت پرستوں کی وہی عادات و رسوم پیدا ہو چلی تھیں جنہیں دینی خرافات کا درجہ حاصل ہے۔ ان عادات و رسوم نے ان کی اجتماعی سیاسی اور دینی زندگی پر نہایت گہرے اثرات ڈالے تھے۔

یہودی مذہب کا حال یہ تھا کہ وہ محض ریاکاری اور تحکم بن گیا تھا۔ یہودی پیشوا اللہ کے بجائے خود رب بن بیٹھے تھے۔ لوگوں پر اپنی مرضی چلاتے تھے اور ان کے دلوں میں گزرنے والے خیالات اور ہونٹوں کی حرکات تک کا محاسبہ کرتے تھے۔ ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ کسی طرح مال و ریاست حاصل ہو، خواہ دین برباد ہی کیوں نہ ہو اور کفر و الحاد کو فروغ ہی کیوں نہ حاصل ہو اور ان تعلیمات کے ساتھ تساہل ہی کیوں نہ برتا جائے جن کی تقدیس کا اللہ تعالےٰ نے ہر شخص کو حکم دیا ہے اور جن پر عمل درآمد کی ترغیب دی ہے۔

عیسائیت ایک ناقابلِ فہم بُت پرستی بن گئی تھی۔ اس نے اللہ اور انسان کو عجیب طرح سے خلط ملط کر دیا تھا۔ پھر جن عربوں نے اس دین کو اختیار کیا تھا ان پر اس دین کا کوئی حقیقی اثر نہ تھا کیونکہ اس کی تعلیمات ان کے مالوف طرزِ زندگی سے میل نہیں کھاتی تھیں اور وہ اپنا طرزِ زندگی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

باقی ادیانِ عرب کے ماننے والوں کا حال مشرکین ہی جیسا تھا کیونکہ ان کے دل یکساں تھے عقائد ایک سے تھے، اور رسم و رواج میں ہم آہنگی تھی۔

جاہلی معاشرے کی چند جھلکیاں

جزیرۃ العرب کے سیاسی اور مذہبی حالات بیان کر لینے کے بعد اب وہاں کے اجتماعی، اقتصادی اور اخلاقی حالات کا خاکہ مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔

اجتماعی حالات

عرب آبادی مختلف طبقات پر مشتمل تھی اور ہر طبقے کے حالات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے۔ چنانچہ طبقۂ اشراف میں مرد و عورت کا تعلق خاصا ترقی یافتہ تھا۔ عورت کو بہت کچھ خود مختاری حاصل تھی۔ اس کی بات مانی جاتی تھی۔ اور اس کا اتنا احترام اور تحفظ کیا جاتا تھا کہ اس راہ میں تلواریں نکل پڑتی تھیں اور خونریزیاں ہو جاتی تھیں۔ آدمی جب اپنے کرم و شجاعت پر جسے عرب میں بڑا بلند مقام حاصل تھا اپنی تعریف کرنا چاہتا تو عموماً عورت ہی کو مخاطب کرتا۔ بسا اوقات عورت چاہتی تو قبائل کو صلح کے لیے اکٹھا کر دیتی اور چاہتی تو ان کے درمیان جنگ اور خونریزی کے شعلے بھڑکا دیتی، لیکن ان سب کے باوجود بلا نزاع مرد ہی کو خاندان کا سربراہ مانا جاتا تھا اور اس کی بات فیصلہ کن ہوا کرتی تھی۔ اس طبقے میں مرد اور عورت کا تعلق عقد نکاح کے ذریعے ہوتا تھا، اور یہ نکاح عورت کے اولیاء کے زیر نگرانی انجام پاتا تھا۔ عورت کو یہ حق نہ تھا کہ ان کی ولایت کے بغیر اپنے طور پر اپنا نکاح کر لے۔

ایک طرف طبقہ اشراف کا یہ حال تھا تو دوسری طرف دوسرے طبقوں میں مرد و عورت کے اختلاط کی اور بھی کئی صورتیں تھیں جنہیں بدکاری و بے حیائی اور فحش کاری و زنا کاری کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں۔ ایک تو وہی صورت تھی جو آج بھی لوگوں میں رائج ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس کی زیر ولایت لڑکی کے لیے نکاح کا پیغام دیتا۔ پھر منظوری کے بعد مہر دے کر اس سے نکاح کر لیتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ عورت جب حیض سے پاک ہوتی تو اس کا شوہر کہتا کہ فلاں شخص کے پاس پیغام بھیج کر اس سے اس کی شرمگاہ حاصل کرو (یعنی زنا کراؤ) اور شوہر خود اس سے الگ تھلگ رہتا اور اس کے قریب نہ جاتا یہاں تک کہ واضح ہو جاتا کہ جس آدمی سے شرمگاہ حاصل

کی تھی (یعنی زنا کرایا تھا) اس سے حمل ٹھہر گیا ہے۔ جب حمل واضح ہو جاتا تو اس کے بعد اگر شوہر چاہتا تو اس عورت کے پاس جاتا۔ ایسا اس لیے کیا جاتا تھا کہ لڑکا شریف اور باکمال پیدا ہو۔ اس نکاح کو نکاحِ استبضاع کہا جاتا تھا (اور اسی کو ہندوستان میں نیوگ کہتے ہیں۔) نکاح کی تیسری صورت یہ تھی کہ دس آدمیوں سے کم کی ایک جماعت اکٹھا ہوتی۔ سب کے سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے اور بدکاری کرتے۔ جب وہ عورت حاملہ ہو جاتی اور بچہ پیدا ہوتا تو پیدائش کے چند رات بعد وہ عورت سب کو بلا بھیجتی اور سب کو آنا پڑتا مجال نہ تھی کہ کوئی نہ آئے۔ اس کے بعد وہ عورت کہتی کہ آپ لوگوں کا جو معاملہ تھا وہ تو آپ لوگ جانتے ہی ہیں اور اب میرے بطن سے بچہ پیدا ہوا ہے اور اے فلاں وہ تمہارا بیٹا ہے۔ وہ عورت ان میں سے جس کا نام چاہتی لے لیتی اور وہ اُس کا لڑکا مان لیا جاتا۔

چوتھا نکاح یہ تھا کہ بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے اور کسی عورت کے پاس جاتے۔ وہ اپنے پاس کسی آنے والے سے انکار نہ کرتی۔ یہ رنڈیاں ہوتی تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈیاں گاڑے رکھتی تھیں تاکہ یہ نشانی کا کام دے اور جو ان کے پاس جانا چاہے بے دھڑک چلا جائے۔ جب ایسی عورت حاملہ ہوتی اور بچہ پیدا ہوتا تو سب کے سب اس کے پاس جمع ہوتے اور قیافہ شناس کو بلاتے۔ قیافہ شناس اپنی رائے کے مطابق اس لڑکے کو کسی بھی شخص کے ساتھ ملحق کر دیتا۔ پھر یہ اسی سے مربوط ہو جاتا اور اسی کا لڑکا کہلاتا۔ وہ اس سے انکار نہ کر سکتا تھا ـــــ جب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تو جاہلیت کے سارے نکاح منہدم کر دیئے صرف اسلامی نکاح باقی رہا جو آج رائج ہے۔[1]

عرب میں مرد و عورت کے ارتباط کی بعض صورتیں ایسی بھی تھیں جو تلوار کی دھار اور نیزے کی نوک پر وجود میں آتی تھیں یعنی قبائلی جنگوں میں غالب آنے والا قبیلہ مغلوب قبیلے کی عورتوں کو قید کر کے اپنے حرم میں داخل کر لیتا تھا، لیکن ایسی عورتوں سے پیدا ہونے والی اولاد زندگی بھر عار محسوس کرتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں کسی تحدید کے بغیر متعدد بیویاں رکھنا بھی ایک معروف بات تھی۔ لوگ ایسی دو عورتیں بھی بیک وقت نکاح میں رکھ لیتے تھے جو آپس میں سگی بہن ہوتی تھیں۔ باپ کے طلاق دینے یا وفات پانے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں سے بھی نکاح کر لیتا تھا۔ طلاق کا اختیار مرد کو حاصل تھا اور اس کی کوئی حد معین نہ تھی۔[2]

---

[1] صحیح بخاری: کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح الا بولی ۲/۷۶۹ و ابوداؤد: باب وجوہ النکاح۔

[2] ابوداؤد، نسخ المراجعۃ بعد التطلیقات الثلاث، نیز کتب تفسیر متعلقہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ

زناکاری تمام طبقات میں عروج پر تھی۔ کوئی طبقہ یا انسانوں کی کوئی قسم اس سے مستثنیٰ نہ تھی۔ البتہ کچھ مرد اور کچھ عورتیں ایسی ضرور تھیں جنہیں اپنی بڑائی کا احساس اس برائی کے کیچڑ میں لت پت ہونے سے باز رکھتا تھا۔ پھر آزاد عورتوں کا حال لونڈیوں کے مقابل نسبتاً اچھا تھا۔ اصل مصیبت لونڈیاں ہی تھیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ اہلِ جاہلیت کی غالب اکثریت اس برائی کی طرف منسوب ہونے میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کرتی تھی چنانچہ سنن ابی داؤد وغیرہ میں مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا یارسول اللہ! ﷺ فلاں شخص میرا بیٹا ہے۔ میں نے جاہلیت میں اس کی ماں سے زنا کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اسلام میں ایسے دعوے کی کوئی گنجائش نہیں۔ جاہلیت کی بات گئی، اب تو لڑکا اسی کا ہوگا جس کی بیوی یا لونڈی ہو اور زناکار کے لیے پتھر ہے۔" اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ اور عبد بن زمعہ کے درمیان زمعہ کی لونڈی کے بیٹے —— عبدالرحمٰن بن زمعہ —— کے بارے میں جو جھگڑا پیش آیا تھا وہ بھی معلوم و معروف ہے۔[۳]

جاہلیت میں باپ بیٹے کا تعلق بھی مختلف نوعیت کا تھا۔ کچھ تو ایسے تھے جو کہتے تھے ؎

إِنَّمَا أَوْلَادُنَا بَيْنَنَا أَكْبَادُنَا تَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ

"ہماری اولاد ہمارے کلیجے ہیں جو روئے زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔"

لیکن دوسری طرف کچھ ایسے بھی تھے جو لڑکیوں کو رسوائی اور خرچ کے خوف سے زندہ دفن کر دیتے تھے اور بچوں کو فقر و فاقہ کے ڈر سے مار ڈالتے تھے۔[۴] لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سنگ دلی بڑے پیمانے پر رائج تھی کیونکہ عرب اپنے دشمن سے اپنی حفاظت کے لیے دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ اولاد کے محتاج تھے اور اس کا احساس بھی رکھتے تھے۔

جہاں تک سگے بھائیوں، چچیرے بھائیوں، اور کنبے قبیلے کے لوگوں کے باہمی تعلقات کا معاملہ ہے تو یہ خاصے پختہ اور مضبوط تھے کیونکہ عرب کے لوگ قبائلی عصبیت ہی کے سہارے جیتے اور اسی کے لیے مرتے تھے۔ قبیلے کے اندر باہمی تعاون اور اجتماعیت کی روح پوری طرح کارفرما ہوتی تھی۔ جسے عصبیت کا جذبہ مزید دو آتشہ رکھتا تھا۔ درحقیقت قومی عصبیت اور قرابت کا تعلق ہی ان کے اجتماعی نظام کی بنیاد تھا۔ وہ لوگ اس مثل پر اس کے لفظی معنی کے مطابق عمل پیرا تھے کہ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا

---

۳ صحیح بخاری ۲/۹۹۹، ۱۰۶۵، ابوداؤد: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ

۴ قرآن مجید ۶: ۱۰۱-۱۰۶ : ۵۸، ۵۹ - ۱۷ : ۳۱ - ۸۱ : ۸

اُو مَظْلُوماً (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم) اس مثل کے معنی میں ابھی وہ اصلاح نہیں ہوئی تھی جو بعد میں اسلام کے ذریعے کی گئی یعنی ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُسے ظلم سے باز رکھا جائے۔ البتہ شرف و سرداری میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جذبہ بہت سی دفعہ ایک ہی شخص سے وجود میں آنے والے قبائل کے درمیان جنگ کا سبب بن جایا کرتا تھا جیسا کہ اَوس و خزرج، عَبس و ذُبیان اور بکر و تغلب وغیرہ کے واقعات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک مختلف قبائل کے ایک دوسرے سے تعلقات کا معاملہ ہے تو یہ پوری طرح شکستہ و ریختہ تھے۔ قبائل کی ساری قوت ایک دوسرے کے خلاف جنگ میں فنا ہو رہی تھی، البتہ دین اور خرافات کے آمیزے سے تیار شدہ بعض رسوم و عادات کی بدولت بسا اوقات جنگ کی حدت و شدت میں کمی آجاتی تھی اور بعض حالات میں مُوالاۃ، حلف اور تابعداری کے اصولوں پر مختلف قبائل یکجا ہو جاتے تھے۔ علاوہ ازیں حرام مہینے ان کی زندگی اور حصولِ معاش کے لیے سراپا رحمت و مدد تھے۔

خلاصہ یہ کہ اجتماعی حالت ضُعف و بے بصیرتی کی پستی میں گری ہوئی تھی، جہل اپنی طنابیں تانے ہوئے تھا اور خرافات کا دور دورہ تھا۔ لوگ جانوروں جیسی زندگی گذار رہے تھے۔ عورت بیچی اور خریدی جاتی تھی اور بعض اوقات اس سے مٹی اور پتھر جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ قوم کے باہمی تعلقات کمزور بلکہ ٹوٹے ہوئے تھے اور حکومتوں کے سارے عزائم اپنی رعایا سے خزانے بھرنے یا مخالفین پر فوج کشی کرنے تک محدود تھے۔

اقتصادی حالت

اقتصادی حالت، اجتماعی حالت کے تابع تھی۔ اس کا اندازہ عرب کے ذرائع معاش پر نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے کہ تجارت ہی ان کے نزدیک ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ تھی۔ اور معلوم ہے کہ تجارتی آمد و رفت امن و سلامتی کی فضا کے بغیر آسان نہیں اور جزیرۃ العرب کا حال یہ تھا کہ سوائے حرمت والے مہینوں کے امن و سلامتی کا کہیں وجود نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صرف حرام مہینوں ہی میں عرب کے مشہور بازار عُکاظ، ذی المجاز اور مَجنہ وغیرہ لگتے تھے۔

جہاں تک صنعتوں کا معاملہ ہے تو عرب اس میدان میں ساری دنیا سے پیچھے تھے۔ کپڑے کی بُنائی اور چمڑے کی دباغت وغیرہ کی شکل میں جو چند صنعتیں پائی بھی جاتی تھیں وہ زیادہ تر یمن، حیرہ اور شام کے متصل علاقوں میں تھیں۔ البتہ اندرونِ عرب کھیتی باڑی اور گلہ بانی کا کسی قدر رواج تھا۔

ساری عرب عورتیں سوت کاتتی تھیں لیکن مشکل یہ تھی کہ سارا مال و متاع ہمیشہ لڑائیوں کی زد میں رہتا تھا۔ فقر اور بھوک کی وبا عام تھی اور لوگ ضروری کپڑوں اور لباس سے بھی بڑی حد تک محروم رہتے تھے۔

اخلاق

یہ تو اپنی جگہ مسلّم ہے ہی کہ اہلِ جاہلیت میں خسیس و رذیل عادتیں اور وجدان و شعور اور عقلِ سلیم کے خلاف باتیں پائی جاتی تھیں لیکن ان میں ایسے پسندیدہ اخلاقِ فاضلہ بھی تھے جنہیں دیکھ کر انسان دنگ اور ششدر رہ جاتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ کرم و سخاوت ـــــ یہ اہلِ جاہلیت کا ایسا وصف تھا جس میں وہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے تھے اور اس پر اس طرح فخر کرتے تھے کہ عرب کے آدھے اشعار اسی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اس وصف کی بنیاد پر کسی نے خود اپنی تعریف کی ہے تو کسی نے کسی اور کی۔ حالت یہ تھی کہ سخت جاڑے اور بھوک کے زمانے میں کسی کے گھر کوئی مہمان آجاتا اور اس کے پاس اپنی اس ایک اونٹنی کے سوا کچھ نہ ہوتا جو اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی کا واحد ذریعہ ہوتی تو بھی ـــ ایسی سنگین حالت کے باوجود ـــ اس پر سخاوت کا جوش غالب آجاتا اور وہ اٹھ کر اپنے مہمان کے لیے اپنی اونٹنی ذبح کر دیتا۔ ان کے کرم ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ بڑی بڑی دیت اور مالی ذمہ داریاں اٹھا لیتے اور اس طرح انسانوں کو بربادی اور خونریزی سے بچا کر دوسرے رئیسوں اور سرداروں کے مقابل فخر کرتے تھے۔

اسی کرم کا نتیجہ تھا کہ وہ شراب نوشی پر فخر کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ یہ بذاتِ خود کوئی فخر کی چیز تھی بلکہ اس لیے کہ یہ کرم و سخاوت کو آسان کر دیتی تھی کیونکہ نشے کی حالت میں مال لٹانا انسانی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ اس لیے یہ لوگ انگور کے درخت کو کرم اور انگور کی شراب کو بنت الکرم کہتے تھے۔ جاہلی اشعار کے دواوین پر نظر ڈالیے تو یہ مدح و فخر کا ایک اہم باب نظر آئے گا۔

عنترہ بن شداد عبسی اپنے معلقہ میں کہتا ہے:۔

ولقد شربت من المدامة بعد ما ... ركد الهواجر بالمشوف المعلم

بزجاجة صفراء ذات أسرة ... قرنت بأزهر بالشمال مفدم

فاذا شربت فانني مستهلك ... مالي، وعرضي وافر لم يكلم

واذا صحوت فما اقصر عن ندى ... وكما علمت شمائلي وتكرمي

" میں نے دوپہر کی تیزی رکنے کے بعد ایک زرد رنگ کے دھاری دار جام بلوریں سے جو بائیں جانب رکھی ہوئی تابناک اور منہ بند خم کے ساتھ تھا، نشان لگی ہوئی صاف شفاف شراب پی۔ اور جب میں

پی لیتا ہوں تو اپنا مال لٹا ڈالتا ہوں۔ لیکن میری آبرو بھرپور رہتی ہے اس پر کوئی چوٹ نہیں آتی۔ اور جب میں ہوش میں آتا ہوں تب بھی سخاوت میں کوتاہی نہیں کرتا اور میرا اخلاق و کرم جیسا کچھ ہے تمہیں معلوم ہے۔"

ان کے کرم ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ جوا کھیلتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بھی سخاوت کی ایک راہ ہے کیونکہ انہیں جو نفع حاصل ہوتا، یا نفع حاصل کرنے والوں کے حصے سے جو کچھ فاضل بچ رہتا اسے مسکینوں کو دے دیتے تھے۔ اسی لیے قرآن پاک نے شراب اور جوئے کے نفع کا انکار نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲:۲۱۹) "ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔"

۲۔ وفائے عہد ـــــ یہ بھی دورِ جاہلیت کے اخلاقِ فاضلہ میں سے ہے۔ عہد کو ان کے نزدیک دین کی حیثیت حاصل تھی جس سے وہ بہرحال چمٹے رہتے تھے۔ اور اس راہ میں اپنی اولاد کا خون اور اپنے گھر بار کی تباہی بھی ہیچ سمجھتے تھے۔ اسے سمجھنے کے لیے ہانی بن مسعود شیبانی، سموأل بن عادیا اور حاجب بن زرارہ کے واقعات کافی ہیں۔

۳۔ خودداری و عزتِ نفس ـــــ اس پر قائم رہنا اور ظلم و جبر برداشت نہ کرنا بھی جاہلیت کے معروف اخلاق میں سے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی شجاعت و غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر جس سے ذلت و اہانت کی بو آتی، شمشیر و سنان اٹھا لیتے اور نہایت خونریز جنگ چھیڑ دیتے۔ انہیں اس راہ میں اپنی جان کی قطعاً پروا نہ رہتی۔

۴۔ عزائم کی تکمیل ـــــ اہلِ جاہلیت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جب وہ کسی کام کو مجد و افتخار کا ذریعہ سمجھ کر انجام دینے پر تل جاتے تو پھر کوئی رکاوٹ انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر اس کام کو انجام دے ڈالتے تھے۔

۵۔ حلم و بردباری اور سنجیدگی ـــــ یہ بھی اہلِ جاہلیت کے نزدیک قابلِ ستائش خوبی تھی، مگر یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی شجاعت اور جنگ کے لیے ہمہ وقت آمادگی کی عادت کے سبب نادر الوجود تھی۔

۶۔ بدوی سادگی ـــــ یعنی تمدن کی آلائشوں اور داؤ پیچ سے ناواقفیت اور دوری۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سچائی اور امانت پائی جاتی تھی۔ وہ فریب کاری و بدعہدی سے دور اور متنفر تھے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جزیرۃ العرب کو ساری دنیا سے جو جغرافیائی نسبت حاصل تھی اس کے علاوہ یہی وہ قیمتی اخلاق تھے جن کی وجہ سے اہلِ عرب کو بنی نوع انسان کی قیادت اور رسالتِ عامہ کا بوجھ اٹھانے

کے لیے منتخب کیا گیا۔ کیونکہ یہ اخلاق اگرچہ بعض اوقات شرّ وفساد کا سبب بن جاتے تھے اور ان کی وجہ سے المناک حادثات پیش آجاتے تھے لیکن یہ فی نفسہٖ بڑے قیمتی اخلاق تھے۔ جو تھوڑی سی اصلاح کے بعد انسانی معاشرے کے لیے نہایت مفید بن سکتے تھے، اور یہی کام اسلام نے انجام دیا۔

غالباً ان اخلاق میں بھی ایفائے عہد کے بعد عزتِ نفس اور پختگیٔ عزم سب سے گراں قیمت اور نفع بخش جوہر تھا۔ کیونکہ اس قوتِ قاہرہ اور عزمِ مُصَمَّم کے بغیر شرّ وفساد کا خاتمہ اور نظامِ عدل کا قیام ممکن نہیں۔

اہلِ جاہلیت کے کچھ اور بھی اخلاقِ فاضلہ تھے لیکن یہاں سب کا احاطہ کرنا مقصود نہیں۔

○

خاندانِ نبوّت

نسب نبی ﷺ کا سلسلۂ نسب تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ جس کی صحت پر اہلِ سیر اور ماہرینِ انساب کا اتفاق ہے۔ یہ عدنان تک منتہی ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ جس میں اہلِ سیر کا اختلاف ہے کسی نے توقف کیا ہے اور کوئی قائل ہے۔ یہ عدنان سے اوپر ابراہیم علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ جس میں یقیناً کچھ غلطیاں ہیں یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اوپر حضرت آدم علیہ السلام تک جاتا ہے۔ اس کی جانب اشارہ گذر چکا ہے۔ ذیل میں تینوں حصوں کی قدرے تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

پہلا حصہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (شیبہ) بن ہاشم (عمرو) بن عبدمناف (مغیرہ) بن قصی (زید) بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر (انہی کا لقب قریش تھا اور ان ہی کی طرف قبیلۂ قریش منسوب ہے) بن مالک بن نضر (قیس) بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ (عامر) بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان[1]

دوسرا حصہ عدنان سے اوپر یعنی عدنان بن أد بن ہمیسع بن سلامان بن حوص بن بوز بن قموال بن أبی بن عوام بن ناشد بن حزا بن بلداس بن یدلاف بن طابخ بن جاحم بن ناحش بن ماخی بن عیض بن عبقر بن عبید بن الدعا بن حمدان بن سنبر بن یثربی بن یحزن بن یلحن بن أرعوی بن عیض بن دیشان بن عیصر بن افناد بن أیہام بن مقصر بن ناحث بن زارح بن سمی بن مزی بن عوضہ بن عرام بن قیدار بن اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام[2]

تیسرا حصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُوپر۔ ابراہیم بن تارح (آزر) بن ناحور بن ساروع (یا سارُوغ) بن راعو بن فالخ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام بن لامک بن متوشلخ بن اخنوخ (کہا جاتا ہے کہ یہ ادریس علیہ السلام کا نام ہے) بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن آنوشہ بن شیث بن آدم علیہ السلام[3]

---

[1] ابن ہشام ۱/۲، تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۵، ۶، رحمۃ للعالمین ۲/۱۱ تا ۱۴، ۵۲۰

[2] علامہ منصور پوری نے بڑی دقیق تحقیق کے بعد یہ حصہ نسب کلبی اور ابن سعد کی روایت سے جمع کیا ہے دیکھئے رحمۃ للعالمین ۲/۱۴ تا ۱۷ تاریخی مآخذ میں اس حصے کی بابت بڑا اختلاف ہے۔

[3] ابن ہشام ۱/۲ تا ۴۔ تلقیح الفہوم ص ۶ خلاصۃ السیر ص ۶ رحمۃ للعالمین ۲/۱۸ بعض ناموں کے متعلق ان مآخذ میں اختلاف بھی ہے۔ اور بعض نام بعض مآخذ سے ساقط بھی ہیں۔

خانوادہ نبی ﷺ کا خانوادہ اپنے جدِّ اعلیٰ ہاشم بن عبد مناف کی نسبت سے خانوادۂ ہاشمی کے نام سے معروف ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم اور ان کے بعد کے بعض افراد کے مختصر حالات پیش کر دیئے جائیں۔

۱۔ **ہاشم**: ہم بتا چکے ہیں کہ جب بنو عبدِ مناف اور بنو عبدالدار کے درمیان عہدوں کی تقسیم پر مصالحت ہو گئی تو عبدِ مناف کی اولاد میں ہاشم ہی کو سِقَایَہ اور رِفَادہ یعنی حجاج کرام کو پانی پلانے اور ان کی میزبانی کرنے کا منصب حاصل ہوا۔ ہاشم بڑے معزز اور مالدار تھے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مکے میں حاجیوں کو شوربا روٹی سان کر کھلانے کا اہتمام کیا۔ ان کا اصل نام عَمرو تھا لیکن روٹی توڑ کر شوربے میں ساننے کی وجہ سے ان کو ہاشم کہا جانے لگا کیونکہ ہاشم کے معنی ہیں توڑنے والا۔ پھر یہی ہاشم وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے قریش کے لیے گرمی اور جاڑے کے دو سالانہ تجارتی سفروں کی بنیاد رکھی ان کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

عمرو الذی ھشم الثرید لقومہ　　قوم بمکۃ مُسنتین عجاف

سنت الیہ الرحلتان کلاھما　　سفر الشتاء ورحلۃ الأصیاف

"یہ عَمرو ہی ہیں جنہوں نے قحط کی ماری ہوئی اپنی لاغر قوم کو مکہ میں روٹیاں توڑ کر شوربے میں بھگو بھگو کر کھلائیں اور جاڑے اور گرمی کے دونوں سفروں کی بنیاد رکھی"

ان کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ تجارت کے لیے ملک شام تشریف لے گئے۔ راستے میں مدینہ پہنچے تو وہاں قبیلۂ بنی نجار کی ایک خاتون سَلمیٰ بنت عَمرو سے شادی کر لی اور کچھ دنوں وہیں ٹھہرے رہے۔ پھر بیوی کو حالتِ حمل میں میکے ہی میں چھوڑ کر ملک شام روانہ ہو گئے اور وہاں جا کر فلسطین کے شہر غَزّہ میں انتقال کر گئے۔ ادھر سَلمیٰ کے بطن سے بچہ پیدا ہوا۔ یہ ۴۹۷ء کی بات ہے چونکہ بچے کے سر کے بالوں میں سفیدی تھی اس لیے سلمیٰ نے اس کا نام شَیْبَہ رکھا[۴] اور یَثرِب میں اپنے میکے ہی کے اندر اس کی پرورش کی۔ آگے چل کر یہی بچہ عبدالمُطَّلِب کے نام سے مشہور ہوا۔ عرصے تک خاندانِ ہاشم کے کسی آدمی کو اس کے وجود کا علم نہ ہو سکا۔ ہاشم کے کل چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں جن کے نام یہ ہیں۔ اسد، ابو صیفی، نضلہ، عبدالمُطَّلِب ـــ شفاء، خالدہ، ضعیفہ، رقیہ اور جنۃ[۵]۔

۲۔ **عبدالمُطَّلِب** ـــــ پچھلے صفحات سے معلوم ہو چکا ہے سِقَایَہ اور رِفَادہ کا منصب

---

[۴] ابن ہشام ۱/۱۳۷، رحمۃ للعالمین۔ ۱/۲۶/۲/۲۴　[۵] ایضاً ۱/۱۰۷

ہاشم کے بعد ان کے بھائی مُطّلِب کو ملا۔ یہ بھی اپنی قوم میں بڑی خوبی و اعزاز کے مالک تھے۔ ان کی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔ ان کی سخاوت کے سبب قریش نے ان کا لقب فیاض رکھ چھوڑا تھا۔ جب شَیْبَہ یعنی عبدالمُطّلِب ـــــ دس بارہ برس کے ہو گئے تو مُطّلِب کو ان کا علم ہُوا اور وہ انہیں لینے کے لیے روانہ ہُوئے۔ جب یثرب کے قریب پہنچے اور شیبہ پر نظر پڑی تو اشکبار ہو گئے انہیں سینے سے لگا لیا اور پھر اپنی سواری پر پیچھے بٹھا کر مکّہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مگر شَیْبَہ نے ماں کی اجازت کے بغیر ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس لیے مُطّلِب ان کی ماں سے اجازت کے طالب ہوئے مگر ماں نے اجازت نہ دی۔ آخر مُطّلِب نے کہا کہ یہ اپنے والد کی حکومت اور اللہ کے حرم کی طرف جا رہے ہیں۔ اس پر ماں نے اجازت دے دی اور مُطّلِب انہیں اپنے اُونٹ پر بٹھا کر مکہ لے آئے۔ مکّے والوں نے دیکھا تو کہا یہ عبدالمُطّلِب ہے یعنی مُطّلِب کا غلام ہے۔ مُطّلِب نے کہا نہیں نہیں۔ یہ میرا بھتیجا یعنی میرے بھائی ہاشم کا لڑکا ہے۔ پھر شَیْبَہ نے مُطّلِب کے پاس پرورش پائی اور جوان ہُوئے ـــ اس کے بعد مقام رومان (یمن) میں مُطّلِب کی وفات ہو گئی اور ان کے چھوڑے ہُوئے مناصب عبدالمُطّلِب کو حاصل ہُوئے۔ عبدالمُطّلِب نے اپنی قوم میں اس قدر شرف و اعزاز حاصل کیا کہ ان کے آباء و اجداد میں بھی کوئی اس مقام کو نہ پہنچ سکا تھا۔ قوم نے انہیں دل سے چاہا اور ان کی بڑی عزت و قدر کی۔[۶]

جب مُطّلِب کی وفات ہو گئی تو نوفل نے عبدالمُطّلِب کے صحن پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ عبدالمُطّلِب نے قریش کے کچھ لوگوں سے اپنے چچا کے خلاف مدد چاہی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ ہم تمہارے اور تمہارے چچا کے درمیان دخیل نہیں ہو سکتے۔ آخر عبدالمُطّلِب نے بنی نجّار میں اپنے ماموں کو کچھ اشعار لکھ بھیجے جس میں ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ جواب میں ان کا ماموں ابوسعد بن عدی اَسّی سوار لے کر روانہ ہوا۔ اور مکّے کے قریب اَبْطَح میں اترا۔ عبدالمُطّلِب نے وہیں ملاقات کی اور کہا ماموں جان! گھر تشریف لے چلیں۔ ابوسعد نے کہا نہیں خدا کی قسم! یہاں تک کہ نوفل سے مل لوں۔ اس کے بعد ابوسعد آگے بڑھا اور نوفل کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ نوفل حَطِیم میں مشائخ قریش کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ ابوسعد نے تلوار بے نیام کرتے ہُوئے کہا: "اس گھر کے رب کی قسم! اگر تم نے میرے بھانجے کی زمین واپس نہ کی تو یہ تلوار تمہارے اندر پیوست کر دوں گا"۔ نوفل نے کہا اچھا! لو میں نے واپس کر دی۔ اس پر ابوسعد نے

---

[۶] ابن ہشام ۱/۱۳۷، ۱۳۸

مشائخ قریش کو گواہ بنایا، پھر عبدالمطلب کے گھر گیا اور تین روز مقیم رہ کر عمرہ کرنے کے بعد مدینہ واپس چلا گیا۔

اس واقعے کے بعد نوفل نے بنی ہاشم کے خلاف بنی عبدشمس سے باہمی تعاون کا عہد و پیمان کیا۔ ادھر بنو خزاعہ نے دیکھا کہ بنو نجار نے عبدالمطلب کی اس طرح مدد کی ہے تو کہنے لگے کہ عبدالمطلب جس طرح تمہاری اولاد ہے ہماری بھی اولاد ہے۔ لہٰذا ہم پر اس کی مدد کا حق زیادہ ہے ـــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبدمناف کی ماں قبیلہ خزاعہ ہی سے تعلق رکھتی تھیں ـــــ چنانچہ بنو خزاعہ نے دارالندوہ میں جا کر بنو عبدشمس اور بنو نوفل کے خلاف بنو ہاشم سے تعاون کا عہد و پیمان کیا۔ یہی پیمان تھا جو آگے چل کر اسلامی دور میں فتح مکہ کا سبب بنا۔ تفصیل اپنی جگہ آ رہی ہے۔[1]

بیت اللہ کے تعلق سے عبدالمطلب کے ساتھ دو اہم واقعات پیش آئے، ایک چاہِ زمزم کی کھدائی کا واقعہ اور دوسرا فیل کا واقعہ۔

چاہِ زمزم کی کھدائی

پہلے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالمطلب نے خواب دیکھا کہ انہیں زمزم کا کنواں کھودنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور خواب ہی میں انہیں اس کی جگہ بھی بتائی گئی۔ انہوں نے بیدار ہونے کے بعد کھدائی شروع کی اور رفتہ رفتہ وہ چیزیں برآمد ہوئیں جو بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت چاہِ زمزم میں دفن کی تھیں۔ یعنی تلواریں، زرہیں، اور سونے کے دونوں ہرن۔ عبدالمطلب نے تلواروں سے کعبے کا دروازہ ڈھالا۔ سونے کے دونوں ہرن بھی دروازے ہی میں فٹ کئے اور حاجیوں کو زمزم پلانے کا بندوبست کیا۔

کھدائی کے دوران یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب زمزم کا کنواں نمودار ہو گیا تو قریش نے عبدالمطلب سے جھگڑا شروع کیا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی کھدائی میں شریک کر لو۔ عبدالمطلب نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس کام کے لیے مخصوص کیا گیا ہوں، لیکن قریش کے لوگ باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ فیصلے کے لیے بنو سعد کی ایک کاہنہ عورت کے پاس جانا طے ہوا اور لوگ مکہ سے روانہ بھی ہو گئے لیکن راستے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی علامات دکھلائیں کہ وہ سمجھ گئے کہ زمزم کا کام قدرت کی طرف سے عبدالمطلب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لیے راستے ہی سے پلٹ آئے۔ یہی موقع تھا جب عبدالمطلب نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے انہیں دس لڑکے عطا کئے اور وہ سب کے سب اس عمر کو پہنچے کہ ان کا بچاؤ کر سکیں تو وہ ایک لڑکے کو کعبہ کے پاس قربان کر دیں گے۔[2]

---

[1] مختصر سیرۃ الرسول، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی ص ۴۱، ۴۲ [2] ابن ہشام ۱/۱۴۲ تا ۱۴۷

واقعۂ فیل دوسرے واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ اَبْرَہَہ صباح حبشی نے (جو نجاشی بادشاہِ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر جنرل تھا) جب دیکھا کہ اہلِ عرب خانہ کعبہ کا حج کرتے ہیں تو صنعاء میں ایک بہت بڑا کلیسا تعمیر کیا۔ اور چاہا کہ عرب کا حج اسی کی طرف پھیر دے مگر جب اس کی خبر بنو کنانہ کے ایک آدمی کو ہوئی تو اس نے رات کے وقت کلیسا کے اندر گھس کر اس کے قبلے پر پاخانہ پوت دیا۔ اَبْرَہَہ کو پتا چلا تو سخت برہم ہوا۔ اور ساٹھ ہزار کا ایک لشکرِ جرار لے کر کعبے کو ڈھانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے لیے ایک زبردست ہاتھی بھی منتخب کیا۔ لشکر میں کل نو یا تیرہ ہاتھی تھے۔ ابرہہ یمن سے یلغار کرتا ہوا مُغَمَّس پہنچا اور وہاں اپنے لشکر کو ترتیب دیکر اور ہاتھی کو تیار کر کے مکے میں داخلے کے لیے چل پڑا جب مُزْدَلِفَہ اور منیٰ کے درمیان وادیٔ مُحَسِّر میں پہنچا تو ہاتھی بیٹھ گیا اور کعبے کی طرف بڑھنے کے لیے کسی طرح نہ اٹھا۔ اس کا رُخ شمال جنوب یا مشرق کی طرف کیا جاتا تو اٹھ کر دوڑنے لگتا لیکن کعبے کی طرف کیا جاتا تو بیٹھ جاتا۔ اسی دوران اللہ نے چڑیوں کا ایک جھنڈ بھیج دیا جس نے لشکر پر ٹھیکری جیسے پتھر گرائے اور اللہ نے اسی سے انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا۔ یہ چڑیاں ابابیل اور قُمری جیسی تھیں، ہر چڑیا کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں کنکریاں چنے جیسی تھیں مگر جس کسی کو لگ جاتی تھیں اس کے اعضاء کٹنا شروع ہو جاتے تھے اور وہ مر جاتا تھا۔ یہ کنکریاں ہر آدمی کو نہیں لگی تھیں، لیکن لشکر میں ایسی بھگدڑ مچی کہ ہر شخص دوسرے کو روندتا کچلتا گرتا پڑتا بھاگ رہا تھا۔ پھر بھاگنے والے ہر راہ پر گر رہے تھے اور ہر چشمے پر مر رہے تھے۔ ادھر اَبْرَہَہ پر اللہ نے ایسی آفت بھیجی کہ اس کی انگلیوں کے پور جھڑ گئے اور صنعاء پہنچتے پہنچتے چوزے جیسا ہو گیا۔ پھر اس کا سینہ پھٹ گیا، دل باہر نکل آیا اور وہ مر گیا۔

اَبْرَہَہ کے اس حملے کے موقع پر مکے کے باشندے جان کے خوف سے گھاٹیوں میں بکھر گئے تھے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر جا چھپے تھے۔ جب لشکر پر عذاب نازل ہو گیا تو اطمینان سے اپنے گھروں کو پلٹ آئے۔[۹]

یہ واقعہ — بیشتر اہلِ سیر کے بقول — نبی ﷺ کی پیدائش سے صرف پچاس یا پچپن دن پہلے ماہ محرم میں پیش آیا تھا لہٰذا یہ ۵۷۱ء کی فروری کے اواخر یا مارچ کے اوائل کا واقعہ ہے یہ درحقیقت ایک تمہیدی نشانی تھی جو اللہ نے اپنے نبی اور اپنے کعبہ کے لیے ظاہر فرمائی تھی کیونکہ آپ بیت المقدس کو دیکھئے کہ اپنے دور میں اہلِ اسلام کا قبلہ تھا اور وہاں کے باشندے مسلمان

---

[۹] ابن ہشام ۱/۴۳ تا ۵۶

تھے۔ اس کے باوجود اس پر اللہ کے دشمن یعنی مشرکین کا تسلط ہوگیا تھا جیسا کہ بُخت نصر کے حملہ (۵۸۶ق م) اور اہل روما کے قبضہ (۷۰ء) سے ظاہر ہے۔ لیکن اس کے برخلاف کعبہ پر عیسائیوں کو تسلط حاصل نہ ہوسکا، حالانکہ اس وقت یہی مسلمان تھے اور کعبے کے باشندے مشرک تھے۔

پھر یہ واقعہ ایسے حالات میں پیش آیا کہ اس کی خبر اس وقت کی متمدن دنیا کے بیشتر علاقوں یعنی روم و فارس میں آناً فاناً پہنچ گئی۔ کیونکہ حبشہ کا رومیوں سے بڑا گہرا تعلق تھا اور دوسری طرف فارسیوں کی نظر رومیوں پر برابر رہتی تھی اور وہ رومیوں اور ان کے حلیفوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا برابر جائزہ لیتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعے کے بعد اہلِ فارس نے نہایت تیزی سے یمن پر قبضہ کرلیا۔ اب چونکہ یہی دو حکومتیں اس وقت متمدن دنیا کے اہم حصے کی نمائندہ تھیں۔ اس لیے اس واقعے کی وجہ سے دنیا کی نگاہیں خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ انہیں بیت اللہ کے شرف و عظمت کا ایک کھلا ہوا خدائی نشان دکھلائی پڑ گیا۔ اور یہ بات دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گئی کہ اس گھر کو اللہ نے تقدیس کے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا آئندہ یہاں کی آبادی سے کسی انسان کا دعوئ نبوت کے ساتھ اٹھنا اس واقعے کے تقاضے کے عین مطابق ہوگا۔ اور اس خدائی حکمت کی تفسیر ہوگا جو عالم اسباب سے بالاتر طریقے پر اہل ایمان کے خلاف مشرکین کی مدد میں پوشیدہ تھی۔

عبدالمطلب کے کل دس بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں: حارث، زُبیر، ابوطالب، عبداللہ، حمزہؓ، ابولہب، غیداق، مقوم، صفار اور عباس۔ بعض نے کہا ہے کہ گیارہ تھے۔ ایک کا نام قثم تھا اور بعض اور لوگوں نے کہا ہے کہ تیرہ تھے۔ ایک کا نام عبدالکعبہ اور ایک کا نام حجل تھا۔ لیکن دس کے قائلین کہتے ہیں کہ مقوم ہی کا دوسرا نام عبدالکعبہ اور غیداق کا دوسرا نام حجل تھا اور قثم نام کا کوئی شخص عبدالمطلب کی اولاد میں نہ تھا ——— عبدالمطلب کی بیٹیاں چھ تھیں۔ نام یہ ہیں: ام الحکیم ان کا نام بیضا ہے۔ بَرّہ۔ عاتکہ۔ صفیہ۔ اَروٰی اور اُمیمہ[1]

۳۔ عَبْدُ اللہ ——— رَسُوْلُ اللہ ﷺ کے والد محترم ———

ان کی والدہ کا نام فاطمہ تھا اور وہ عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ کی صاحبزادی تھیں۔ عبدالمطلب کی اولاد میں عبداللہ سب سے زیادہ خوبصورت پاکدامن اور چہیتے تھے اور ذبیح کہلاتے تھے۔ ذبیح کہلانے کی وجہ یہ تھی کہ جب عبدالمطلب کے لڑکوں کی تعداد پوری دس ہوگئی اور

---

[1] تلقیح الفہوم ص ۸، ۹، رحمۃ للعالمین ۲/۵۶، ۶۶

وہ بچاؤ کرنے کے لائق ہو گئے۔ تو عبدالمطلب نے انہیں اپنی نذر سے آگاہ کیا۔ سب نے بات مان لی۔ اس کے بعد عبدالمطلب نے قسمت کے تیروں پر ان سب کے نام لکھے ـــــ اور ہُبل کے قیم کے حوالے کیا۔ قیم نے تیروں کو گردش دے کر قرعہ نکالا تو عبداللہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا، چھری لی اور ذبح کرنے کے لیے خانہ کعبہ کے پاس لے گئے۔ لیکن قریش اور خصوصاً عبداللہ کے ننہیال والے یعنی بنو مخزوم اور عبداللہ کے بھائی ابوطالب آڑے آئے۔ عبدالمطلب نے کہا تب میں اپنی نذر کا کیا کروں؟ انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ کسی خاتون عرّافہ کے پاس جا کر حل دریافت کریں۔ عبدالمطلب ایک عرّافہ کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ عبداللہ اور دس اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی کریں، اگر عبداللہ کے نام قرعہ نکلے تو مزید دس اونٹ بڑھا دیں۔ اس طرح اونٹ بڑھاتے جائیں اور قرعہ اندازی کرتے جائیں، یہاں تک کہ اللہ راضی ہو جائے۔ پھر اونٹوں کے نام قرعہ نکل آئے تو انہیں ذبح کر دیں۔ عبدالمطلب نے واپس آ کر عبداللہ اور دس اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی کی مگر قرعہ عبداللہ کے نام نکلا۔ اس کے بعد وہ دس دس اونٹ بڑھاتے گئے اور قرعہ اندازی کرتے گئے مگر قرعہ عبداللہ کے نام ہی نکلتا رہا۔ جب سو اونٹ پورے ہو گئے تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ اب عبدالمطلب نے انہیں عبداللہ کے بدلے ذبح کیا اور وہیں چھوڑ دیا۔ کسی انسان یا درندے کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس واقعے سے پہلے قریش اور عرب میں خون بہا (دیت) کی مقدار دس اونٹ تھی مگر اس واقعے کے بعد سو اونٹ کر دی گئی۔ اسلام نے بھی اس مقدار کو برقرار رکھا۔ نبی ﷺ سے آپ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ میں دو ذبیح کی اولاد ہوں۔ ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے آپ کے والد عبداللہ[1]

عبدالمطلب نے اپنے صاحبزادے عبداللہ کی شادی کے لیے حضرت آمنہ کا انتخاب کیا جو وہب بن عبدِ مناف بن زہرہ بن کلاب کی صاحبزادی تھیں اور نسب اور رتبے کے لحاظ سے قریش کی افضل ترین خاتون شمار ہوتی تھیں۔ ان کے والد نسب اور شرف دونوں حیثیت سے بنو زہرہ کے سردار تھے۔ وہ مکہ ہی میں رخصت ہو کر حضرت عبداللہ کے پاس آئیں مگر تھوڑے عرصے بعد عبداللہ کو عبدالمطلب نے کھجور لانے کے لیے مدینہ بھیجا اور وہ وہیں انتقال کر گئے۔

---

[1] ابن ہشام ۱/۱۵۱ تا ۱۵۵ رحمۃ للعالمین ۲/۸۹، ۹۰ مختصر سیرۃ الرسول شیخ عبداللہ نجدی ص ۱۲، ۲۲، ۲۳۔

بعض اہلِ سیر کہتے ہیں کہ وہ تجارت کے لیے ملک شام تشریف لے گئے تھے۔ قریش کے ایک قافلے کے ہمراہ واپس آتے ہوئے بیمار ہو کر مدینہ اترے۔ اور وہیں انتقال کر گئے۔ تدفین نابغہ جعدی کے مکان میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پچیس برس کی تھی۔ اکثر مؤرخین کے بقول ابھی رسول اللہ ﷺ پیدا نہیں ہوئے تھے۔ البتہ بعض اہل سیر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی پیدائش ان کی وفات سے دو ماہ پہلے ہو چکی تھی[۱۲]۔ جب ان کی وفات کی خبر مکہ پہنچی تو حضرت آمنہ نے نہایت درد انگیز مرثیہ کہا جو یہ ہے:

عفا جانب البطحاء من ابن هاشم ... وجاور لحدا خارجا فی الغماغم

دعته المنایا دعوة فاجابها ... وما ترکت فی الناس مثل ابن هاشم

عشیة راحوا یحملون سریره ... تعاوره اصحابه فی التزاحم

فان تك غالته المنایا وریبها ... فقد کان معطاء کثیر التراحم[۱۳]

"بطحا کی آغوش ہاشم کے صاحبزادے سے خالی ہو گئی۔ وہ ہانگ و خروش کے درمیان ایک لحد میں آسودۂ خواب ہو گیا۔ اسے موت نے ایک پکار لگائی اور اس نے لبیک کہہ دیا۔ اب موت نے لوگوں میں ابنِ ہاشم جیسا کوئی انسان نہیں چھوڑا (کتنی حسرت ناک تھی) وہ شام جب لوگ انہیں تخت پر اٹھائے لے جا رہے تھے۔ اگر موت اور موت کے حوادث نے ان کا وجود ختم کر دیا ہے (تو ان کے کردار کے نقوش نہیں مٹائے جا سکتے) وہ بڑے دانا اور رحم دل تھے۔"

عبداللہ کا کل ترکہ یہ تھا: پانچ اونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ، ایک حبشی لونڈی جن کا نام برکت تھا اور کنیت اُمِّ ایمن۔ یہی اُمِّ ایمن ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو گود کھلایا تھا[۱۴]۔

○

---

[۱۲] ابن ہشام ۱/۱۵۶، ۱۵۸، فقہ السیرۃ از محمد غزالی ص۴۵، رحمۃ للعالمین ۲/۹۱

[۱۳] طبقات ابن سعد ۱/۶۲

[۱۴] مختصر السیرۃ از شیخ عبداللہ ص۱۲، تلقیح الفہوم ص۱۴۔ صحیح مسلم ۲/۹۶

ولادتِ باسعادت اور حیاتِ طیبہ کے چالیس سال

ولادتِ باسعادت

رسول اللہ ﷺ مکہ میں شعبِ بنی ہاشم کے اندر ۹ ربیع الاول سنہ عام الفیل یوم دوشنبہ کو صبح کے وقت پیدا ہوئے۔ اس وقت نوشیرواں کی تخت نشینی کا چالیسواں سال تھا اور ۲۰ یا ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کی تاریخ تھی۔ علامہ محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوریؒ اور محمود پاشا فلکی کی تحقیق یہی ہے[1]

ابنِ سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی والدہ نے فرمایا: "جب آپ کی ولادت ہوئی تو میرے جسم سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محل روشن ہوگئے"۔ امام احمدؒ نے حضرت عرباضؓ بن ساریہ سے بھی تقریباً اسی مضمون کی ایک روایت نقل فرمائی ہے[2]

بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ ولادت کے وقت بعض واقعات نبوت کے پیش خیمے کے طور پر ظہور پذیر ہوئے، یعنی ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگورے گر گئے۔ مجوس کا آتش کدہ ٹھنڈا ہوگیا۔ بحیرہ ساوہ خشک ہوگیا اور اس کے گرجے منہدم ہوگئے۔ یہ بیہقی کی روایت ہے[3] لیکن محمد غزالی نے اس کو درست تسلیم نہیں کیا ہے[4]

ولادت کے بعد آپ کی والدہ نے عبدالمطلب کے پاس پوتے کی خوشخبری بھجوائی۔ وہ شاداں و فرحاں تشریف لائے اور آپؐ کو خانہ کعبہ میں لے جاکر اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اس کا شکر ادا کیا اور آپ کا نام **محمد** تجویز کیا۔ یہ نام عرب میں معروف نہ تھا۔ پھر عرب دستور کے مطابق ساتویں دن ختنہ کیا[5]

---

[1] تاریخ خضری ۱/۶۲، رحمۃ للعالمین ۱/۳۸، ۳۹۔ اپریل کی تاریخ کا اختلاف عیسوی تقویم کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔

[2] مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ ص۱۲، ابنِ سعد ۱/۶۳۔

[3] ایضاً مختصر السیرۃ ص۱۲

[4] دیکھئے فقہ السیرۃ محمد غزالی ص۴۶۔

[5] ابنِ ہشام ۱/۱۵۹، ۱۶۰، تاریخ خضری ۱/۶۲ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ مختون (ختنہ کئے ہوئے) پیدا ہوئے تھے۔ دیکھئے تلقیح الفہوم ص۴ مگر ابن قیم کہتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی ثابت حدیث نہیں۔ دیکھئے زاد المعاد ۱/۱۸

آپ کو آپ کی والدہ کے بعد سب سے پہلے ابولہب کی لونڈی ثُوَیبہؓ نے دودھ پلایا۔ اس وقت اس کی گود میں جو بچہ تھا اس کا نام مسروح تھا۔ ثُوَیبہؓ نے آپؐ سے پہلے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو اور آپؐ کے بعد ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔[1]

بنی سعد میں

عرب کے شہری باشندوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کو شہری امراض سے دور رکھنے کے لیے دودھ پلانے والی بدوی عورتوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے تاکہ ان کے جسم طاقتور اور اعصاب مضبوط ہوں اور اپنے گہوارہ ہی سے خالص اور ٹھوس عربی زبان سیکھ لیں۔ اسی دستور کے مطابق عبدالمطلب نے دودھ پلانے والی دایہ تلاش کی اور نبی ﷺ کو حضرت حلیمہؓ بنت ابی ذُؤَیب کے حوالے کیا۔ یہ قبیلہ بنی سعد بن بکر کی ایک خاتون تھیں۔ ان کے شوہر کا نام حارث بن عبدالعزیٰ اور کنیت ابوکبشہ تھی اور وہ بھی قبیلہ بنی سعد ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

حارث کی اولاد کے نام یہ ہیں جو رضاعت کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ کے بھائی بہن تھے: عبداللہ۔ انیسہ۔ حذافہ یا جذامہ۔ انہیں کا لقب شیماء تھا اور اسی نام سے وہ زیادہ مشہور ہوئیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کو گود کھلایا کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب جو رسول اللہ ﷺ کے چچیرے بھائی تھے وہ بھی حضرت حلیمہؓ کے واسطے سے آپ کے رضاعی بھائی تھے۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب بھی دودھ پلانے کے لیے بنو سعد کی ایک عورت کے حوالے کیے گئے تھے۔ اس عورت نے بھی ایک دن جب رسول اللہ ﷺ حضرت حلیمہؓ کے پاس تھے آپ کو دودھ پلا دیا۔ اس طرح آپ اور حضرت حمزہؓ دوہرے رضاعی بھائی ہو گئے ایک ثُوَیبہؓ کے تعلق سے اور دوسرے بنو سعد کی اس عورت کے تعلق سے۔[2]

رضاعت کے دوران حضرت حلیمہؓ نے نبی ﷺ کی برکت کے ایسے ایسے مناظر دیکھے کہ سراپا حیرت رہ گئیں۔ تفصیلات انہیں کی زبانی سنیئے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت حلیمہؓ بیان کیا کرتی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنا ایک چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ لے کر بنی سعد کی کچھ عورتوں کے قافلے میں اپنے شہر سے باہر دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں نکلیں۔ یہ قحط سالی کے دن تھے اور قحط نے کچھ باقی نہ چھوڑا تھا۔ میں اپنی ایک سفید گدھی پر سوار تھی اور ہمارے پاس ایک اونٹنی بھی تھی، لیکن بخدا اس سے ایک قطرہ دودھ نہ نکلتا تھا۔ ادھر بھوک سے بچہ اس قدر بلکتا تھا کہ ہم رات بھر سو نہیں سکتے

---

[1] تلقیح الفہوم ص۴ ۔ مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ ص۱۳ [2] زاد المعاد ۱/۱۹

تھے۔ نہ میرے سینے میں بچہ کے لیے کچھ تھا۔ نہ اُونٹنی اس کی خوراک دے سکتی تھی۔ بس ہم بارش اور خوشحالی کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ میں اپنی گدھی پر سوار ہو کر چلی تو وہ کمزوری اور دُبلے پن کے سبب اتنی سُست رفتار نکلی کہ پورا قافلہ تنگ آگیا۔ خیر ہم کسی نہ کسی طرح دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مکہ پہنچ گئے۔ پھر ہم میں سے کوئی عورت ایسی نہیں تھی جس پر رسول اللہ ﷺ کو پیش نہ کیا گیا ہو مگر جب اسے بتایا جاتا کہ آپ ﷺ یتیم ہیں تو وہ آپ کو لینے سے انکار کر دیتی، کیونکہ ہم بچے کے والد سے داد و دہش کی اُمید رکھتے تھے۔ ہم کہتے کہ یہ تو یتیم ہے بھلا اس کی بیوہ ماں اور اس کے دادا کیا دے سکتے ہیں۔ بس یہی وجہ تھی کہ ہم آپ کو لینا نہیں چاہتے تھے۔

ادھر جتنی عورتیں میرے ہمراہ آئی تھیں سب کو کوئی نہ کوئی بچہ مل گیا صرف مجھ ہی کو نہ مل سکا۔ جب واپسی کی باری آئی تو میں نے اپنے شوہر سے کہا "خدا کی قسم! مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری ساری سہیلیاں تو بچے لے لے کر جائیں اور تنہا میں کوئی بچہ لیے بغیر واپس جاؤں۔ میں جا کر اسی یتیم بچے کو لیے لیتی ہوں۔ شوہر نے کہا کوئی حرج نہیں! ممکن ہے اللہ اسی میں ہمارے لیے برکت دے۔ اس کے بعد میں نے جا کر بچہ لے لیا اور محض اس بنا پر لے لیا کہ کوئی اور بچہ نہ مل سکا۔

حضرت حلیمہؓ کہتی ہیں کہ جب میں بچے کو لے کر اپنے ڈیرے پر واپس آئی اور اسے اپنی آغوش میں رکھا تو اس نے جس قدر چاہا دونوں سینے دودھ کے ساتھ اس پر اُمنڈ پڑے اور اس نے شکم سیر ہو کر پیا۔ اس کے ساتھ اس کے بھائی نے بھی شکم سیر ہو کر پیا، پھر دونوں سو گئے حالانکہ اس سے پہلے ہم اپنے بچے کے ساتھ سو نہیں سکتے تھے۔ ادھر میرے شوہر اونٹنی دوہنے گئے تو دیکھا کہ اس کا تھن دودھ سے لبریز ہے۔ انہوں نے اتنا دودھ دوہا کہ ہم دونوں نے نہایت آسودہ ہو کر پیا اور بڑے آرام سے رات گزاری۔ ان کا بیان ہے کہ صبح ہوئی تو میرے شوہر نے کہا حلیمہ! خدا کی قسم تم نے ایک بابرکت روح حاصل کی ہے۔ میں نے کہا: مجھے بھی یہی توقع ہے۔

حلیمہؓ کہتی ہیں کہ اس کے بعد ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ میں اپنی اسی خستہ حال گدھی پر سوار ہوئی اور اس بچے کو بھی اپنے ساتھ لیا، لیکن اب وہی گدھی خدا کی قسم پورے قافلے کو کاٹ کر اس طرح آگے نکل گئی کہ کوئی گدھا اس کا ساتھ نہ پکڑ سکا۔ یہاں تک میری سہیلیاں مجھ سے کہنے لگیں "او! ابوذویب کی بیٹی! ارے یہ کیا ہے؟ ذرا ہم پر مہربانی کر۔ آخر یہ تیری وہی گدھی تو ہے جس پر تُو سوار ہو کر آئی تھی؟" میں کہتی "ہاں ہاں! بخدا یہ وہی ہے۔" وہ کہتیں "اس کا یقیناً کوئی خاص معاملہ ہے۔"

پھر ہم بنو سعد میں اپنے گھروں کو آ گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اللہ کی روئے زمین کا کوئی خطہ ہمارے علاقے سے زیادہ قحط زدہ تھا۔ لیکن ہماری واپسی کے بعد میری بکریاں چرنے جاتیں تو آسودہ حال اور دودھ سے بھرپور واپس آتیں۔ ہم دوہتے اور پیتے۔ جبکہ کسی اور انسان کو دودھ کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوتا۔ ان کے جانوروں کے تھنوں میں دودھ سرے سے رہتا ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ ہماری قوم کے شہری اپنے چرواہوں سے کہتے کہ کم بختو! جانور وہیں چرانے لے جایا کرو جہاں ابو ذویب کی بیٹی کا چرواہا لے جاتا ہے ـــــ لیکن تب بھی ان کی بکریاں بھوکی واپس آتیں۔ ان کے اندر ایک قطرہ دودھ نہ رہتا جبکہ میری بکریاں آسودہ اور دودھ سے بھرپور پلٹتیں۔ اس طرح ہم اللہ کی طرف سے مسلسل اضافے اور خیر کا مشاہدہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس بچے کے دو سال پورے ہو گئے اور میں نے دودھ چھڑا دیا۔ یہ بچہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس طرح بڑھ رہا تھا کہ دو سال پورے ہوتے ہوتے وہ کڑا اور گٹھیلا ہو چلا۔ اس کے بعد ہم اس بچے کو اس کی والدہ کے پاس لے گئے۔ لیکن ہم اس کی جو برکت دیکھتے آئے تھے اس کی وجہ سے ہماری انتہائی خواہش یہی تھی کہ وہ ہمارے پاس رہے۔ چنانچہ ہم نے اس کی ماں سے گفتگو کی۔ میں نے کہا: کیوں نہ آپ اپنے بچے کو میرے پاس ہی رہنے دیں کہ ذرا مضبوط ہو جائے، کیونکہ مجھے اس کے متعلق مکہ کی وبا کا خطرہ ہے۔ غرض ہمارے مسلسل اصرار پر انہوں نے بچہ ہمیں واپس دے دیا۔[۸]

واقعۂ شقِ صدر

اس طرح رسول اللہ ﷺ مدت رضاعت ختم ہونے کے بعد بھی بنو سعد ہی میں رہے یہاں تک کہ ولادت کے چوتھے یا پانچویں[۹] سال شقِ صدر (سینہ مبارک چاک کئے جانے) کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضرت جبریلؑ نے آپ کو پکڑ کر لٹایا اور سینہ چاک کر کے دل نکالا پھر دل سے ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا یہ تم سے شیطان کا حصہ ہے پھر دل کو ایک طشت میں زمزم کے پانی سے دھویا اور پھر اسے جوڑ کر اس کی جگہ لوٹا دیا۔ ادھر بچے دوڑ کر آپؐ کی ماں یعنی دایہ کے پاس پہنچے

---

۸ ابن ہشام ۱/۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴۔

۹ عام سیرت نگاروں کا یہی قول ہے لیکن ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ تیسرے سال کا ہے دیکھئے ابن ہشام ۱/۱۶۴، ۱۶۵۔

اور کہنے لگے: محمد قتل کر دیا گیا۔ ان کے گھر کے لوگ جھٹ پٹ پہنچے، دیکھا تو آپ کا رنگ اترا ہوا تھا۔[۱۰]

ماں کی آغوشِ محبت میں

اس واقعے کے بعد حلیمہؓ کو خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے آپ کو آپ کی ماں کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ آپ چھ سال کی عمر تک والدہ ہی کی آغوشِ محبت میں رہے۔[۱۱]

ادھر حضرت آمنہ کا ارادہ ہوا کہ وہ اپنے متوفی شوہر کی یادِ وفا میں یثرب جا کر ان کی قبر کی زیارت کریں۔ چنانچہ وہ اپنے یتیم بچے محمد ﷺ اپنی خادمہ اُمِّ ایمن اور اپنے سرپرست عبدالمطلب کی معیت میں کوئی پانچ سو کیلومیٹر کی مسافت طے کر کے مدینہ تشریف لے گئیں اور وہاں ایک ماہ تک قیام کر کے واپس ہوئیں، لیکن ابھی ابتداء راہ میں تھیں کہ بیماری نے آلیا۔ پھر یہ بیماری شدت اختیار کرتی گئی یہاں تک کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام اَبْوَاء میں پہنچ کر رحلت کر گئیں۔[۱۲]

دادا کے سایۂ شفقت میں

بوڑھے عبدالمطلب اپنے پوتے کو لے کر مکہ پہنچے۔ ان کا دل اپنے اس یتیم پوتے کی محبت و شفقت کے جذبات سے تپ رہا تھا۔ کیونکہ اب اسے ایک نیا چرکا لگا تھا جس نے پرانے زخم کرید دیئے تھے۔ عبدالمطلب کے جذبات میں پوتے کے لیے ایسی رقت تھی کہ ان کی اپنی صلبی اولاد میں سے بھی کسی کے لیے ایسی رقت نہ تھی۔ چنانچہ قسمت نے آپ کو تنہائی کے جس صحرا میں لا کھڑا کیا تھا عبدالمطلب اس میں آپ کو تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ آپ کو اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہتے اور بڑوں کی طرح ان کا احترام کرتے تھے۔ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ عبدالمطلب کے لیے خانہ کعبہ کے سائے میں فرش بچھایا جاتا۔ ان کے سارے لڑکے فرش کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ عبدالمطلب تشریف لاتے تو فرش پر بیٹھتے۔ ان کی عظمت کے پیشِ نظر ان کا کوئی لڑکا فرش پر نہ بیٹھتا لیکن رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے تو فرش ہی پر بیٹھ جاتے۔ ابھی آپ کم عمر بچے تھے۔ آپ کے چچا حضرات آپ کو پکڑ کر اتار دیتے۔ لیکن جب عبدالمطلب انہیں ایسا کرتے دیکھتے تو فرماتے، میرے اس بیٹے کو چھوڑ دو۔ بخدا اس کی شان نرالی ہے، پھر انہیں اپنے ساتھ اپنے فرش پر بٹھا لیتے۔ اپنے ہاتھ سے پیٹھ سہلاتے اور ان کی نقل و حرکت دیکھ کر خوش ہوتے۔[۱۳]

آپ کی عمر ابھی ۸ سال دو مہینے دس دن کی ہوئی تھی کہ دادا عبدالمطلب کا بھی سایۂ شفقت اٹھ

---

[۱۰] صحیح مسلم باب الاسراء ۱/۹۲ - [۱۱] تلقیح الفہوم ص۷ - ابن ہشام ۱/۱۶۹ -

[۱۲] ابن ہشام ۱/۱۶۸ تلقیح الفہوم ص۷ - تاریخ خضری ۱/۶۲ فقہ السیرۃ غزالی ص۵۰ [۱۳] ابن ہشام ۱/۱۶۹

گیا۔ ان کا انتقال مکہ میں ہوا اور وہ وفات سے پہلے آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کو — جو آپ کے والد عبداللہ کے سگے بھائی تھے، آپ کی کفالت کی وصیت کر گئے تھے۔[۱۴]

شفیق چچا کی کفالت میں

ابوطالب نے اپنے بھتیجے کا حق کفالت بڑی خوبی سے ادا کیا، آپ کو اپنی اولاد میں شامل کیا، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر مانا۔ مزید اعزاز و احترام سے نوازا۔ چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قوت پہنچائی اپنی حمایت کا سایہ دراز رکھا اور آپ ہی کی بنیاد پر دوستی اور دشمنی کی مزید وضاحت اپنی جگہ آ رہی ہے۔

رُوئے مُبارک سے فیضانِ باراں کی طلب

ابنِ عساکر نے جلہمہ بن عرفطہ سے روایت کی ہے کہ میں مکہ آیا۔ لوگ قحط سے دوچار تھے۔ قریش نے کہا: ابوطالب! وادی قحط کا شکار ہے۔ بال بچے کال کی زد میں ہیں۔ چلیے بارش کی دعا کیجیے۔ ابوطالب ایک بچہ ساتھ لے کر برآمد ہوئے۔ بچہ ابر آلود سورج معلوم ہوتا تھا۔ جس سے گھنا بادل ابھی ابھی چھٹا ہو۔ اس کے ارد گرد اور بھی بچے تھے۔ ابوطالب نے اس بچے کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پیٹھ کعبہ کی دیوار سے ٹیک دی۔ بچے نے ان کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نہ تھا۔ لیکن (دیکھتے دیکھتے) اِدھر اُدھر سے بادل کی آمد شروع ہو گئی اور ایسی دھواں دھار بارش ہوئی کہ وادی میں سیلاب آ گیا اور شہر و بیاباں شاداب ہو گئے۔ بعد میں ابوطالب نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد ﷺ کی مدح میں کہا تھا۔

وابیض یُستَسقَی الغَمامُ بوجهه ثمالُ الیَتامٰی عِصمَةٌ للأرامِلِ[۱۵]

"وہ خوبصورت ہیں۔ ان کے چہرے سے بارش کا فیضان طلب کیا جاتا ہے۔ یتیموں کے ماویٰ اور بیواؤں کے محافظ ہیں۔"

بحیرا راہب

بعض روایات کے مطابق — جن کی استنادی حیثیت مشکوک ہے — جب آپ کی عمر بارہ برس اور ایک تفصیلی قول کے مطابق بارہ برس دو مہینے دس دن[۱۶] کی ہو گئی تو ابوطالب آپ کو ساتھ لے کر تجارت کے لیے ملکِ شام کے سفر پر نکلے اور بصریٰ پہنچے۔ بصریٰ شام کا ایک مقام اور حوران کا مرکزی شہر ہے۔ اس وقت یہ جزیرۃ العرب کے

---

[۱۴] تلقیح الفہوم ص۷۔ ابن ہشام ۱/۱۴۹ [۱۵] مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ ص ۱۵، ۱۶

[۱۶] یہ بات ابن جوزی نے تلقیح الفہوم ص۷ میں کہی ہے۔

رومی مقبوضات کا دارالحکومت تھا۔ اس شہر میں جرجیس نامی ایک راہب رہتا تھا جو بُحیرا کے لقب سے معروف تھا۔ جب قافلے نے وہاں پڑاؤ ڈالا تو یہ راہب اپنے گرجا سے نکل کر قافلے کے اندر آیا اور اس کی میزبانی کی حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی نہیں نکلتا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کے اوصاف کی بناء پر پہچان لیا اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: یہ سید العالمین ہیں۔ اللہ انہیں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گا۔ ابوطالب نے کہا: آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا: تم لوگ جب گھاٹی کے اس جانب نمودار ہوئے تو کوئی بھی درخت یا پتھر ایسا نہیں تھا جو سجدہ کے لیے جھک نہ گیا ہو اور یہ چیزیں نبی کے علاوہ کسی اور انسان کو سجدہ نہیں کرتیں۔ پھر میں انہیں مُہرِ نبوت سے پہچانتا ہوں جو کندھے کے نیچے کری (نرم ہڈی) کے پاس سیب کی طرح ہے اور ہم انہیں اپنی کتابوں میں بھی پاتے ہیں۔

اس کے بعد بُحیرا راہب نے ابوطالب سے کہا کہ انہیں واپس کر دو ملکِ شام نہ لے جاؤ کیونکہ یہود سے خطرہ ہے۔ اس پر ابوطالب نے بعض غلاموں کی معیت میں آپ کو مکہ واپس بھیج دیا۔[۱۷]

جنگ فجار

آپ کی عمر پندرہ برس کی ہوئی تو جنگ فجار پیش آئی۔ اس جنگ میں ایک طرف قریش اور ان کے ساتھ بنو کنانہ تھے اور دوسری طرف قیس عیلان تھے۔ قریش اور کنانہ کا کمانڈر حرب بن اُمیہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنے سن و شرف کی وجہ سے قریش و کنانہ کے نزدیک بڑا مرتبہ رکھتا تھا۔ پہلے پہر کنانہ پر قیس کا پلہ بھاری تھا لیکن دوپہر ہوتے ہوتے قیس پر کنانہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اسے حرب فجار اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں حرم اور حرام مہینے دونوں کی حرمت چاک کی گئی۔ اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لے گئے تھے اور اپنے چچاؤں کو تیر تھماتے تھے۔[۱۸]

حلف الفضول

اس جنگ کے بعد ایک حرمت والے مہینے ذی قعدہ میں حلف الفضول پیش آئی۔ چند قبائل قریش یعنی بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی اسد بن عبدالعزیٰ

---

۱۷ مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ ص ۱۶ ، ابن ہشام ۱/ ۱۷۹ تا ۱۸۲ ، ترمذی وغیرہ کی روایت میں مذکور ہے کہ آپ کو حضرت بلالؓ کی معیت میں روانہ کیا گیا لیکن یہ فاش غلطی ہے۔ بلال تو اس وقت غالباً پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور اگر پیدا ہوئے تھے تو بھی بہرحال ابوطالب یا ابوبکرؓ کے ساتھ نہ تھے۔ زاد المعاد ۱/ ۱۷۔

۱۸ ابن ہشام ۱/ ۱۸۳ تا ۱۸۶ قلب جزیرۃ العرب ص ۳۶۰ تاریخ خضری ۱/ ۶۳

بنی زہرہ بن کلاب اور بنی تیم بن مرّہ نے اس کا اہتمام کیا۔ یہ لوگ عبداللہ بن جُدعان تیمی کے مکان پر جمع ہوئے ـــــ کیونکہ وہ سن و شرف میں ممتاز تھا ـــــ اور آپس میں عہد و پیمان کیا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا۔ خواہ مکے کا رہنے والا ہو یا کہیں اور کا یہ سب اس کی مدد اور حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کا حق دلوا کر رہیں گے۔ اس اجتماع میں رسُول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے اور بعد میں شرفِ رسالت سے مشرف ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے: "میں عبداللہ بن جُدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سُرخ اُونٹ بھی پسند نہیں اور اگر (دَور) اسلام میں اس عہد و پیمان کے لیے مجھے بلایا جاتا تو میں لبیک کہتا"[19]

اس معاہدے کی روح عصبیت کی تہ سے اٹھنے والی جاہلی حمیت کے منافی تھی۔ اس معاہدے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ زبید کا ایک آدمی سامان لے کر مکہ آیا اور عاص بن وائل نے اس سے سامان خریدا۔ لیکن اس کا حق روک لیا۔ اس نے حلیف قبائل عبدالدار، مخزوم، جمح، سہم اور عدی سے مدد کی درخواست کی۔ لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ اس کے بعد اس نے جبلِ ابوقبیس پر چڑھ کر بلند آواز سے چند اشعار پڑھے۔ جن میں اپنی داستانِ مظلومیت بیان کی تھی۔ اس پر زبیر بن عبدالمطلب نے دوڑ دھوپ کی اور کہا کہ یہ شخص بے یار و مددگار کیوں ہے؟ ان کی کوشش سے اوپر ذکر کئے ہوئے قبائل جمع ہو گئے۔ پہلے معاہدہ طے کیا اور پھر عاص بن وائل سے اس زبیدی کا حق دلایا[20]

جفاکشی کی زندگی

عنفوانِ شباب میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی معین کام نہ تھا، البتہ یہ خبر متواتر ہے کہ آپ بکریاں چراتے تھے۔ آپ ﷺ نے بنی سعد کی بکریاں چرائیں[21] اور مکہ میں بھی اہل مکہ کی بکریاں چند قیراط کے عوض چراتے رہے[22]۔ پچیس سال کی عمر ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر تجارت کے لیے ملکِ شام تشریف لے گئے۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ خدیجہ بنت خُوَیلد ایک معزز مالدار اور تاجر خاتون تھیں۔ لوگوں کو اپنا مال تجارت کے لیے دیتی تھیں اور مضاربت کے اصول پر ایک حصہ طے کر لیتی تھیں۔ پورا قبیلہ قریش ہی تاجر پیشہ تھا۔ جب انہیں

---

[19] ابن ہشام ۱/۱۳۳، ۱۳۵ مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ ص ۳۰، ۳۱۔

[20] ایضاً مختصر السیرہ ص ۳۰، ۳۱۔ [21] ابن ہشام ۱/۱۶۶۔

[22] صحیح بخاری۔ الاجارات، باب رعی الغنم علی قراریط ۱/۳۰۱۔

رسول اللہ ﷺ کی راست گوئی امانت اور مکارمِ اخلاق کا علم ہوا تو انہوں نے ایک پیغام کے ذریعے پیش کش کی کہ آپ ان کا مال لے کر تجارت کے لیے ان کے غلام میسرہ کے ساتھ ملکِ شام تشریف لے جائیں۔ وہ دوسرے تاجروں کو جو کچھ دیتی ہیں اس سے بہتر اجرت آپ کو دیں گی۔ آپ نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ اور اُن کا مال لے کر ان کے غلام میسرہ کے ساتھ ملک شام تشریف لے گئے۔[۲۳]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی

جب آپ مکہ واپس تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مال میں ایسی امانت و برکت دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور ادھر ان کے غلام میسرہ نے آپ کے شیریں اخلاق، بلند پایہ کردار موزوں اندازِ فکر راست گوئی اور امانت دارانہ طور طریق کے متعلق اپنے مشاہدات بیان کیے تو حضرت خدیجہؓ کو اپنا گم گشتہ گوہرِ مطلوب دستیاب ہو گیا ـــــ اُس سے پہلے بڑے بڑے سردار اور رئیس ان سے شادی کے خواہاں تھے۔ لیکن انہوں نے کسی کا پیغام منظور نہ کیا تھا۔ اب انہوں نے اپنے دل کی بات اپنی سہیلی نفیسہ بنت منیہ سے کہی اور نفیسہ نے جا کر نبی ﷺ سے گفت و شنید کی۔ آپ ﷺ راضی ہو گئے اور اپنے چچاؤں سے اس معاملے میں بات کی۔ انہوں نے حضرت خدیجہؓ کے چچا سے بات کی اور شادی کا پیغام دیا۔ اسکے بعد شادی ہو گئی۔ نکاح میں بنی ہاشم اور رؤسائے مُضَر شریک ہُوئے ـــــ

یہ ملکِ شام سے واپسی کے دو مہینے بعد کی بات ہے۔ آپ ﷺ نے مہر میں بیس اُونٹ دیئے۔ اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی اور وہ نسب و دولت اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے اپنی قوم کی سب سے معزز اور افضل خاتون تھیں۔ یہ پہلی خاتون تھیں جن سے رسُول اللہ ﷺ نے شادی کی اور ان کی وفات تک کسی دوسری خاتون سے شادی نہیں کی۔[۲۴]

ابراہیم کے علاوہ رسُول اللہ ﷺ کی بقیہ تمام اولاد انہی کے بطن سے تھی۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے اور انہی کے نام پر آپ کی کنیت ابوالقاسم پڑی۔ پھر زینبؓ، رقیہؓ، اُم کلثومؓ فاطمہؓ اور عبداللہ پیدا ہُوئے۔ عبداللہ کا لقب طیّب اور طاہر تھا۔ آپ ﷺ کے سب بچے

---

۲۳ ابن ہشام ۱/ ۱۸۰، ۱۸۱۔

۲۴ ابن ہشام ۱/ ۱۸۹، ۱۹۰ فقہ السیرۃ ص ۵۹ تلقیح الفہوم ص

بچپن ہی میں انتقال کر گئے البتہ بچیوں میں سے ہر ایک نے اسلام کا زمانہ پایا، مسلمان ہوئیں اور ہجرت کے شرف سے مشرف ہوئیں لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا باقی سب کا انتقال آپ کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ حضرت فاطمہ کی وفات آپ کی رحلت کے چھ ماہ بعد ہوئی۔[۲۵]

کعبہ کی تعمیر اور حجرِ اسود کے تنازعہ کا فیصلہ

آپ ﷺ کی عمر کا پینتیسواں سال تھا کہ قریش نے نئے سرے سے خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ وجہ یہ تھی کہ کعبہ صرف قد سے کچھ اونچی چہار دیواری کی شکل میں تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے ہی سے اس کی بلندی ۹ ہاتھ تھی اور اس پر چھت نہ تھی۔ اس کیفیت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ چوروں نے اس کے اندر رکھا ہوا خزانہ چرا لیا —— اس کے علاوہ اس کی تعمیر پر ایک طویل زمانہ گذر چکا تھا۔ عمارت خستگی کا شکار ہو چکی تھی اور دیواریں پھٹ گئی تھیں۔ ادھر اسی سال ایک زوردار سیلاب آیا جس کے بہاؤ کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف تھا۔ اس کے نتیجے میں خانہ کعبہ کسی بھی لمحے ڈھ سکتا تھا۔ اس لیے قریش مجبور ہو گئے کہ اس کا مرتبہ و مقام برقرار رکھنے کے لیے اسے ازسرِ نو تعمیر کریں۔

اس مرحلے پر قریش نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں صرف حلال رقم ہی استعمال کریں گے۔ اس میں رنڈی کی اُجرت، سُود کی دولت اور کسی کا ناحق لیا ہوا مال استعمال نہیں ہونے دیں گے۔

نئی تعمیر کے لیے پرانی عمارت کو ڈھانا ضروری تھا، لیکن کسی کو ڈھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی بالآخر ولید بن مغیرہ مخزومی نے ابتدا کی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ اس پر کوئی آفت نہیں ٹوٹی تو باقی لوگوں نے بھی ڈھانا شروع کیا اور جب قواعد ابراہیم تک ڈھا چکے تو تعمیر کا آغاز کیا۔ تعمیر کے لیے الگ الگ ہر قبیلے کا حصہ مقرر تھا اور ہر قبیلے نے علیحدہ علیحدہ پتھر کے ڈھیر لگا رکھے تھے۔ تعمیر شروع ہوئی۔ باقوم نامی ایک رومی معمار نگراں تھا۔ جب عمارت حجرِ اسود تک بلند ہو چکی تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ حجرِ اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا شرف و امتیاز کسے حاصل ہو۔ یہ جھگڑا چار پانچ روز تک جاری رہا اور رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ معلوم ہوتا تھا سرزمینِ حرم میں سخت خون خرابہ ہو جائے گا۔ لیکن ابو اُمیہ مخزومی نے یہ کہہ کر فیصلے کی ایک صورت پیدا کر دی کہ مسجدِ حرام کے دروازے سے دوسرے دن جو سب سے پہلے داخل ہو اسے اپنے

---

۲۵ ابن ہشام ۱/۱۹۰، ۱۹۱ فقہ السیرۃ ص ۶۰ فتح الباری ۷/۱۰۵۔ تاریخی مصادر میں قدرے اختلاف ہے میرے نزدیک جو راجح ہے میں نے اسی کو درج کیا ہے۔

جھگڑے کا حکم مان لیں۔ لوگوں نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اللہ کی مشیت کہ اس کے بعد سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ لوگوں نے آپؐ کو دیکھا تو چیخ پڑے کہ ھٰذا الامین رضیناہ ھٰذا محمد ﷺ "یہ امین ہیں۔ ہم ان سے راضی ہیں یہ محمد ﷺ ہیں" پھر جب آپ ان کے قریب پہنچے اور انہوں نے آپؐ کو معاملے کی تفصیل بتائی تو آپؐ نے ایک چادر طلب کی بیچ میں حجرِ اسود رکھا اور متنازعہ قبائل کے سرداروں سے کہا کہ آپ سب حضرات چادر کا کنارہ پکڑ کر اُوپر اٹھائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب چادر حجرِ اسود کے مقام تک پہنچ گئی تو آپؐ نے اپنے دست مبارک سے حجرِ اسود کو اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا یہ بڑا معقول فیصلہ تھا۔ اس پر ساری قوم راضی ہو گئی۔

ادھر قریش کے پاس مالِ حلال کی کمی پڑ گئی اس لیے انہوں نے شمال کی طرف سے کعبہ کی لمبائی تقریباً چھ ہاتھ کم کر دی۔ یہی ٹکڑا حجر اور حطیم کہلاتا ہے۔ اس دفعہ قریش نے کعبہ کا دروازہ زمین سے خاصا بلند کر دیا تاکہ اس میں وہی شخص داخل ہو سکے جسے وہ اجازت دیں۔ جب دیواریں پندرہ ہاتھ بلند ہو گئیں تو اندر چھ ستون کھڑے کر کے اوپر سے چھت ڈال دی گئی اور کعبہ اپنی تکمیل کے بعد قریب قریب چوکور شکل کا ہو گیا۔ اب خانہ کعبہ کی بلندی پندرہ میٹر ہے۔ حجرِ اسود والی دیوار اور اس کے سامنے کی دیوار یعنی جنوبی اور شمالی دیواریں دس دس میٹر ہیں۔ حجرِ اسود مطاف کی زمین سے ڈیڑھ میٹر کی بلندی پر ہے۔ دروازے والی دیوار اور اس کے سامنے کی دیوار یعنی پورب اور پچھم کی دیواریں ۱۲—۱۲ میٹر ہیں۔ دروازہ زمین سے دو میٹر بلند ہے۔ دیوار کے گرد نیچے ہر چہار جانب سے ایک بڑھتے ہوئے کرسی نما ضلعے کا گھیرا ہے جس کی اوسط اونچائی ۲۵ سینٹی میٹر اور اوسط چوڑائی ۳۰ سینٹی میٹر ہے۔ اسے شاذروان کہتے ہیں۔ یہ بھی دراصل بیت اللہ کا جزو ہے لیکن قریش نے اسے بھی چھوڑ دیا تھا۔[۲۶]

نبوت سے پہلے کی اجمالی سیرت

نبی ﷺ کا وجود ان تمام خوبیوں اور کمالات کا جامع تھا جو متفرق طور پر لوگوں کے مختلف طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ آپ ﷺ اصابتِ فکر، دُور بینی اور حق پسندی کا بلند مینار تھے۔ آپ ﷺ کو حُسنِ فراست، پختگیٔ فکر اور

---

۲۶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام ۱/۱۹۲ تا ۱۹۷، فقہ السیرۃ ص ۶۲، ۶۳۔ صحیح بخاری باب فضل مکۃ وبنیانہا ۱/۲۱۵، تاریخ خضری ۱/۶۴، ۶۵۔

وسیلہ و مقصد کی درستگی سے حظِ وافر عطا ہوا تھا۔ آپ ﷺ اپنی طویل خاموشی سے مسلسل غور و خوض، دائمی تفکیر اور حق کی کرید میں مدد لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی شاداب عقل اور روشن فطرت سے زندگی کے صحیفے، لوگوں کے معاملات اور جماعتوں کے احوال کا مطالعہ کیا اور جن خرافات میں یہ سب لت پت تھیں ان سے سخت بیزاری محسوس کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سب سے دامن کش رہتے ہوئے پوری بصیرت کے ساتھ لوگوں کے درمیان زندگی کا سفر طے کیا یعنی لوگوں کا جو کام اچھا ہوتا اس میں شرکت فرماتے ورنہ اپنی مقررہ تنہائی کی طرف پلٹ جاتے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے شراب کو کبھی منہ نہ لگایا، آستانوں کا ذبیحہ نہ کھایا اور بتوں کے لیے منائے جانے والے تہوار اور میلوں ٹھیلوں میں کبھی شرکت نہ کی۔

آپؐ کو شروع ہی سے ان باطل معبودوں سے اتنی نفرت تھی کہ ان سے بڑھ کر آپ کی نظر میں کوئی چیز مبغوض نہ تھی حتیٰ کہ لات و عزیٰ کی قسم سننا بھی آپ کو گوارا نہ تھا۔[۲۷]

اس میں شبہ نہیں کہ تقدیر نے آپ پر حفاظت کا سایہ ڈال رکھا تھا۔ چنانچہ جب بعض دنیاوی تمتعات کے حصول کے لیے نفس کے جذبات متحرک ہوئے یا بعض ناپسندیدہ رسم و رواج کی پیروی پر طبیعت آمادہ ہوئی تو عنایتِ ربانی دخیل ہو کر رکاوٹ بن گئی۔ ابن اثیر کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اہل جاہلیت جو کام کرتے تھے مجھے دو دفعہ کے علاوہ کبھی ان کا خیال نہیں گذرا لیکن ان دونوں میں سے بھی ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے میرے اور اس کام کے درمیان رکاوٹ ڈال دی۔ اس کے بعد پھر کبھی مجھے اس کا خیال نہ گذرا یہاں تک کہ اللہ نے مجھے اپنی پیغمبری سے مشرف فرما دیا۔ ہوا یہ کہ جو لڑکا بالائی مکہ میں میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا اس سے ایک رات میں نے کہا: کیوں نہ تم میری بکریاں دیکھو اور میں مکہ جا کر دوسرے جوانوں کی طرح وہاں کی شبانہ قصہ گوئی کی محفل میں شرکت کر لوں! اس نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کے بعد میں نکلا اور ابھی مکہ کے پہلے ہی گھر کے پاس پہنچا تھا کہ باجے کی آواز سنائی پڑی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا فلاں کی فلاں سے شادی ہے۔ میں سننے بیٹھ گیا اور اللہ نے میرا کان بند کر دیا اور میں سو گیا۔ پھر سورج کی تمازت ہی سے میری آنکھ کھلی اور میں اپنے ساتھی کے پاس واپس چلا گیا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے تفصیلات بتائیں۔ اس کے بعد ایک رات پھر میں نے یہی بات کہی اور مکہ پہنچا تو پھر اسی رات کی طرح کا واقعہ

---

[۲۷] بحیرا کے واقعہ میں اس کی دلیل موجود ہے۔ دیکھئے ابن ہشام ۱/۱۲۸

پیش آیا اور اسکے بعد پھر کبھی غلط ارادہ نہ ہوا۔[۲۸]

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ جب کعبہ تعمیر کیا گیا تو نبی ﷺ اور حضرت عباسؓ پتھر ڈھو رہے تھے۔ حضرت عباسؓ نے نبی ﷺ سے کہا: اپنا تہبند اپنے کندھے پر رکھ لو، پتھر سے حفاظت رہے گی، لیکن جونہی آپؐ نے ایسا کیا آپؐ زمین پر جا گرے۔ نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ افاقہ ہوتے ہی آواز لگائی: میرا تہبند۔ میرا تہبند اور آپ کا تہبند آپ کو باندھ دیا گیا۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اس کے بعد آپ کی شرمگاہ کبھی نہیں دیکھی گئی۔[۲۹]

نبی ﷺ اپنی قوم میں شیریں کردار، فاضلانہ اخلاق اور کریمانہ عادات کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ چنانچہ آپ سب سے زیادہ بامروت، سب سے خوش اخلاق، سب سے معزز ہمسایہ، سب سے بڑھ کر دُور اندیش، سب سے زیادہ راست گو، سب سے نرم پہلو، سب سے زیادہ پاک نفس، خیر میں سب سے زیادہ کریم، سب سے نیک عمل، سب سے بڑھ کر پابندِ عہد اور سب سے بڑے امانت دار تھے، حتیٰ کہ آپ کی قوم نے آپ کا نام ہی "امین" رکھ دیا تھا کیونکہ آپ احوالِ صالحہ اور خصالِ حمیدہ کا پیکر تھے۔ اور جیسا کہ حضرت خدیجہؓ کی شہادت ہے "آپ ﷺ درماندوں کا بوجھ اٹھاتے تھے، تہی دستوں کا بندوبست فرماتے تھے، مہمان کی میزبانی کرتے تھے اور مصائبِ حق میں اعانت فرماتے تھے"۔[۳۰]

○

---

۲۸ اس حدیث کو حاکم ذہبی نے صحیح کہا ہے لیکن ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ۲/۲۰۶ میں اس کی تضعیف کی ہے۔

۲۹ صحیح بخاری باب بنیان الکعبہ ۱/۵۴۳ ۳۰ صحیح بخاری ۱/۳۔

نبوّت و رسالت کی چھاؤں میں

غارِ حرا کے اندر

رسول اللہ ﷺ کی عمر شریف جب چالیس برس کے قریب ہو چلی ـــــ اور اس دوران آپ ﷺ کے اب تک کے تاملات نے قوم سے آپ ﷺ کا ذہنی اور فکری فاصلہ بہت وسیع کر دیا تھا ـــــ تو آپ ﷺ کو تنہائی محبوب ہو گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ ستو اور پانی لے کر مکہ سے کوئی دو میل دور کوہ حرا کے ایک غار میں جا رہتے ـــــ یہ ایک مختصر سا غار ہے جس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز ہے۔ یہ نیچے کی جانب گہرا نہیں ہے بلکہ ایک مختصر راستے کے بازو میں اوپر کی چٹانوں کے باہم ملنے سے ایک کوتل کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔

ـــــ آپ ﷺ جب یہاں تشریف لے جاتے تو حضرت خدیجہؓ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ جاتیں اور قریب ہی کسی جگہ موجود رہتیں۔ آپ ﷺ رمضان بھر اس غار میں قیام فرماتے۔ آنے جانے والے مسکینوں کو کھانا کھلاتے اور بقیہ اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے۔ کائنات کے مشاہدہ اور اس کے پیچھے کارفرما قدرتِ نادرہ پر غور فرماتے۔ آپ ﷺ کو اپنی قوم کے پیچ در پیچ شرکیہ عقائد اور واہیات تصورات پر بالکل اطمینان نہ تھا لیکن آپ ﷺ کے سامنے کوئی واضح راستہ، معیّن طریقہ اور افراط و تفریط سے ہٹی ہوئی کوئی ایسی راہ نہ تھی جس پر آپ ﷺ اطمینان و انشراحِ قلب کے ساتھ رواں دواں ہو سکتے۔[1]

نبی ﷺ کی یہ تنہائی پسندی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ایک حصہ تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ آپ کو آنے والے کارِ عظیم کے لیے تیار کر رہا تھا۔ درحقیقت جس روح کے لیے بھی یہ مقدر ہو کہ وہ انسانی زندگی کے حقائق پر اثر انداز ہو کر ان کا رُخ بدل ڈالے اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین کے مشاغل، زندگی کے شور اور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے ہم و غم کی دنیا سے کٹ کر کچھ عرصے کے لیے الگ تھلگ اور خلوت نشین رہے۔

ٹھیک اسی سنّت کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو امانتِ کبریٰ کا بوجھ اٹھانے، روئے زمین کو بدلنے اور خطِ تاریخ کو موڑنے کے لیے تیار کرنا چاہا تو رسالت کی ذمہ داری عائد کرنے

---

[1] رحمۃ للعالمین ۱/۴۷، ابن ہشام ۱/۲۳۵، ۲۳۶، فی ظلال القرآن پارہ ۲۹/۱۶۶۔

سے تین سال پہلے آپ ﷺ کے لیے خلوت نشینی مقدر کر دی۔ آپ ﷺ اس خلوت میں ایک ماہ تک کائنات کی آزاد روح کے ساتھ ہم سفر رہتے اور اس وجود کے پیچھے چھپے ہوئے غیب کے اندر تدبر فرماتے تاکہ جب اللہ تعالیٰ کا اذن ہو تو اس غیب کے ساتھ تعامل کیلئے مستعد رہیں۔[۲]

جبریلؑ وحی لاتے ہیں

جب آپ ﷺ کی عمر چالیس برس ہو گئی ـــ اور یہی سنِ کمال ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی پیغمبروں کی بعثت کی عمر ہے ـــ تو زندگی کے افق کے پار سے آثارِ نبوت چمکنا اور جگمگانا شروع ہوئے۔ یہ آثار خواب تھے۔ آپ ﷺ جو بھی خواب دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہوتا۔ اس حالت پر چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا ـــ جو مدتِ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے اور کل مدتِ نبوت تیئس برس ہے ـــ اس کے بعد جب حرا میں خلوت نشینی کا تیسرا سال آیا تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ روئے زمین کے باشندوں پر اس کی رحمت کا فیضان ہو۔ چنانچہ اس نے آپ ﷺ کو نبوت سے مشرف کیا اور حضرت جبریل علیہ السلام قرآن مجید کی چند آیات لے کر آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے۔[۳]

دلائل و قرائن پر ایک جامع نگاہ ڈال کر حضرت جبریل علیہ السلام کی تشریف آوری کے اس واقعے کی تاریخ معین کی جا سکتی ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق یہ واقعہ رمضان المبارک کی ۲۱ تاریخ کو دوشنبہ کی رات میں پیش آیا۔ اس روز اگست کی ۱۰ تاریخ تھی اور سنہ ۶۱۰ء تھا۔ قمری حساب سے نبی ﷺ کی عمر چالیس سال چھ مہینے بارہ دن اور شمسی حساب سے ۳۹ سال تین مہینے ۲۲ دن تھی۔[۴]

---

[۲] فی ظلال القرآن پارہ ۲۹/۱۶۶، ۱۶۷ [۳] حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بیہقی نے یہ حکایت کی ہے کہ خواب کی مدت چھ ماہ تھی، لہٰذا خواب کے ذریعے نبوت کا آغاز چالیس سال کی عمر مکمل ہونے پر ماہ ربیع الاول میں ہوا جو آپ کی ولادت کا مہینہ ہے لیکن حالتِ بیداری میں آپ کے پاس وحی رمضان شریف میں آئی۔ (فتح الباری ۱/۲۷)

[۴] **آغازِ وحی کا مہینہ، دن اور تاریخ** مورخین میں بڑا اختلاف ہے کہ نبی ﷺ کس مہینے میں شرفِ نبوت اور اعزازِ وحی سے سرفراز ہوئے۔ بیشتر سیرت نگار کہتے ہیں کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ تھا، لیکن ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ رجب کا مہینہ تھا، (دیکھئے مختصر السیرہ از شیخ عبداللہ ص ۷۵) ہمارے نزدیک دوسرا قول زیادہ صحیح ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (۲/۱۸۵) "رمضان کا مہینہ ہی وہ (بابرکت) مہینہ ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا" اور ارشاد ہے إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (۹۷/۱) یعنی "ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا" اور معلوم ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے۔ یہی لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی مراد ہے إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۝ (۴۴/۳) "ہم نے قرآن مجید کو ایک بابرکت رات میں اتارا ہم لوگوں کو عذاب کے خطرے سے آگاہ کرنے والے ہیں"

(باقی اگلے صفحہ پر)

آیئے اب ذرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی اس واقعے کی تفصیلات سُنیں۔ یہ انوارِ لاہوت کا ایک ایسا شعلہ تھا جس سے کفر وضلالت کی تاریکیاں چھٹتی چلی گئیں، یہاں تک کہ زندگی کی رفتار بدل گئی اور تاریخ کا رُخ پلٹ گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا نیند میں اچھے خواب سے ہُوئی آپؐ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہوتا تھا۔ پھر آپؐ کو تنہائی محبوب ہوگئی۔ چنانچہ آپؐ غارِ حرا میں خلوت اختیار فرماتے اور کئی کئی رات گھر تشریف لائے بغیر مصروفِ عبادت رہتے۔ اس کے لیے آپؐ توشہ لے جاتے۔ پھر (توشہ ختم ہونے پر) حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور تقریباً اتنے ہی دنوں کیلئے پھر توشہ لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاس حق آیا اور آپؐ غارِ حرا میں تھے یعنی آپؐ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا پڑھو! آپؐ نے فرمایا' میں پڑھا ہوا نہیں ہوں' آپؐ فرماتے ہیں کہ اس پر اس نے مجھے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ میری قوت نچوڑ دی۔ پھر چھوڑ کر کہا' پڑھو! میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ پکڑ کر دبوچا۔ پھر چھوڑ کر کہا' پڑھو! میں نے پھر کہا میں پڑھا ہُوا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری بار پکڑ کر دبوچا پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ

(بقیہ نوٹ گذشتہ صفحہ) دوسرے قول کی ترجیح کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حرا میں رسول اللہ ﷺ کا قیام ماہِ رمضان میں ہوا کرتا تھا اور معلوم ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حرا ہی میں تشریف لاتے تھے۔

جو لوگ رمضان میں نزولِ وحی کے آغاز کے قائل ہیں ان میں پھر اختلاف ہے کہ اس دن رمضان کی کونسی تاریخ تھی۔ بعض سات کہتے ہیں، بعض سترہ اور بعض اٹھارہ (دیکھئے مختصر السیرہ صہ ۷۵، رحمۃ للعالمین ۱/۴۹) علامہ خضری کا اصرار ہے کہ یہ سترھویں تاریخ تھی۔ دیکھئے (تاریخ خضری ۱/۶۹، اور تاریخ التشریع الاسلامی صہ ۶۰۵، ۶۰۷)

میں نے ۲۱ تاریخ کو اس بنا پر ترجیح دی ہے ـــ حالانکہ مجھے اس کا کوئی قائل نظر نہیں آیا ـــ کہ بیشتر سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ آپ کی بعثت دوشنبہ کے روز ہوئی تھی اور اس کی تائید ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دوشنبہ کے دن کے روزے کی بابت دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا۔ اور جس میں مجھے پیغمبر بنایا گیا۔ یا جس میں مجھ پر وحی نازل کی گئی۔ (صحیح مسلم ۱/۳۶۸، مسند احمد ۵/۲۹۷، ۲۹۹، بیہقی ۴/۲۸۶، ۳۰۰، حاکم ۲/۶۰۲) ـــ اور اس سال رمضان میں دوشنبہ کا دن ۷، ۱۴، ۲۱، اور ۲۸ تاریخوں کو پڑتا تھا۔ ادھر صحیح روایات سے یہ بات ثابت اور متعین ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں پڑتی ہے، اور ان ہی طاق راتوں میں منتقل بھی ہوتی رہتی ہے۔ اب ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دیکھتے ہیں کہ ہم نے قرآن مجید کو لیلۃ القدر میں نازل کیا، دوسری طرف ابو قتادہؓ کی یہ روایت دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو دوشنبہ کے روز مبعوث فرمایا گیا، تیسری طرف تقویم کا حساب دیکھتے ہیں کہ اس سال رمضان میں دوشنبہ کا دن کن کن تاریخوں میں پڑا تھا تو متعین ہو جاتا ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت اکیسویں رمضان کی رات میں ہوئی۔ اس لیے یہی نزولِ وحی کی پہلی تاریخ ہے۔

مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا رب نہایت کریم ہے۔"

ان آیات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پلٹے۔ آپ ﷺ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔ انہوں نے آپ ﷺ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ خوف جاتا رہا۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے تو اپنی جان کا ڈر لگتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا قطعاً نہیں، بخدا آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ رسوا نہ کرے گا۔ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں درماندوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، تہی دستوں کا بندوبست کرتے ہیں، مہمان کی میزبانی کرتے ہیں اور حق کے مصائب پر اعانت کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ کے پاس لے گئیں۔ ورقہ دورِ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی میں لکھنا جانتے تھے چنانچہ عبرانی زبان میں حسبِ توفیقِ الٰہی انجیل لکھتے تھے۔ اُس وقت بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا بھائی جان! آپ اپنے بھتیجے کی بات سنیں۔ ورقہ نے کہا: بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرما دیا۔ اس پر ورقہ نے آپؐ سے کہا: یہ تو وہی ناموس ہے جسے اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں اس وقت توانا ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکال دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا! تو کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا، ہاں! جب بھی کوئی آدمی اس طرح کا پیغام لایا جیسا تم لائے ہو تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی اور اگر میں نے تمہارا زمانہ پا لیا تو تمہاری زبردست مدد کروں گا۔ اس کے بعد ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے اور وحی رک گئی۔[۶]

طبری اور ابن ہشام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اچانک وحی کی آمد کے بعد غارِ

---

[۵] آیتیں عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ تک نازل ہوئی تھیں۔ (۹۶: ۱-۵)

[۶] صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی ۱/۳، ۲/۳، الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہ روایت صحیح بخاری کتاب التفسیر اور تعبیر الرؤیا میں بھی مروی ہے۔

حرا سے نکلے تو پھر واپس آکر اپنی بقیہ مدت قیام پوری کی اس کے بعد مکہ تشریف لائے۔ طبری کی روایت سے آپ کے نکلنے کے سبب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ روایت یہ ہے:

رسول اللہ ﷺ نے وحی کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: "اللہ کی مخلوق میں شاعر اور پاگل سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی قابلِ نفرت نہ تھا۔ میں شدّتِ نفرت سے ان کی طرف دیکھنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ (اب جو وحی آئی تو) میں نے (اپنے جی میں) کہا کہ یہ ناکارہ — یعنی خود آپ — شاعر یا پاگل ہے! میرے بارے میں قریش ایسی بات کبھی نہ کہہ سکیں گے۔ میں پہاڑ کی چوٹی پر جا رہا ہوں وہاں سے اپنے آپ کو نیچے لڑھکا دوں گا اور اپنا خاتمہ کر لوں گا اور ہمیشہ کیلئے راحت پا جاؤں گا۔" آپؐ فرماتے ہیں کہ میں یہی سوچ کر نکلا جب بیچ پہاڑ پر پہنچا تو آسمان سے ایک آواز سنائی دی "اے محمد! ﷺ تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبریل ہوں۔" آپؐ کہتے ہیں کہ میں نے آسمان کی طرف اپنا سر اٹھایا۔ دیکھا تو جبریلؑ ایک آدمی کی شکل میں اُفق کے اندر پاؤں جمائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: اے محمد! ﷺ تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبریل ہوں۔" آپؐ فرماتے ہیں کہ میں وہیں ٹھہر کر جبریلؑ کو دیکھنے لگا اور اس شغل نے مجھے میرے ارادے سے غافل کر دیا۔ اب میں نہ آگے جا رہا تھا نہ پیچھے۔ البتہ اپنا چہرہ آسمان کے افق میں گھما رہا تھا اور اس کے جس گوشے پر بھی میری نظر پڑتی تھی جبریل اسی طرح دکھائی دیتے تھے۔ میں مسلسل کھڑا رہا۔ نہ آگے بڑھ رہا تھا نہ پیچھے۔ یہاں تک کہ خدیجہؓ نے میری تلاش میں اپنے قاصد بھیجے اور وہ مکہ تک جا کر پلٹ آئے۔ لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر جبریلؑ چلے گئے اور میں بھی اپنے اہل خانہ کی طرف پلٹ آیا اور خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر ان کی ران کے پاس انہیں پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے کہا: ابوالقاسم! آپؐ کہاں تھے؟ بخدا! میں نے آپؐ کی تلاش میں آدمی بھیجے اور وہ مکہ تک جا کر واپس آ گئے (اس کے جواب میں) میں نے جو کچھ دیکھا تھا انہیں بتا دیا۔ انہوں نے کہا: چچا کے بیٹے! آپ خوش ہو جائیے اور آپ ثابت قدم رہیے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اُمید کرتی ہوں کہ آپؐ اس اُمت کے نبی ہوں گے۔ اس کے بعد وہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ انہیں ماجرا سنایا۔ انہوں نے کہا قدوس قدوس اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے ان کے پاس وہی ناموسِ اکبر آیا ہے جو موسیٰؑ کے پاس آیا کرتا تھا۔ یہ اس اُمت کے نبی ہیں۔ ان سے کہو ثابت قدم رہیں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے واپس آکر آپؐ کو ورقہ کی بات بتائی۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے حرا میں اپنا قیام پورا کر لیا اور (مکہ) تشریف لائے تو آپؐ سے ورقہ نے ملاقات کی اور

آپؐ کی زبانی تفصیلات سُن کر کہا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آپؐ اِس اُمت کے نبی ہیں۔ آپؐ کے پاس وہی ناموسِ اکبر آیا ہے جو موسیٰؑ کے پاس آیا تھا۔[۸]

وحی کی بندش

رہی یہ بات کہ وحی کتنے دنوں تک بند رہی تو اس سلسلے میں ابن سعد نے ابنِ عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بندش چند دنوں کے لیے تھی اور سارے پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد یہی بات راجح بلکہ یقینی معلوم ہوتی ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ وحی کی بندش تین سال یا ڈھائی سال تک رہی تو یہ قطعاً صحیح نہیں۔ البتہ یہاں دلائل پر بحث کی گنجائش نہیں۔[۸]

وحی کی اس بندش کے عرصے میں رسُول ﷺ حزین و غمگین رہے اور آپ پر حیرت و استعجاب طاری رہا۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب التعبیر کی روایت ہے کہ:

"وحی بند ہوگئی جس سے رسُول اللہ ﷺ اس قدر غمگین ہُوئے کہ کئی بار بلند و بالا پہاڑ کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے کہ وہاں سے لڑھک جائیں لیکن جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے کہ اپنے آپ کو لڑھکا لیں تو حضرت جبریلؑ نمودار ہوتے اور فرماتے: "اے محمد! ﷺ آپ اللہ کے رسُول برحق ہیں" اور اس کی وجہ سے آپ کا اضطراب تھم جاتا۔ نفس کو قرار آجاتا اور آپ واپس آجاتے۔ پھر جب آپؐ پر وحی کی بندش طول پکڑ جاتی تو آپ پھر اسی جیسے کام کے لیے نکلتے لیکن جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو حضرت جبریلؑ نمودار ہو کر پھر وہی بات دُہراتے۔"[۹]

جبریلؑ دوبارہ وحی لاتے ہیں

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ (یعنی وحی کی چند روزہ بندش) اس لیے تھی تاکہ آپؐ پر جو خوف طاری ہوگیا تھا وہ رخصت ہو جائے اور دوبارہ وحی کی آمد کا شوق و انتظار پیدا ہو جائے۔[۱۰] چنانچہ جب حیرت کے سائے سُکڑ گئے حقیقت کے نقوش پختہ ہوگئے اور نبی ﷺ کو یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ آپؐ خدائے بزرگ و برتر کے نبی ہو چکے ہیں

---

۸ طبری ۲/۲۰۷، ابنِ ہشام ۱/۲۳۷، ۲۳۸ (آخر کا تھوڑا سا حصہ ملخص کر دیا گیا ہے) ہمیں اس روایت کی بیان کردہ تفصیلات کی صحت کے بارے میں قدرے تامل ہے۔ صحیح بخاری کی روایت کے سیاق اور اس کی متعدد روایات کے تقابل کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مکہ کی طرف آپؐ کی واپسی اور حضرت ورقہ سے ملاقات نزولِ وحی کے بعد اسی دن ہوگئی تھی۔ اور پھر باقی ماندہ قیامِ حراء کی تکمیل آپؐ نے مکہ سے پلٹ کر کی تھی۔

۹ تھوڑی سی توضیح حاشیہ نمبر ۱۱ میں آرہی ہے۔

۹ صحیح بخاری کتاب التعبیر باب اول ما بدئ بہ رسول اللہ ﷺ الرؤیا الصالحۃ ۲/۱۰۳۴ ۱۰ فتح الباری ۱/۲۷

اور آپ کے پاس جو شخص آیا تھا وہ وحی کا سفیر اور آسمانی خبر کا ناقل ہے اور اس طرح وحی کے لیے آپ کا شوق و انتظار اس بات کا ضامن ہو گیا کہ آئندہ وحی کی آمد پر آپ ثابت قدم رہیں گے اور اس بوجھ کو اٹھائیں گے، تو حضرت جبریلؑ دوبارہ تشریف لائے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبانی بندشِ وحی کا واقعہ سنا آپؐ فرما رہے تھے:

"میں چلا جا رہا تھا کہ مجھے اچانک آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں اس سے خوف زدہ ہو کر زمین کی طرف جا جھکا۔ پھر میں نے اپنے اہل خانہ کے پاس آکر کہا مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔ انہوں نے مجھے چادر اوڑھا دی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ — وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ تک نازل فرمائی پھر (نزول) وحی میں گرمی آگئی اور وہ پیاپے نازل ہونے لگی[۱۱]"

وحی کی اقسام

اب ہم سلسلۂ بیان سے ذرا ہٹ کر یعنی رسالت و نبوت کی حیاتِ مبارکہ کی تفصیلات شروع کرنے سے پہلے وحی کی اقسام ذکر کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ یہ رسالت کا مصدر اور دعوت کی کمک ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے وحی کے حسب ذیل مراتب ذکر کیے ہیں:

۱۔ سچا خواب: اسی سے نبی ﷺ کے پاس وحی کی ابتداء ہوئی۔

۲۔ فرشتہ آپ کو دکھلائی دیے بغیر آپ کے دل میں بات ڈال دیتا تھا، مثلاً نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ اَنَّهٗ لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰی تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ، وَلَا یَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ

---

[۱۱] صحیح بخاری کتاب التفسیر باب والرجز فاہجر ۲/۷۳۳

اس روایت کے بعض طرق کے آغاز میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: میں نے حرا میں اعتکاف کیا۔ اور جب اپنا اعتکاف پورا کر چکا تو نیچے اترا۔ پھر جب میں بطنِ وادی سے گذر رہا تھا تو مجھے پکارا گیا۔ میں نے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھا، کچھ نظر نہ آیا۔ اوپر نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ ..... الخ اہل سیر کی تمام روایات کے مجموعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے تین سال حراء میں ماہ رمضان کا اعتکاف کیا تھا اور نزولِ وحی والا رمضان تیسرا یعنی آخری رمضان تھا اور آپؐ کا دستور تھا کہ آپؐ رمضان کا اعتکاف مکمل کر کے پہلی شوال کو سویرے ہی مکہ آجاتے تھے۔ مذکورہ روایت کے ساتھ اس بات کو جوڑنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ والی وحی پہلی وحی کے دس دن بعد یکم شوال کو نازل ہوئی تھی یعنی بندش وحی کی کل مدت دس دن تھی۔ واللہ اعلم۔

عَلٰی اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعْصِیَةِ اللّٰهِ فَاِنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ لَا یُنَالُ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ۔

"روح القدس نے میرے دل میں یہ بات پھونکی کہ کوئی نفس مر نہیں سکتا یہاں تک کہ اپنا رزق پورا پورا حاصل کرلے۔ پس اللہ سے ڈرو اور طلب میں اچھائی اختیار کرو اور رزق کی تاخیر تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اسے اللہ کی معصیت کے ذریعے تلاش کرو، کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی اطاعت کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔"

۳۔ فرشتہ نبی ﷺ کے لیے آدمی کی شکل اختیار کرکے آپؐ کو مخاطب کرتا پھر جو کچھ وہ کہتا اسے آپؐ یاد کرلیتے۔ اس صورت میں کبھی کبھی صحابہؓ بھی فرشتے کو دیکھتے تھے۔

۴۔ آپؐ کے پاس وحی گھنٹی کے ٹن ٹنانے کی طرح آتی تھی۔ وحی کی یہ سب سے سخت صورت ہوتی تھی۔ اس صورت میں فرشتہ آپؐ سے ملتا تھا اور وحی آتی تھی تو سخت جاڑے کے زمانے میں بھی آپؐ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پڑتا تھا، اور آپؐ اونٹنی پر سوار ہوتے تو وہ زمین پر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک بار اس طرح وحی آئی کہ آپؐ کی ران حضرت زید بن ثابتؓ کی ران پر تھی، تو ان پر اس قدر گراں بار ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا ران کچل جائے گی۔

۵۔ آپؐ فرشتے کو اس کی اصلی اور پیدائشی شکل میں دیکھتے تھے اور اسی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ کی حسب مشیت آپؐ کی طرف وحی کرتا تھا۔ یہ صورت آپؐ کے ساتھ دو مرتبہ پیش آئی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم میں فرمایا ہے۔

۶۔ وہ وحی جو آپؐ پر معراج کی رات نماز کی فرضیت وغیرہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی، جب آپؐ آسمانوں کے اوپر تھے۔

۷۔ فرشتے کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی آپؐ سے حجاب میں رہ کر براہ راست گفتگو جیسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو فرمائی تھی۔ وحی کی یہ صورت موسیٰ علیہ السلام کے لیے نص قرآنی سے قطعی طور پر ثابت ہے۔ لیکن نبی ﷺ کے لیے اس کا ثبوت (قرآن کی بجائے) معراج کی حدیث میں ہے۔

بعض لوگوں نے ایک آٹھویں شکل کا بھی اضافہ کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ رُو در رُو بغیر حجاب کے گفتگو کرے۔ لیکن یہ ایسی صورت ہے جس کے بارے میں سلف سے لے کر خلف تک اختلاف چلا آیا ہے[۱۲]۔

---

[۱۲] زاد المعاد ۱/۱۸ پہلی اور آٹھویں صورت کے بیان میں اصل عبارت کے اندر تھوڑی تلخیص کردی گئی ہے۔

تبلیغ کا حکم اور اُس کے مضمرات

سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات — یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ سے وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ تک۔

میں نبی ﷺ کو کئی حکم دیئے گئے ہیں جو بظاہر تو بہت مختصر اور سادہ ہیں لیکن حقیقۃً بڑے دُور رس مقاصد پر مشتمل ہیں اور حقائق پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں چنانچہ:

۱۔ انذار کی آخری منزل یہ ہے کہ عالمِ وجود میں اللہ کی مرضی کے خلاف جو بھی چل رہا ہو اسے اس کے پُرخطر انجام سے آگاہ کر دیا جائے اور وہ بھی اس طرح کہ عذابِ الٰہی کے خوف سے اس کے دل و دماغ میں ہلچل اور اتھل پتھل مچ جائے۔

۲۔ رب کی بڑائی و کبریائی بجا لانے کی آخری منزل یہ ہے کہ رُوئے زمین پر کسی اور کی کبریائی برقرار نہ رہنے دی جائے۔ بلکہ اس کی شوکت توڑ دی جائے، اور اسے اُلٹ کر رکھ دیا جائے یہاں تک کہ روئے زمین پر صرف اللہ کی بڑائی باقی رہے۔

۳۔ کپڑے کی پاکی اور گندگی سے دُوری کی آخری منزل یہ ہے کہ ظاہر و باطن کی پاکی اور تمام شوائب و آلائش سے نفس کی صفائی کے سلسلے میں اس حد کمال کو پہنچ جائیں جو اللہ کی رحمت کے گھنے سائے میں اس کی حفاظت و نگہداشت اور ہدایت و نور کے تحت ممکن ہے، یہاں تک کہ انسانی معاشرے کا ایسا اعلیٰ ترین نمونہ بن جائیں کہ آپؐ کی طرف تمام قلبِ سلیم کھنچتے چلے جائیں اور آپؐ کی ہیبت و عظمت کا احساس تمام کج دلوں کو ہو جائے اور اس طرح ساری دنیا موافقت یا مخالفت میں آپؐ کے گرد مرتکز ہو جائے۔

۴۔ احسان کر کے اس پر کثرت نہ چاہنے کی آخری منزل یہ ہے کہ اپنی جد و جہد اور کارناموں کو بڑائی اور اہمیت نہ دیں بلکہ ایک کے بعد دوسرے عمل کے لیے جد و جہد کرتے جائیں۔ اور بڑے پیمانے پر قربانی اور جہد و مشقت کر کے اسے اس معنی میں فراموش کرتے جائیں کہ یہ ہمارا کوئی کارنامہ ہے یعنی اللہ کی یاد اور اس کے سامنے جوابدہی کا احساس اپنی جہد و مشقت کے احساس پر غالب ہے۔

۵۔ آخری آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ کی طرف دعوت کا کام شروع کرنے کے بعد معاندین کی

جانب سے مخالفت، استہزاء، ہنسی اور ٹھٹھے کی شکلوں میں ایذا رسانی سے لے کر آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو قتل کرنے اور آپؐ کے گرد جمع ہونے والے اہلِ ایمان کو نیست و نابود کرنے تک کی بھرپور کوششیں ہوں گی اور آپؐ کو ان سب سے سابقہ پیش آئے گا۔ اس صورت میں آپؐ کو بڑی پامردی اور پختگی سے صبر کرنا ہوگا۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ اس صبر کے بدلے کسی حظِّ نفسانی کے حصول کی توقع ہو۔ بلکہ محض اپنے رب کی مرضی اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے۔ (وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ)

اللہ اکبر! یہ احکامات اپنی ظاہری شکل میں کتنے سادہ اور مختصر ہیں اور ان کے الفاظ کی بندش کتنی پرسکون اور پرکشش نغمگی لیے ہوئے ہے۔ لیکن عمل اور مقصد کے لحاظ سے یہ احکامات کتنے بھاری کتنے باعظمت اور کتنے سخت ہیں اور ان کے نتیجے میں کتنی سخت چوکھی آندھی بپا ہوگی جو ساری دنیا کے گوشے گوشے کو ہلا کر اور ایک کو دوسرے سے گتھ کر رکھ دے گی۔

ان ہی مذکورہ آیات میں دعوت و تبلیغ کا مواد بھی موجود ہے۔ انذار کا مطلب ہی یہ ہے کہ بنی آدم کے کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا انجام بُرا ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں لوگوں کو نہ تو ان کے سارے اعمال کا بدلہ دیا جاتا ہے اور نہ دیا جاسکتا ہے، اس لیے انذار کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ دنیا کے دنوں کے علاوہ ایک دن ایسا بھی ہونا چاہیئے جس میں ہر عمل کا پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک بدلہ دیا جاسکے۔ یہی قیامت کا دن، جزاء کا دن اور بدلے کا دن ہے۔ پھر اس دن بدلہ دیئے جانے کا لازمی تقاضا ہے کہ ہم دنیا میں جو زندگی گزار رہے ہیں اس کے علاوہ بھی ایک زندگی ہو۔

بقیہ آیات میں بندوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ توحید خالص اختیار کریں۔ اپنے سارے معاملات اللہ کو سونپ دیں۔ اور اللہ کی مرضی پر نفس کی خواہش اور لوگوں کی مرضی کو تج دیں۔ اس طرح دعوت و تبلیغ کے مواد کا خلاصہ یہ ہوا:

(الف) توحید

(ب) یوم آخرت پر ایمان

(ج) تزکیۂ نفس کا اہتمام یعنی انجامِ بد تک لے جانے والے گندے اور فحش کاموں سے پرہیز اور فضائل و کمالات اور اعمال خیر پر کاربند ہونے کی کوشش۔

(د) اپنے سارے معاملات کی اللہ کو حوالگی و سپردگی۔

(ہ) پھر اس سلسلے کی آخری کڑی یہ ہے کہ یہ سب کچھ نبی ﷺ کی رسالت پر ایمان لاکر آپؐ

کی باعظمت قیادت اور رشد و ہدایت سے لبریز فرمودات کی روشنی میں انجام دیا جائے۔

پھر ان آیات کا مطلع اللہ بزرگ و برتر کی آواز میں ایک آسمانی ندا پر مشتمل ہے جس میں نبی ﷺ کو اس عظیم و جلیل کام کے لیے اٹھنے اور نیند کی چادر پوشی اور بستر کی گرمی سے نکل کر جہاد وکفاح اور سعی و مشقت کے میدان میں آنے کے لیے کہا گیا ہے۔ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ (۲/۱۰۴)

اے چادر پوش اُٹھ اور ڈرا، گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جسے اپنے لیے جینا ہے وہ تو راحت کی زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن آپ، جو اس زبردست بوجھ کو اٹھا رہے ہیں، تو آپ کو نیند سے کیا تعلق؟ آپ کو راحت سے کیا سروکار؟ آپ کو گرم بستر سے کیا مطلب؟ پرسکون زندگی سے کیا نسبت؟ راحت بخش ساز و سامان سے کیا واسطہ؟ آپ اُٹھ جائیے اس کارِ عظیم کے لیے جو آپ کا منتظر ہے۔ اس بارِ گراں کے لیے جو آپ کی خاطر تیار ہے۔ اُٹھ جائیے جہد و مشقت کے لیے، تکان اور محنت کے لیے اٹھ جائیے! کہ اب نیند اور راحت کا وقت گزر چکا، اب آج سے پیہم بیداری ہے اور طویل و پُر مشقت جہاد ہے اُٹھ جائیے! اور اس کام کے لیے مستعد اور تیار ہو جائیے ——

یہ بڑا عظیم اور پُر ہیبت کلمہ ہے۔ اس نے نبی ﷺ کو پُرسکون گھر، گرم آغوش اور نرم بستر سے کھینچ کر تند طوفانوں اور تیز جھکڑوں کے درمیان اتھاہ سمندر میں پھینک دیا اور لوگوں کے ضمیر اور زندگی کے حقائق کی کشاکش کے درمیان لا کھڑا کیا۔

پھر —— رسول ﷺ اُٹھ گئے اور بیس سال سے زیادہ عرصے تک اُٹھے رہے۔ راحت و سکون تج دیا۔ زندگی اپنے لیے اور اہل و عیال کے لیے نہ رہی۔ آپ اُٹھے تو اٹھے ہی رہے۔ کام اللہ کی طرف دعوت دینا تھا۔ آپ نے یہ کمر توڑ بارِ گراں اپنے شانے پر کسی دباؤ کے بغیر اٹھا لیا۔ یہ بوجھ تھا اس روئے زمین پر امانتِ کبریٰ کا بوجھ۔ ساری انسانیت کا بوجھ، سارے عقیدے کا بوجھ اور مختلف میدانوں میں جہاد و دفاع کا بوجھ۔ آپ نے بیس سال سے زیادہ عرصے تک پیہم اور ہمہ گیر معرکہ آرائی میں زندگی بسر کی اور اس پورے عرصے میں یعنی جب سے آپ نے وہ آسمانی ندائے جلیل سُنی اور یہ گراں بار ذمہ داری پائی آپ کو کوئی ایک حالت کسی دوسری حالت سے غافل نہ کر سکی۔ اللہ آپ کو ہماری طرف سے اور ساری انسانیت کی طرف سے بہترین جزا دے[۱۳]

اگلے صفحات رسول اللہ ﷺ کے اسی طویل اور پُر مشقت جہاد کا ایک مختصر سا خاکہ ہیں۔

---

[۱۳] فی ظلال القرآن سورہ مزمل و مدثر پارہ ۲۹: ۱۶۸ تا ۱۷۱ و ۱۸۲

دعوت کے اَدوار و مَراحِل

ہم نبی ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز تھے۔ وہ دونوں حصے یہ ہیں:

۱۔ مکی زندگی ـــــ تقریباً تیرہ سال

۲۔ مدنی زندگی ـــــ دس سال

پھر ان میں سے ہر حصہ کئی مرحلوں پر مشتمل ہے اور یہ مرحلے بھی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ اس کا اندازہ آپؐ کی پیغمبرانہ زندگی کے دونوں حصوں میں پیش آنے والے مختلف حالات کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد ہو سکتا ہے۔

مکی زندگی تین مرحلوں پر مشتمل تھی

۱۔ پسِ پردہ دعوت کا مرحلہ ـــــ تین برس ـــــ

۲۔ اہلِ مکہ میں کھلم کھلا دعوت و تبلیغ کا مرحلہ ـــ چوتھے سال نبوت کے آغاز سے دسویں سال کے اواخر تک۔

۳۔ مکہ کے باہر اسلام کی دعوت کی مقبولیت اور پھیلاؤ کا مرحلہ ـــــ دسویں سالِ نبوت کے اواخر سے ہجرت مدینہ تک۔

مدنی زندگی کے مراحل کی تفصیل اپنی جگہ آ رہی ہے۔

پہلا مرحلہ:

کاوشِ تبلیغ

خفیہ دعوت کے تین سال

یہ معلوم ہے کہ مکہ دین عرب کا مرکز تھا، یہاں کعبہ کے پاسبان بھی تھے اور ان بتوں کے نگہبان بھی جنہیں پورا عرب تقدیس کی نظر سے دیکھتا تھا، اس لیے کسی دور افتادہ مقام کی بہ نسبت مکہ میں مقصد اصلاح تک رسائی ذرا زیادہ دشوار تھی۔ یہاں ایسی عزیمت درکار تھی جسے مصائب و مشکلات کے جھٹکے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔ اس کیفیت کے پیش نظر حکمت کا تقاضا تھا کہ پہلے پہل دعوت و تبلیغ کا کام پس پردہ انجام دیا جائے تاکہ اہل مکہ کے سامنے اچانک ایک ہیجان خیز صورت حال نہ آجائے۔

اوّلین راہروانِ اسلام

یہ بالکل فطری بات تھی کہ رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے ان لوگوں پر اسلام پیش کرتے جن سے آپ کا سب سے گہرا ربط و تعلق تھا، یعنی اپنے گھر کے لوگوں اور دوستوں پر۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے انہیں کو دعوت دی۔ اس طرح آپ نے ابتداء میں اپنی جان پہچان کے ان لوگوں کو حق کی طرف بلایا جن کے چہروں پر آپ بھلائی کے آثار دیکھ چکے تھے اور یہ جان چکے تھے کہ وہ حق اور خیر کو پسند کرتے ہیں آپ کے صدق و صلاح سے واقف ہیں۔ پھر آپ نے جنہیں اسلام کی دعوت دی ان میں سے ایک ایسی جماعت نے جسے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کی عظمت، جلالتِ نفس اور سچائی پر شبہ نہ گذرا تھا، آپ کی دعوت قبول کرلی۔ یہ اسلامی تاریخ میں سابقین اولین کے وصف سے مشہور ہیں۔ ان میں سرفہرست آپ کی بیوی اُم المومنین حضرت خدیجہؓ بنتِ خویلد، آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ بن شرحبیل کلبی[1]، آپ کے چچیرے بھائی حضرت علیؓ بن ابی طالب جو ابھی آپ کے زیر کفالت بچے تھے اور آپ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ یہ سب کے سب پہلے ہی دن مسلمان ہوگئے تھے[2] اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام کی تبلیغ میں سرگرم

---

[1] یہ جنگ میں قید ہو کر غلام بنا لیے گئے تھے۔ بعد میں حضرت خدیجہؓ ان کی مالک (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہو گئے۔ وہ بڑے ہر دلعزیز نرم خو، پسندیدہ خصال کے حامل با اخلاق اور دریا دل تھے۔ ان کے پاس ان کی مروت، دور اندیشی، تجارت اور حسن صحبت کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پاس آنے جانے والوں اور اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے جس کو قابل اعتماد پایا اسے اب اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی۔ ان کی کوشش سے حضرت عثمانؓ حضرت زبیرؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ مسلمان ہوئے۔ یہ بزرگ اسلام کا ہراول دستہ تھے۔

شروع شروع میں جو لوگ اسلام لائے انہی میں حضرت بلال حبشیؓ بھی ہیں۔ ان کے بعد امین امت حضرت ابو عبیدہؓ عامر بن جراحؓ، ابو سلمہ بن عبدالاسد، ارقمؓ بن ابی الارقم، عثمانؓ بن مظعون اور ان کے دونوں بھائی قدامہ اور عبداللہ، اور عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف، سعید بن زید، اور ان کی بیوی یعنی حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور خبابؓ بن ارت، عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے کئی افراد مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ مجموعی طور پر قریش کی تمام شاخوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ابن ہشام نے ان کی تعداد چالیس سے زیادہ بتائی ہے۔ (دیکھئے ۱/۲۴۵ تا ۲۶۲) لیکن ان میں سے بعض کو سابقین اولین میں شمار کرنا محل نظر ہے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس کے بعد مرد اور عورتیں اسلام میں جماعت در جماعت داخل ہوئے۔ یہاں تک کہ مکہ میں اسلام کا ذکر پھیل گیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہو گیا۔[۳]

یہ لوگ چھپ چھپا کر مسلمان ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی چھپ چھپا کر ہی ان کی رہنمائی اور دینی تعلیم کے لیے ان کے ساتھ جمع ہوتے تھے کیونکہ تبلیغ کا کام ابھی تک انفرادی طور پر پس پردہ چل رہا تھا۔ ادھر سورہ مدثر کی ابتدائی آیات کے بعد وحی کی آمد پورے تسلسل اور گرم رفتاری کے ساتھ جاری تھی۔ اس دور میں چھوٹی چھوٹی آیتیں نازل ہو رہی تھیں۔ ان آیتوں

(بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ) ہوئیں اور انہیں رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کے والد اور چچا انہیں گھر لے جانے کے لیے آئے لیکن انہوں نے باپ اور چچا کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ اس کے بعد آپ نے عرب کے دستور کے مطابق انہیں اپنا متبنیٰ (لے پالک) بنا لیا اور انہیں زید بن محمد کہا جانے لگا یہاں تک کہ اسلام نے اس رسم کا خاتمہ کر دیا۔

[۲] رحمۃ للعالمین ۱/۵۰ [۳] سیرت ابن ہشام ۱/۲۶۲

کا خاتمہ یکساں قسم کے بڑے پُرکشش الفاظ پر ہوتا تھا اور ان میں بڑی سکون بخش اور جاذبِ قلب نغمگی ہوتی تھی جو اس پُرسکون اور رقت آمیز فضا کے عین مطابق ہوتی تھی۔ پھر ان آیتوں میں تزکیۂ نفس کی خوبیاں اور آلائش دنیا میں لت پت ہونے کی برائیاں بیان کی جاتی تھیں اور جنت و جہنم کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا تھا کہ گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ آیتیں اہلِ ایمان کو اس وقت کے انسانی معاشرے سے بالکل الگ ایک دوسری ہی فضا کی سیر کراتی تھیں۔

نماز

ابتداءً جو کچھ نازل ہوا اسی میں نماز کا حکم بھی تھا۔ مُقاتل بن سلیمان کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے اسلام میں دو رکعت صبح اور دو رکعت شام کی نماز فرض کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

..وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ○ (۴۰:۵۵)

"صبح اور شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو"

ابنِ حجر کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اور اسی طرح آپؐ کے صحابہ کرام واقعۂ معراج سے پہلے قطعی طور پر نماز پڑھتے تھے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ نماز پنجگانہ سے پہلے کوئی نماز فرض تھی یا نہیں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے پہلے ایک ایک نماز فرض تھی۔

حارثؓ بن اُسامہ نے ابنِ لہیعہ کے طریق سے موصولاً حضرت زید بن حارثہؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ابتداءً جب وحی آئی تو آپؐ کے پاس حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور آپ کو وضو کا طریقہ سکھایا جب وضو سے فارغ ہوئے تو ایک چلو پانی لیکر شرمگاہ پر چھینٹا مارا۔ ابنِ ماجہ نے بھی اس مفہوم کی حدیث روایت کی ہے۔ براءؓ بن عازب اور ابنِ عباسؓ سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔ ابن عباسؓ کی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ (نماز) اولین فرائض میں سے تھی[۴]

ابن ہشام کا بیان ہے کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام نماز کے وقت گھاٹیوں میں چلے جاتے تھے اور اپنی قوم سے چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک بار ابو طالب نے نبی ﷺ اور حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا اور حقیقت معلوم ہوئی تو کہا کہ اس پر برقرار رہیں[۵]

---

۴ مختصر السیرۃ از شیخ عبداللہ ص ۸۵

۵ ابن ہشام ۱/۲۴۶

قریش کو اجمالی خبر

مختلف واقعات سے ظاہر ہے کہ اس مرحلے میں تبلیغ کا کام اگرچہ انفرادی طور پر چھپ چھپا کر کیا جا رہا تھا لیکن قریش کو اس کی سُن گُن لگ چکی تھی۔ البتہ انہوں نے اسے قابلِ توجہ نہ سمجھا۔

محمد غزالیؒ لکھتے ہیں کہ یہ خبریں قریش کو پہنچ چکی تھیں، لیکن قریش نے انہیں کوئی اہمیت نہ دی، غالباً انہوں نے محمد ﷺ کو بھی اسی طرح کا کوئی دینی آدمی سمجھا جو الوہیت اور حقوقِ الوہیت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ جیسا کہ اُمیّہ بن ابی الصلت، قُس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نُفیل وغیرہ نے کیا تھا۔ البتہ قریش نے آپ کی خبر کے پھیلاؤ اور اثر کے بڑھاؤ سے کچھ اندیشے ضرور محسوس کئے تھے اور ان کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے ساتھ آپ کے انجام اور آپ کی تبلیغ پر رہنے لگی تھیں[۶]۔

تین سال تک تبلیغ کا کام خفیہ اور انفرادی رہا اور اس دوران اہلِ ایمان کی ایک جماعت تیار ہو گئی جو اخوّت اور تعاون پر قائم تھی، اللہ کا پیغام پہنچا رہی تھی اور اس پیغام کو اس کا مقام دلانے کے لیے کوشاں تھی۔ اس کے بعد وحیِ الٰہی نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کو مکلّف کیا گیا کہ اپنی قوم کو کھلم کھلا دین کی دعوت دیں۔ انکے باطل سے ٹکرائیں اور ان کے بتوں کی حقیقت واشگاف کریں۔

○

---

[۶] فقہ السیرۃ ص ۷۶۔

دوسرا مرحلہ:

کھلی تبلیغ

اظہارِ دعوت کا پہلا حکم اس بارے میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نازل ہوا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶: ۲۱۴) "آپؐ اپنے نزدیک ترین قرابتداروں کو (عذابِ الٰہی سے) ڈرایئے"۔ یہ سورہ شعراء کی آیت ہے، اور اس سورہ میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا آغاز ہوا، پھر آخر میں انہوں نے بنی اسرائیل سمیت ہجرت کر کے فرعون اور قومِ فرعون سے نجات پائی اور فرعون و آلِ فرعون کو غرق کیا گیا۔ بلفظ دیگر یہ تذکرہ ان تمام مراحل پر مشتمل ہے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون اور قومِ فرعون کو اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہوئے گذرے تھے۔

میرا خیال ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اپنی قوم کے اندر کھل کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس موقعے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی یہ تفصیل اس لیے بیان کر دی گئی تاکہ کھلم کھلا دعوت دینے کے بعد جس طرح کی تکذیب اور ظلم و زیادتی سے سابقہ پیش آنے والا تھا اس کا ایک نمونہ آپؐ اور صحابہ کرامؓ کے سامنے موجود رہے۔

دوسری طرف اس سورہ میں پیغمبروں کو جھٹلانے والی اقوام مثلاً فرعون اور قومِ فرعون کے علاوہ قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ ابراہیمؑ، قومِ لوط اور اصحاب الایکہ کے انجام کا بھی ذکر ہے۔ اس کا مقصد غالباً یہ ہے کہ جو لوگ آپ کو جھٹلائیں انہیں معلوم ہو جائے کہ تکذیب پر اصرار کی صورت میں ان کا انجام کیا ہونے والا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس قسم کے مواخذے سے دوچار ہوں گے۔ نیز اہلِ ایمان کو معلوم ہو جائے کہ اچھا انجام انھیں کا ہوگا، جھٹلانے والوں کا نہیں۔

قرابت داروں میں تبلیغ بہرحال اس آیت کے نزول کے بعد نبی ﷺ نے پہلا کام یہ کیا کہ بنی ہاشم کو جمع کیا ان کے ساتھ بنی مُطّلب بن عبد مناف کی بھی ایک جماعت تھی۔ کل پینتالیس آدمی تھے، لیکن ابولہب نے بات لپک لی اور بولا: "دیکھو یہ تمہارے چچا اور چچیرے بھائی ہیں۔ بات کرو لیکن نادانی چھوڑ دو اور یہ سمجھ لو کہ تمہارا خاندان سارے عرب سے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا

اور میں سب سے زیادہ حق دار ہوں کہ تمہیں پکڑلوں پس تمہارے لیے تمہارے باپ کا خانوادہ ہی کافی ہے۔ اور اگر تم اپنی بات پر قائم رہے تو یہ بہت آسان ہوگا کہ قریش کے سارے قبائل تم پر ٹوٹ پڑیں اور بقیہ عرب بھی ان کی امداد کریں، پھر میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص اپنے باپ کے خانوادے کے لیے تم سے بڑھ کر شر (اور تباہی) کا باعث ہوگا۔" اس پر نبی ﷺ نے خاموشی اختیار کرلی اور اس مجلس میں کوئی گفتگو نہ کی ——

اس کے بعد آپؐ نے انہیں دوبارہ جمع کیا اور ارشاد فرمایا: "ساری حمد اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں۔ اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اسی پر بھروسا کرتا ہوں اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔" پھر آپؐ نے فرمایا: "رہنما اپنے گھر کے لوگوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں تمہاری طرف خصوصاً اور لوگوں کی طرف عموماً اللہ کا رسول (فرستادہ) ہوں۔ بخدا! تم لوگ اسی طرح موت سے دوچار ہوگے جیسے سوجاتے ہو اور اسی طرح اٹھائے جاؤ گے جیسے سوکر جاگتے ہو۔ پھر جو کچھ تم کرتے ہو اس کا تم سے حساب لیا جائے گا۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہے یا ہمیشہ کے لیے جہنم۔"

اس پر ابوطالب نے کہا (نہ پوچھو) ہمیں تمہاری معاونت کس قدر پسند ہے! تمہاری نصیحت کس قدر قابلِ قبول ہے! اور ہم تمہاری بات کس قدر سچی جانتے مانتے ہیں اور یہ تمہارے والد کا خانوادہ جمع ہے۔ اور میں بھی ان کا ایک فرد ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میں تمہاری پسند کی تکمیل کے لیے ان سب سے پیش پیش ہوں، لہٰذا تمہیں جس بات کا حکم ہوا ہے اسے انجام دو۔ بخدا! میں تمہاری مسلسل حفاظت و اعانت کرتا رہوں گا۔ البتہ میری طبیعت عبدالمطلب کا دین چھوڑنے پر راضی نہیں۔

ابولہب نے کہا: خدا کی قسم یہ برائی ہے۔ اس کے ہاتھ دوسروں سے پہلے تم لوگ خود ہی پکڑ لو۔ اس پر ابوطالب نے کہا: خدا کی قسم جب تک جان میں جان ہے۔ ہم ان کی حفاظت کرتے رہیں گے۔[1]

کوہِ صفا پر

جب نبی ﷺ نے اچھی طرح اطمینان کرلیا کہ اللہ کے دین کی تبلیغ کے دوران ابوطالب ان کی حمایت کریں گے تو ایک روز آپؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر یہ آواز لگائی: یا صباحاہ (ہائے صبح)[2] یہ پکار سن کر قریش کے قبائل آپؐ کے پاس جمع ہوگئے اور آپؐ نے انہیں

---

[1] فقہ السیرۃ ص ۸۸ از ابن الاثیر۔ [2] اہل عرب کا دستور تھا کہ دشمن کے حملے سے آگاہ کرنے کے لیے کسی بلند مقام پر چڑھ کر انہیں الفاظ سے پکارتے تھے۔

خدا کی توحید، اپنی رسالت اور یومِ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس واقعے کا ایک ٹکڑا صحیح بخاری میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ:

جب وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر بطونِ قریش کو آواز لگانی شروع کی، اے بنی فہر! اے بنی عدی! یہاں تک کہ سب کے سب اکٹھا ہو گئے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی خود نہ جا سکتا تھا تو اس نے اپنا قاصد بھیج دیا کہ دیکھے معاملہ کیا ہے؟ غرض قریش آ گئے۔ ابولہب بھی آ گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "تم لوگ یہ بتاؤ! اگر میں یہ خبر دوں کہ ادھر وادی میں شہسواروں کی ایک جماعت ہے جو تم پر چھاپہ مارنا چاہتی ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟" لوگوں نے کہا، ہاں! ہم نے آپ پر سچ ہی کا تجربہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اچھا، تو میں تمہیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس پر ابولہب نے کہا، تو سارے دن غارت ہو، تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا۔ اس پر سورہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ نازل ہوئی۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ غارت ہوں اور وہ خود غارت ہو۔[۳]

اس واقعے کا ایک اور ٹکڑا امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پکار لگائی۔ یہ پکار عام بھی تھی اور خاص بھی۔ آپؐ نے کہا "اے جماعت قریش! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے بنی کعب! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچا کیونکہ میں تم لوگوں کو اللہ (کی گرفت) سے (بچانے کا) کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ تم لوگوں سے نسب و قرابت کے تعلقات ہیں جنہیں میں باقی اور تر و تازہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔"[۴]

یہ بانگِ درا غایتِ تبلیغ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریب ترین لوگوں پر واضح کر دیا تھا کہ اب اس رسالت کی تصدیق ہی پر تعلقات موقوف ہیں اور جس نسلی اور قبائلی عصبیت پر عرب قائم ہیں وہ اس خدائی انذار کی حرارت میں پگھل کر ختم ہو چکی ہے۔

حق کا واشگاف اعلان اور مشرکین کا ردِ عمل

اس آواز کی گونج ابھی مکے کے اطراف میں سنائی ہی دے رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اور حکم نازل ہوا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۱۵:۹۴)

---

[۳] صحیح بخاری ۲/۷۰۲، ۷۴۳، صحیح مسلم ۱/۱۱۴۔ [۴] صحیح مسلم ۱/۱۱۴ نیز صحیح بخاری ۱/۳۸۵

"آپ کو جو حکم ملا ہے اسے کھول کر بیان کر دیجئے اور مشرکین سے رُخ پھیر لیجئے"

اس کے بعد رسُول اللہ ﷺ نے شرک کے خرافات و اباطیل کا پردہ چاک کرنا اور بُتوں کی حقیقت اور قدر و قیمت کو واشگاف کرنا شروع کر دیا۔ آپ مثالیں دے دے کر سمجھاتے کہ کس قدر عاجز و ناکارہ ہیں اور دلائل سے واضح فرماتے کہ جو شخص انہیں پوجتا ہے اور ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان وسیلہ بناتا ہے وہ کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

مکہ، ایک ایسی آواز سُن کر جس میں مشرکین اور بت پرستوں کو گمراہ کہا گیا تھا، احساسِ غضب سے پھٹ پڑا۔ اور شدید غم و غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا، گویا بجلی کا کڑکا تھا جس نے پُرسکون فضا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسی لیے قریش اس اچانک پھٹ پڑنے والے "انقلاب" کی جڑ کاٹنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اس سے پُشتینی رسم و رواج کا صفایا ہوا چاہتا تھا۔

قریش اُٹھ پڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غیر اللہ کی اُلوہیت کے انکار اور رسالت و آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے، یعنی اس طرح کہ دُوسرے تو درکنار خود اپنی جان اور اپنے مال تک کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے اور اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ والوں کو دینی رنگ میں اہلِ عرب پر جو بڑائی اور سرداری حاصل تھی اس کا صفایا ہو جائے گا اور اللہ اور اس کے رسُول کی مرضی کے مقابل میں انھیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہے گا، یعنی نچلے طبقے پر انہوں نے جو مظالم روا رکھے تھے۔ اور صبح و شام جن بُرائیوں میں لت پت رہتے تھے۔ ان سے دستکش ہوتے ہی بنے گی۔ قریش اس مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اس لیے ان کی طبیعت اس "رسوا کن" پوزیشن کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، لیکن کسی شرف اور خیر کے پیشِ نظر نہیں۔ بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝ (۷۵ : ۵) "بلکہ اس لیے کہ انسان چاہتا ہے کہ آئندہ بھی بُرائی کرتا رہے"

قریش یہ سب کچھ سمجھ رہے تھے لیکن مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ان کے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو صادق و امین تھا انسانی اقدار اور مکارمِ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھا اور ایک طویل عرصے سے اُنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ میں اس کی نظیر نہ دیکھی تھی اور نہ سُنی۔ آخر اس کے بالمقابل کریں تو کیا کریں قریش حیران تھے اور انہیں واقعی حیران ہونا چاہیئے تھا۔

کافی غور و خوض کے بعد ایک راستہ سمجھ میں آیا کہ آپ کے چچا ابو طالب کے پاس جائیں

اور مطالبہ کریں کہ وہ آپ کو آپ کے کام سے روک دیں۔ پھر انہوں نے اس مطالبے کو حقیقت و واقعیت کا جامہ پہنانے کے لیے یہ دلیل تیار کی کہ ان کے معبودوں کو چھوڑنے کی دعوت دینا اور یہ کہنا کہ یہ معبود نفع و نقصان پہنچانے یا اور کچھ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے درحقیقت ان معبودوں کی سخت توہین اور بہت بڑی گالی ہے اور یہ ہمارے ان آباؤ اجداد کو احمق اور گمراہ قرار دینے کے بھی ہم معنی ہے جو اسی دین پر گزر چکے ہیں ـــــ قریش کو یہی راستا سمجھ میں آیا اور انہوں نے بڑی تیزی سے اس پر چلنا شروع کر دیا۔

قریش ابوطالب کی خدمت میں

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اشرافِ قریش سے چند آدمی ابوطالب کے پاس گئے اور بولے: "اے ابوطالب! آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے، ہمارے دین کی عیب چینی کی ہے، ہماری عقلوں کو حماقت زدہ کہا ہے، اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ قرار دیا ہے۔ لہذا یا تو آپ انہیں اس سے روک دیں، یا ہمارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جائیں کیونکہ آپ بھی ہماری ہی طرح ان سے مختلف دین پر ہیں۔ ہم ان کے معاملے میں آپ کے لیے بھی کافی رہیں گے۔"

اس کے جواب میں ابوطالب نے نرم بات کہی اور رازدارانہ لب و لہجہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ اپنے سابقہ طریقے پر رواں دواں رہتے ہوئے اللہ کا دین پھیلانے اور اس کی تبلیغ کرنے میں مصروف رہے۔[۵]

حُجّاج کو روکنے کے لیے مجلس شوریٰ

ان ہی دنوں قریش کے سامنے ایک اور مشکل آن کھڑی ہوئی یعنی ابھی کھلم کھلا تبلیغ پر چند ہی مہینے گذرے تھے کہ موسم حج قریب آگیا۔ قریش کو معلوم تھا کہ اب عرب کے وفود کی آمد شروع ہوگی۔ اس لیے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ نبی ﷺ کے متعلق کوئی ایسی بات کہیں کہ جس کی وجہ سے اہلِ عرب کے دلوں پر آپ کی تبلیغ کا اثر نہ ہو۔ چنانچہ وہ اس بات پر گفت و شنید کے لیے ولید بن مغیرہ کے پاس اکٹھے ہوئے۔ ولید نے کہا اس بارے میں تم سب لوگ ایک رائے اختیار کرو تم میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ خود تمہارا ہی ایک آدمی دوسرے آدمی کی تکذیب کر دے اور ایک کی بات دوسرے کی بات کو کاٹ دے۔ لوگوں نے کہا آپ ہی کہیے۔ اس نے کہا، نہیں تم لوگ کہو، میں سنوں گا۔ اس

---

۵ ابن ہشام ۱/۲۶۵

پر چند لوگوں نے کہا ہم کہیں گے وہ کاہن ہے، ولید نے کہا، نہیں بخدا وہ کاہن نہیں ہے ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ اس شخص کے اندر نہ کاہنوں جیسی گنگناہٹ ہے۔ نہ ان کے جیسی قافیہ گوئی اور تک بندی۔

اس پر لوگوں نے کہا، تب ہم کہیں گے کہ وہ پاگل ہے۔ ولید نے کہا، نہیں، وہ پاگل بھی نہیں۔ ہم نے پاگل بھی دیکھے ہیں اور ان کی کیفیت بھی۔ اس شخص کے اندر نہ پاگلوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت اور اُلٹی سیدھی حرکتیں ہیں اور نہ ان کے جیسی بہکی بہکی باتیں۔

لوگوں نے کہا، تب ہم کہیں گے کہ وہ شاعر ہے۔ ولید نے کہا وہ شاعر بھی نہیں۔ ہمیں رجز، ہجز، قریض، مقبوض، مبسوط سارے ہی اصنافِ سخن معلوم ہیں۔ اس کی بات بہرحال شعر نہیں ہے۔

لوگوں نے کہا، تب ہم کہیں گے کہ وہ جادوگر ہے۔ ولید نے کہا، یہ شخص جادوگر بھی نہیں۔ ہم نے جادوگر اور ان کا جادو بھی دیکھا ہے، یہ شخص نہ تو ان کی طرح جھاڑ پھونک کرتا ہے نہ گرہ لگاتا ہے۔

لوگوں نے کہا، تب ہم کیا کہیں گے؟ ولید نے کہا، خدا کی قسم اس کی بات بڑی شیریں ہے۔ اس کی جڑ پائیدار ہے اور اس کی شاخ پھلدار۔ تم جو بات بھی کہو گے لوگ اسے باطل سمجھیں گے البتہ اس کے بارے میں سب سے مناسب بات یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ جادوگر ہے۔ اس نے ایسا کلام پیش کیا ہے جو جادو ہے۔ اس سے باپ بیٹے، بھائی بھائی، شوہر بیوی اور کنبے قبیلے میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ بالآخر لوگ اسی تجویز پر متفق ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے[۶]

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ جب ولید نے لوگوں کی ساری تجویزیں رد کر دیں تو لوگوں نے کہا کہ پھر آپ ہی اپنی بے داغ رائے پیش کیجئے۔ اس پر ولید نے کہا: ذرا سوچ لینے دو۔ اس کے بعد وہ سوچتا رہا سوچتا رہا یہاں تک کہ اپنی مذکورہ بالا رائے ظاہر کی[۷]

اسی معاملے میں ولید کے متعلق سورہ مدثر کی سولہ آیات (۱۱ تا ۲۶) نازل ہوئیں جن میں سے چند آیات کے اندر اس کے سوچنے کی کیفیت کا نقشہ بھی کھینچا گیا چنانچہ ارشاد ہوا:

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۝ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ (۷۴/۱۸-۲۵)

---

[۶] ابن ہشام ۱/۲۷۱ [۷] فی ظلال القرآن پارہ ۲۹/۱۸۸

"اس نے سوچا اور اندازہ لگایا۔ وہ غارت ہو۔ اس نے کیسا اندازہ لگایا، پھر غارت ہو اس نے کیسا اندازہ لگایا! پھر نظر دوڑائی۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بسورا۔ پھر پلٹا اور تکبر کیا۔ آخر کار کہا کہ یہ نرالا جادو ہے جو پہلے سے نقل ہوتا آرہا ہے۔ یہ محض انسان کا کلام ہے۔"

بہر حال یہ قرارداد طے پا چکی تو اسے جامۂ عمل پہنانے کی کارروائی شروع ہوئی۔ کچھ کفارِ مکہ عازمین حج کے مختلف راستوں پر بیٹھ گئے اور وہاں سے ہر گذرنے والے کو آپؐ کے "خطرے" سے آگاہ کرتے ہوئے آپؐ کے متعلق تفصیلات بتانے لگے۔[۸]

اس کام میں سب سے زیادہ پیش پیش ابولہب تھا۔ وہ حج کے ایام میں لوگوں کے ڈیروں اور عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں آپؐ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ آپؐ اللہ کے دین کی تبلیغ کرتے اور ابولہب پیچھے پیچھے یہ کہتا کہ اس کی بات نہ ماننا یہ جھوٹا بددین ہے۔[۹]

اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس حج سے اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ آپؐ نے دعویٔ نبوت کیا ہے اور یوں ان کے ذریعے پورے دیارِ عرب میں آپؐ کا چرچا پھیل گیا۔

محاذ آرائی کے مختلف انداز

جب قریش نے دیکھا کہ محمد ﷺ کو تبلیغ دین سے روکنے کی حکمت کارگر نہیں ہو رہی ہے تو ایک بار پھر انہوں نے غور و خوض کیا اور آپؐ کی دعوت کا قلع قمع کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جن کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ہنسی، ٹھٹھا، تحقیر، استہزاء اور تکذیب۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو بددل کر کے ان کے حوصلے توڑ دیے جائیں۔ اس کے لیے مشرکین نے نبی ﷺ کو ناروا تہمتوں اور بیہودہ گالیوں کا نشانہ بنایا۔

چنانچہ وہ کبھی آپؐ کو پاگل کہتے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ (۶:۱۵)

"ان کفار نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل ہوا تو یقیناً پاگل ہے۔"

اور کبھی آپؐ پر جادوگر اور جھوٹے ہونے کا الزام لگاتے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

---

۸ ابن ہشام ۱/۲۷۱ ۹ ترمذی۔ مسند احمد ۳/۴۹۲-۴/۳۴۱۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ○ (۳۸:۴)

"انہیں حیرت ہے کہ خود انہیں میں سے ایک ڈرانیوالا آیا اور کافرین کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے جھوٹا ہے۔"

یہ کفار آپ کے آگے پیچھے پُرغضب، منتقمانہ نگاہوں اور بھڑکتے ہوئے جذبات کے ساتھ چلتے تھے۔ ارشاد ہے:

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ○ (۶۸:۵۱)

"اور جب کفار اس قرآن کو سنتے ہیں تو آپ کو ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ گویا آپ کے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ یقیناً پاگل ہے۔"

اور جب آپ کسی جگہ تشریف فرما ہوتے اور آپ کے اردگرد کمزور اور مظلوم صحابہ کرامؓ موجود ہوتے تو انہیں دیکھ کر مشرکین استہزاء کرتے ہوئے کہتے:

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ (۶:۵۳)

"اچھا یہی حضرات ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان سے احسان فرمایا ہے!"

جواباً اللہ کا ارشاد ہے:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○ (۶:۵۳)

"کیا اللہ شکر گزاروں کو سب سے زیادہ نہیں جانتا!"

عام طور پر مشرکین کی کیفیت وہی تھی جس کا نقشہ ذیل کی آیات میں کھینچا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ○ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ○ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ○ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ○ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ○ (۸۳: ۲۹-۳۳)

"جو مجرم تھے وہ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گذرتے تو آنکھیں مارتے تھے اور جب اپنے گھروں کو پلٹتے تو لطف اندوز ہوتے ہوئے پلٹتے تھے۔ اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہی گمراہ ہیں، حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔"

(۲) **محاذ آرائی کی دوسری صورت** آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنا شکوک و شبہات پیدا کرنا، جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا۔ تعلیمات سے لے کر شخصیت تک کو واہیات اعتراضوں کا نشانہ بنانا اور یہ سب

اس کثرت سے کرنا کہ عوام کو آپؐ کی دعوت و تبلیغ پر غور کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ چنانچہ مشرکین قرآن کے متعلق کہتے تھے،

.. اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ (۲۵:۵)

"یہ پہلوں کے افسانے ہیں جنہیں آپؐ نے لکھوا لیا ہے۔ اب یہ آپؐ پر صبح و شام تلاوت کئے جاتے ہیں"

.. اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ (۲۵:۴)

"یہ محض جھوٹ ہے جسے اس نے گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر اس کی اعانت کی ہے"

مشرکین یہ بھی کہتے تھے کہ

.. اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ (۱۶:۱۰۳)

یہ (قرآن) تو آپ کو ایک انسان سکھاتا ہے"

رسول اللہ ﷺ پر ان کا اعتراض یہ تھا:

.. مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ (۲۵:۷)

یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے۔ اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے!

قرآن شریف کے بہت سے مقامات پر مشرکین کا رد بھی کیا گیا ہے کہیں اعتراض نقل کر کے اور کہیں نقل کے بغیر۔

۳- محاذ آرائی کی تیسری صورت

پہلوں کے واقعات اور افسانوں سے قرآن کا مقابلہ کرنا اور لوگوں کو اسی میں الجھائے اور پھنسائے رکھنا۔

چنانچہ نضر بن حارث کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک بار قریش سے کہا: "قریش کے لوگو! خدا کی قسم تم پر ایسی افتاد آن پڑی ہے کہ تم لوگ اب تک اس کا کوئی توڑ نہیں لا سکے۔ محمدؐ تم میں جوان تھے تو تمہارے سب سے پسندیدہ آدمی تھے۔ سب سے زیادہ سچے اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھے۔ اب جبکہ ان کی کنپٹیوں پر سفیدی دکھائی پڑنے کو ہے (یعنی ادھیڑ ہو چلے ہیں) اور وہ تمہارے پاس کچھ باتیں لے کر آئے ہیں تو تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہیں! نہیں بخدا وہ جادوگر نہیں۔ ہم نے جادوگر دیکھے ہیں۔ ان کی جھاڑ پھونک اور گرہ بندی بھی دیکھی ہے۔ اور تم لوگ کہتے ہو وہ کاہن ہیں۔ نہیں،

بخدا وہ کاہن بھی نہیں۔ ہم نے کاہن بھی دیکھے ہیں، ان کی اُلٹی سیدھی حرکتیں بھی دیکھی ہیں اور ان کی فقرہ بندیاں بھی سُنی ہیں۔ تم لوگ کہتے ہو وہ شاعر ہیں۔ نہیں بخدا وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے شعر بھی دیکھا ہے اور اسکے سارے اصناف، ہجز، رجز، وغیرہ سنے ہیں۔ تم لوگ کہتے ہو وہ پاگل ہیں۔ نہیں، بخدا وہ پاگل بھی نہیں، ہم نے پاگل پن بھی دیکھا ہے۔ یہاں نہ اس طرح کی گھٹن ہے نہ ویسی بہکی بہکی باتیں اور نہ ان کے جیسی فریب کارانہ گفتگو۔ قریش کے لوگو! سوچو! خدا کی قسم تم پر زبردست افتاد آن پڑی ہے۔"

اس کے بعد نضر بن حارث حیرہ گیا، وہاں بادشاہوں کے واقعات اور رستم و اسفندیار کے قصے سیکھے۔ پھر واپس آیا تو جب رسول اللہ ﷺ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کی باتیں کرتے اور اس کی گرفت سے لوگوں کو ڈراتے تو آپؐ کے بعد یہ شخص وہاں پہنچ جاتا اور کہتا کہ بخدا! محمدؐ کی باتیں مجھ سے بہتر نہیں۔ اس کے بعد وہ فارس کے بادشاہوں اور رستم و اسفندیار کے قصے سناتا پھر کہتا: آخر کس بنا پر محمدؐ کی بات مجھ سے بہتر ہے؟[1]

ابن عباس کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نضر نے چند لونڈیاں خرید رکھی تھیں اور جب وہ کسی آدمی کے متعلق سنتا کہ وہ نبی ﷺ کی طرف مائل ہے تو اس پر ایک لونڈی مسلط کر دیتا، جو اسے کھلاتی پلاتی اور گانے سناتی یہاں تک کہ اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ باقی نہ رہ جاتا اسی سلسلے میں یہ ارشادِ الٰہی نازل ہوا[2]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ... (۳۱:۶)

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو کھیل کی بات خریدتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں" (۳۱-۶)

۴- محاذ آرائی کی چوتھی صورت

سودے بازیاں جن کے ذریعے مشرکین کی یہ کوشش تھی کہ اسلام اور جاہلیت دونوں بیچ راستے میں ایک دوسرے سے جا ملیں یعنی کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر اپنی بعض باتیں مشرکین چھوڑ دیں اور بعض باتیں نبی ﷺ چھوڑ دیں۔ قرآن پاک میں اسی کے متعلق ارشاد ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ (۶۸:۹)

"وہ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے پڑ جائیں تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں"

چنانچہ ابن جریر اور طبرانی کی ایک روایت ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو یہ تجویز

---

[1] ابن ہشام ۱/۲۹۹، ۳۰۰، ۲۵۸ مختصر السیرہ شیخ عبداللہ ۱۱۷، ۱۱۸۔

[2] فتح القدیر للشوکانی ۴/۲۳۷ و دیگر کتب تفسیر۔

پیش کی کہ ایک سال آپؐ ان کے معبودوں کی پوجا کیا کریں اور ایک سال وہ آپؐ کے رب کی عبادت کیا کریں گے۔ عَبد بن حُمَید کی ایک روایت اس طرح ہے کہ مشرکین نے کہا اگر آپؐ ہمارے معبودوں کو قبول کر لیں تو ہم بھی آپؐ کے خدا کی عبادت کریں گے۔[۱۲]

ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ رسُول اللہ ﷺ زمانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اَسوَد بن مُطّلب بن اَسَد بن عبدالعُزّیٰ، ولید بن مغیرہ، اُمیّہ بن خَلَف اور عاص بن وائل سَہمی آپؐ کے سامنے آئے یہ سب اپنی قوم کے بڑے لوگ تھے۔ بولے "اے محمدؐ آؤ جسے تم پوجتے ہو اسے ہم بھی پوجیں۔ اور جسے ہم پوجتے ہیں اسے تم بھی پوجو۔ اس طرح ہم اور تم اس کام میں مشترک ہو جائیں۔ اب اگر تمہارا معبود ہمارے معبود سے بہتر ہے تو ہم اس سے اپنا حصہ حاصل کر چکے ہوں گے اور اگر ہمارا معبود تمہارے معبود سے بہتر ہوا تو تم اس سے اپنا حصہ حاصل کر چکے ہو گے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پوری سورہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ نازل فرمائی، جس میں اعلان کیا گیا کہ جسے تم لوگ پوجتے ہو اسے میں نہیں پوج سکتا[۱۳] اور اس فیصلہ کن جواب کے ذریعے ان کی مضحکہ خیز گفت و شنید کی جڑ کاٹ دی گئی۔ روایتوں میں اختلاف غالباً اس لیے ہے کہ اس سودے بازی کی کوشش بار بار کی گئی۔

ظُلم و جَور

۴ سنہ نبوت میں جب پہلی بار اسلامی دعوت منظر عام پر آئی تو مشرکین نے اسے دبانے کے لیے وہ کارروائیاں انجام دیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ یہ کارروائیاں تھوڑی تھوڑی اور درجہ بدرجہ عمل میں لائی گئیں اور ہفتوں بلکہ مہینوں مشرکین نے اس سے آگے قدم نہیں بڑھایا اور ظلم و زیادتی شروع نہیں کی لیکن جب دیکھا کہ یہ کارروائیاں اسلامی دعوت کی راہ روکنے میں مؤثر ثابت نہیں ہو رہی ہیں تو ایک بار پھر جمع ہوئے اور ۲۵ سردارانِ قریش کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا سربراہ رسول اللہ ﷺ کا چچا ابولہب تھا۔ اس کمیٹی نے باہمی مشورے اور غور و خوض کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے خلاف ایک فیصلہ کن قرارداد منظور کی۔ یعنی یہ طے کیا کہ اسلام کی مخالفت، پیغمبر اسلام کی ایذا رسانی اور اسلام لانے والوں کو طرح طرح کے جور و ستم اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔[۱۴]

---

[۱۲] فتح القدیر للشوکانی ۵/۵۰۸، [۱۳] ابنِ ہشام ۱/۳۶۲

[۱۴] دیکھئے رحمۃ للعالمین ۱/۵۹، ۶۰

مشرکین نے یہ قرار داد طے کر کے اسے رُوبہ عمل لانے کا عزم مصمم کر لیا۔ مسلمانوں اور خصوصاً کمزور مسلمانوں کے اعتبار سے تو یہ کام بہت آسان تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے لحاظ سے بڑی مشکلات تھیں۔ آپؐ ذاتی طور پر پُرشکوہ، باوقار اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ دوست دشمن سبھی آپؐ کو تعظیم کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپؐ جیسی شخصیت کا سامنا اکرام و احترام ہی سے کیا جا سکتا تھا اور آپؐ کے خلاف کسی نیچ اور ذلیل حرکت کی جرأت کوئی رذیل اور احمق ہی کر سکتا تھا۔ اس ذاتی عظمت کے علاوہ آپؐ کو ابو طالب کی حمایت و حفاظت بھی حاصل تھی اور ابو طالب مکے کے اُن گنے چُنے لوگوں میں سے تھے جو اپنی ذاتی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اتنے باعظمت تھے کہ کوئی شخص ان کا عہد توڑنے اور ان کے خانوادے پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت حال نے قریش کو سخت قلق، پریشانی اور کشمکش سے دوچار کر رکھا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو دعوت ان کی مذہبی پیشوائی اور دنیاوی سربراہی کی جڑ کاٹ دینا چاہتی تھی آخر اس پر اتنا لمبا صبر کب تک؟ بالآخر مشرکین نے ابولہب کی سربراہی میں نبی ﷺ اور مسلمانوں پر ظلم و جور کا آغاز کر دیا۔ درحقیقت نبی ﷺ کے متعلق ابولہب کا موقف روزِ اوّل ہی سے جبکہ ابھی قریش نے اس طرح کی بات سوچی بھی نہ تھی یہی تھا۔ اس نے بنی ہاشم کی مجلس میں جو کچھ کیا، پھر کوہِ صفا پر جو حرکت کی اس کا ذکر پچھلے صفحات میں آ چکا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس نے کوہِ صفا پر نبی ﷺ کو مارنے کے لیے ایک پتھر بھی اٹھایا تھا۔[۱۵]

بعثت سے پہلے ابولہب نے اپنے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتیبہ کی شادی نبی ﷺ کی دو صاحبزادیوں رقیہؓ اور اُم کلثومؓ سے کی تھی لیکن بعثت کے بعد اس نے نہایت سختی اور درشتی سے ان دونوں کو طلاق دلوا دی۔[۱۶]

اسی طرح جب نبی ﷺ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا تو ابولہب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ دوڑتا ہوا اپنے رفقاء کے پاس پہنچا اور انہیں یہ "خوشخبری" سنائی کہ محمد ﷺ ابتر (نسل بریدہ) ہو گئے ہیں۔[۱۷]

ہم یہ بھی ذکر کر چکے ہیں کہ ایام حج میں ابولہب نبی ﷺ کی تکذیب کے لیے بازاروں اور اجتماعات میں آپؐ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔ طارق بن عبداللہ محاربی کی روایت سے معلوم ہوتا

---

۱۵ ترمذی۔ ۱۶ فی ظلال القرآن ۳۰/۲۸۲، تفہیم القرآن ۶/۵۲۲۔
۱۷ تفہیم القرآن ۶/۴۹۰۔

ہے کہ یہ شخص صرف تکذیب ہی پر بس نہیں کرتا تھا بلکہ پتھر بھی مارتا رہتا تھا جس سے آپؐ کی ایڑیاں خون آلود ہو جاتی تھیں[۱۸]

ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل، جس کا نام اَرْوٰی تھا اور جو حرب بن اُمیہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بہن تھی، وہ بھی نبی ﷺ کی عداوت میں اپنے شوہر سے پیچھے نہ تھی، چنانچہ وہ نبی ﷺ کے راستے میں اور دروازے پر رات کو کانٹے ڈال دیا کرتی تھی۔ خاصی بدزبان اور مفسدہ پرداز بھی تھی، چنانچہ نبی ﷺ کے خلاف بدزبانی کرنا، لمبی چوڑی دسیسہ کاری و افترا پردازی سے کام لینا، فتنے کی آگ بھڑکانا، اور خوفناک جنگ بپا رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ اسی لیے قرآن نے اس کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (لکڑی ڈھونے والی) کا لقب عطا کیا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی اور اس کے شوہر کی مذمت میں قرآن نازل ہوا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ آپؐ خانہ کعبہ کے پاس مسجدِ حرام میں تشریف فرما تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے۔ یہ مٹھی بھر پتھر لیے ہوئے تھی۔ سامنے کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی اور وہ رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھ سکی۔ صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سامنے پہنچتے ہی سوال کیا، ابوبکر تمہارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو کرتا ہے۔ بخدا اگر میں اسے پا گئی تو اس کے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔ دیکھو! خدا کی قسم میں بھی شاعرہ ہوں پھر اس نے یہ شعر سنایا۔

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا وَأَمْرَهُ أَبَيْنَا وَدِينَهُ قَلَيْنَا[۱۹]

"ہم نے مذمم کی نافرمانی کی۔ اس کے امر کو تسلیم نہ کیا اور اس کے دین کو نفرت و حقارت سے چھوڑ دیا۔"

اس کے بعد واپس چلی گئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا! یا رسول اللہ! ﷺ کیا اس نے آپؐ کو دیکھا نہیں۔؟ آپؐ نے فرمایا نہیں؟ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی تھی[۲۰]

ابوبکر بزار نے بھی یہ واقعہ روایت کیا ہے اور اس میں اتنا مزید اضافہ ہے کہ جب وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہوئی تھی تو اس نے یہ بھی کہا "ابوبکر! تمہارے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے۔ ابوبکرؓ نے کہا، نہیں اس عمارت کے رب کی قسم، وہ شعر کہتے ہیں نہ اسے زبان پر لاتے ہیں۔ اس نے کہا تم سچ کہتے ہو۔"

---

[۱۸] جامع الترمذی۔ [۱۹] مشرکین مل کر نبی ﷺ کو محمد کے بجائے مُذَمَّم کہتے تھے جس کا معنی محمد کے معنی کے بالکل برعکس ہے محمد: وہ شخص ہے جس کی تعریف کی جائے۔ مذمم: وہ شخص ہے جس کی مذمت اور برائی کی جائے۔ [۲۰] ابن ہشام ۱/ ۳۳۵، ۳۳۶

ابولہب اس کے باوجود یہ ساری حرکتیں کر رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چچا اور پڑوسی تھا۔ اس کا گھر آپؐ کے گھر سے متصل تھا۔ اسی طرح آپؐ کے دوسرے پڑوسی بھی آپؐ کو گھر کے اندر ستاتے تھے

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جو گروہ گھر کے اندر رسول اللہ ﷺ کو اذیت دیا کرتا تھا وہ یہ تھا۔ ابولہب، حکم بن ابی العاص بن اُمیّہ، عُقبہ بن ابی مُعیط، عَدِی بن حمراء ثقفی، ابن الاصداء ھُذَلی۔ یہ سب کے سب آپؐ کے پڑوسی تھے اور ان میں سے حکم بن[۲۱] ابی العاص کے علاوہ کوئی بھی مسلمان نہ ہوا۔ ان کے ستانے کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپؐ نماز پڑھتے تو کوئی شخص بکری کی بچہ دانی اس طرح ٹکا کر پھینکتا کہ وہ ٹھیک آپؐ کے اوپر گرتی۔ چولھے پر ہانڈی چڑھائی جاتی تو بچہ دانی اس طرح پھینکتے کہ سیدھے ہانڈی میں جا گرتی۔ آپؐ نے مجبور ہو کر ایک گھروندا بنا لیا تاکہ نماز پڑھتے ہوئے ان سے بچ سکیں۔

بہر حال جب آپؐ پر یہ گندگی پھینکی جاتی تو آپؐ اسے لکڑی پر لے کر نکلتے اور دروازے پر کھڑے ہو کر فرماتے: "اے بنی عبد مناف! یہ کیسی ہمسائگی ہے؟" پھر اسے راستے میں ڈال دیتے۔[۲۲]

عُقبہ بن ابی مُعیط اپنی بدبختی اور خباثت میں اور بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے، اور ابوجہل اور اس کے کچھ رفقاء بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں بعض نے بعض سے کہا، کون ہے جو بنی فلاں کے اُونٹ کی اوجھڑی لائے اور جب محمد ﷺ سجدہ کریں تو ان کی پیٹھ پر ڈال دے؟ اس پر قوم کا بدبخت ترین آدمی ـــــ عقبہ بن ابی معیط[۲۳] ـــــ اٹھا اور اوجھ لا کر انتظار کرنے لگا جب نبی ﷺ سجدے میں تشریف لے گئے تو اسے آپؐ کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ڈال دیا۔ میں سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ کاش میرے اندر بچانے کی طاقت ہوتی۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ اور رسول اللہ ﷺ سجدے ہی میں پڑے رہے۔ سر نہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ فاطمہؓ آئیں اور آپ کی پیٹھ سے اوجھ ہٹا کر پھینکی تب آپؐ نے سر اٹھایا۔ پھر تین بار فرمایا اَللّٰھُمَّ عَلَیْکَ بِقُرَیْشٍ "اے اللہ تو قریش کو پکڑ لے"۔ جب آپؐ نے بد دعا کی تو ان پر بہت گراں گذری۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اس شہر میں دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے نام لے لے کر بد دعا کی: اے

---

[۲۱] یہ اُموی خلیفہ مروان بن حکم کے باپ ہیں۔ [۲۲] ابن ہشام ۱/۴۱۶۔
[۲۳] خود صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں اس کی صراحت آگئی ہے۔ دیکھئے ۱/۵۴۳۔

اللہ! ابوجہل کو پکڑے۔ اور عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، اُمیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی مُعیط کو پکڑے ——

انہوں نے ساتویں کا بھی نام گنایا۔ لیکن راوی کو یاد نہ رہا —— ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کے نام رسول اللہ ﷺ نے گن گن کر لیے تھے۔ سب کے سب بدر کے کنویں میں مقتول پڑے ہوئے تھے[۲۴]

اُمیہ بن خلف کا وطیرہ تھا کہ وہ جب رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو لعن طعن کرتا۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (۱۰۴: ۱) ہر لعن طعن اور برائیاں کرنے والے کیلئے تباہی ہے۔ ابنِ ہشام کہتے ہیں کہ ہُمَزَہ وہ شخص ہے جو علانیہ گالی بکے اور آنکھیں ٹیڑھی کر کے اشارے کرے۔ اور لُمَزَہ وہ شخص ہے جو پیٹھ پیچھے لوگوں کی برائیاں کرے اور انہیں اذیت دے[۲۵]

اُمیہ کا بھائی اُبَی بن خلف، عُقبہ بن ابی مُعیط کا گہرا دوست تھا۔ ایک بار عُقبہ نے نبی ﷺ کے پاس بیٹھ کر کچھ سنا۔ اُبَی کو معلوم ہوا تو اس نے عقبہ کو سخت سست کہا، عتاب کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ جا کر رسول اللہ ﷺ کے منہ پر تھوک آئے۔ آخر عُقبہ نے ایسا ہی کیا۔ خود اُبَی بن خلف نے ایک مرتبہ ایک بوسیدہ ہڈی لا کر توڑی اور ہوا میں پھونک کر رسول اللہ ﷺ کی طرف اُڑا دی[۲۶]

اَخنس بن شُریق ثقفی بھی رسول اللہ ﷺ کے ستانے والوں میں تھا۔ قرآن میں اس کے نو اوصاف بیان کئے گئے ہیں جس سے اس کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ (۶۸: ۱۰-۱۳)

"تم بات نہ مانو کسی قسم کھانے والے ذلیل کی جو لعن طعن کرتا ہے، چغلیاں کھاتا ہے۔ بھلائی سے روکتا ہے، حد درجہ ظالم، بدعمل اور جفا کار ہے۔ اور اس کے بعد بداصل بھی ہے۔"

ابوجہل کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر قرآن سنتا تھا لیکن بس سنتا ہی تھا۔ ایمان و اطاعت اور ادب و خشیت اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی بات سے اذیت

---

۲۴ صحیح البخاری کتاب الوضوء باب اذا القی علی المصلی قذر او جیفۃ ۱/۳۷۔

۲۵ ابنِ ہشام ۱/۳۵۶، ۳۵۷۔ ۲۶ ابنِ ہشام ۱/۳۶۱، ۳۶۲

پہنچاتا اور اللہ کی راہ سے روکتا تھا۔ پھر اپنی اس حرکت اور بُرائی پر ناز اور فخر کرتا ہُوا جاتا تھا۔ گویا اس نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیات اسی شخص کے بارے میں نازل ہوئیں:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى الخ (۷۵: ۳۱) "نہ اس نے صدقہ دیا نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ پھیری۔ پھر وہ اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کے پاس گیا۔ تیرے خوب لائق ہے۔ خوب لائق ہے۔"

اس شخص نے پہلے دن جب نبی ﷺ کو نماز پڑھتے ہُوئے دیکھا تو اسی دن سے آپؐ کو نماز سے روکتا رہا۔ ایک بار نبی ﷺ مقامِ ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے کہ اس کا گذر ہوا۔ دیکھتے ہی بولا "محمدؐ! کیا میں نے تجھے اس سے منع نہیں کیا تھا؟" ساتھ ہی دھمکی بھی دی۔ رسُول اللہ ﷺ نے بھی ڈانٹ کر سختی سے جواب دیا۔ اس پر وہ کہنے لگا۔ اے محمدؐ! مجھے کاہے کی دھمکی دے رہے ہو، دیکھو! خدا کی قسم! اس وادی (مکہ) میں میری محفل سب سے بڑی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ[۲۸] (اچھا! تو وہ بلائے اپنی محفل کو، ہم بھی سزا کے فرشتوں کو بلائے دیتے ہیں۔)

ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسُول اللہ ﷺ نے اس کا گریبان گلے کے پاس سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑتے ہُوئے فرمایا۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ (۷۵: ۳۴/۳۵)

"تیرے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ تیرے لیے بہت ہی موزوں ہے۔"

اس پر اللہ کا یہ دشمن کہنے لگا: "اے محمدؐ! مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ خدا کی قسم تم اور تمہارا پروردگار میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ میں مکے کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان چلنے پھرنے والوں میں سب سے زیادہ معزز ہوں۔"[۲۹]

بہرحال اس ڈانٹ کے باوجود ابوجہل اپنی حماقت سے باز آنے والا نہ تھا بلکہ اس کی بدبختی میں کچھ اور اضافہ ہی ہو گیا، چنانچہ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک بار سردارانِ قریش سے) ابوجہل نے کہا کہ محمدؐ آپ حضرات کے رُوبرُو اپنا چہرہ خاک آلود کرتا ہے؟ جواب دیا گیا۔ ہاں! اس نے کہا لات و عُزّیٰ کی قسم! اگر میں نے (اس حالت میں) اسے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند دوں گا۔ اور اس کا چہرہ مٹی پر رگڑ دوں گا۔ اسکے بعد اس نے رسُول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہُوئے

---

۲۷ فی ظلال القرآن ۲۹/۲۱۲ ۲۸ فی ظلال القرآن ۳۰/۲۰۸ ۲۹ ایضاً ۲۹/۳۱۲۔

دیکھ لیا اور اس زعم میں چلا کہ آپؐ کی گردن روند دے گا، لیکن لوگوں نے اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایڑی کے بل پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھ سے بچاؤ کر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا، ابوالحکم! تمہیں کیا ہوا؟ اس نے کہا: میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق ہے۔ ہولناکیاں ہیں اور پر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو اچک لیتے۔[۳۰]

جور و ستم کی یہ کارروائیاں نبی ﷺ کے ساتھ ہو رہی تھیں اور عوام و خواص کے نفوس میں آپؐ کی منفرد شخصیت کا جو وقار و احترام تھا اور آپؐ کو مکے کے سب سے محترم اور عظیم انسان ابوطالب کی جو حمایت و حفاظت حاصل تھی اس کے باوجود ہو رہی تھیں۔ باقی رہیں وہ کارروائیاں جو مسلمانوں اور خصوصاً ان میں سے بھی کمزور افراد کی ایذا رسانی کے لیے کی جا رہی تھیں تو وہ کچھ زیادہ ہی سنگین اور تلخ تھیں۔ ہر قبیلہ اپنے مسلمان ہونے والے افراد کو طرح طرح کی سزائیں دے رہا تھا اور جس شخص کا کوئی قبیلہ نہ تھا ان پر اوباشوں اور سرداروں نے ایسے ایسے جور و ستم روا رکھے تھے جنہیں سن کر مضبوط انسان کا دل بھی بے چینی سے تڑپنے لگتا ہے۔

ابوجہل جب کسی معزز اور طاقتور آدمی کے مسلمان ہونے کی خبر سنتا تو اسے برا بھلا کہتا ذلیل و رسوا کرتا اور مال و جاہ کو سخت خسارے سے دوچار کرنے کی دھمکیاں دیتا اور اگر کوئی کمزور آدمی مسلمان ہوتا تو اسے مارتا اور دوسروں کو بھی برانگیختہ کرتا۔[۳۱]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا چچا انہیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے دھواں دیتا۔[۳۲]

حضرت مُصعَب بن عُمَیر رضی اللہ عنہ کی ماں کو ان کے اسلام لانے کا علم ہوا تو ان کا دانہ پانی بند کر دیا اور انہیں گھر سے نکال دیا۔ یہ بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ حالات کی شدت سے دوچار ہوئے تو کھال اس طرح ادھڑ گئی جیسے سانپ کچلی چھوڑتا ہے۔[۳۳]

حضرت بلالؓ، اُمیّہ بن خلف جُمحی کے غلام تھے۔ اُمیّہ انکی گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کو دے دیتا تھا اور وہ انہیں مکے کے پہاڑوں میں گھماتے پھرتے تھے یہاں تک کہ گردن پر رسی کا نشان پڑ جاتا تھا۔ خود اُمیّہ بھی انہیں باندھ کر ڈنڈے سے مارتا تھا اور چلچلاتی دھوپ میں جبراً بٹھائے رکھتا تھا۔ کھانا پانی بھی نہ دیتا بلکہ بھوکا پیاسا رکھتا تھا اور اس سے کہیں بڑھ کر یہ ظلم کرتا تھا

---

[۳۰] صحیح مسلم۔ [۳۱] ابن ہشام ۱/۳۲۰ [۳۲] رحمۃ للعالمین ۱/۵۷
[۳۳] ایضاً ۱/۵۸ و تلقیح فہوم اہل الاثر *

کہ جب دوپہر کی گرمی شباب پر ہوتی تو مکہ کے پتھریلے کنکروں پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھوا دیتا۔ پھر کہتا خدا کی قسم! تو اسی طرح پڑا رہے گا یہاں تک کہ مرجائے، یا محمدؐ کے ساتھ کفر کرے۔ حضرت بلالؓ اس حالت میں بھی فرماتے اَحَدٌ اَحَدٌ۔ ایک روز یہی کارروائی کی جارہی تھی کہ ابوبکرؓ کا گذر ہوا۔ انہوں نے حضرت بلالؓ کو ایک کالے غلام کے بدلے، اور کہا جاتا ہے کہ دو سو درہم (۷۳۵ گرام چاندی) یا دو سو اسّی درہم (ایک کیلو سے زائد چاندی) کے بدلے خرید کر آزاد کر دیا۔[۳۴]

حضرت عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ بنو مخزوم کے غلام تھے۔ انہوں نے اور ان کے والدین نے اسلام قبول کیا تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مشرکین جن میں ابوجہل پیش پیش تھا سخت دھوپ کے وقت انہیں پتھریلی زمین پر لے جاکر اس کی تپش سے سزا دیتے۔ ایک بار انہیں اسی طرح سزا دی جارہی تھی کہ نبی ﷺ کا گذر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: آلِ یاسر صبر کرنا۔ تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔ آخر کار یاسر ظلم کی تاب نہ لاکر وفات پاگئے اور سُمیّہؓ جو حضرت عمّارؓ کی والدہ تھیں، ان کی شرمگاہ میں ابوجہل نے نیزہ مارا، اور وہ دم توڑ گئیں۔ یہ اسلام میں پہلی شہیدہ ہیں۔ حضرت عمّارؓ پر سختی کا سلسلہ جاری رہا۔ انہیں کبھی دھوپ میں تپایا جاتا تو کبھی ان کے سینے پر سرخ پتھر رکھ دیا جاتا اور کبھی پانی میں ڈبویا جاتا۔ ان سے مشرکین کہتے تھے کہ جب تک تم محمدؐ کو گالی نہ دو گے یا لات و عُزّیٰ کے بارے میں کلمۂ خیر نہ کہو گے ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ حضرت عمّارؓ نے مجبوراً ان کی بات مان لی۔ پھر نبی ﷺ کے پاس روتے اور معذرت کرتے ہوئے تشریف لائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ .. (۱۶:۱۰۶)

جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا (اس پر اللہ کا غضب اور عذابِ عظیم ہے) لیکن جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (اس پر کوئی گرفت نہیں)[۳۵]

حضرت فُکَیہہ جن کا نام اَفْلَح تھا، بنی عبدالدار کے غلام تھے۔ ان کے یہ مالکان ان کا پاؤں رسی سے باندھ کر انہیں زمین پر گھسیٹتے تھے۔[۳۶]

حضرت خَبّابؓ بن اَرَتّ، قبیلہ خُزاعہ کی ایک عورت اُمِّ اَنمار کے غلام تھے۔ مشرکین انہیں طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ ان کے سر کے بال نوچتے تھے اور سختی سے گردن مروڑتے

---

۳۴ رحمۃ للعالمین ۱/۵۷ تلقیح فہوم ص۱۶ ابن ہشام ۱/۳۱۷، ۳۱۸۔

۳۵ ابن ہشام ۱/۳۱۹، ۳۲۰ فقہ السیرۃ محمد غزالی ص۶۲۔ عوفی نے ابن عباس سے اس کا بعض ٹکڑا روایت کیا ہے۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر زیر آیت مذکورہ

۳۶ رحمۃ للعالمین ۱/۵۷ بحوالہ اعجاز التنزیل ص۵۳

تھے۔ انہیں کئی بار دہکتے انگاروں پر لٹا کر اوپر سے پتھر رکھ دیا کہ وہ اٹھ نہ سکیں[۳۷]

زنیرہؓ[۳۸] اور نہدیہؓ اور ان کی صاحبزادی اور اُمِّ عبیسؓ یہ سب لونڈیاں تھیں۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کے ہاتھوں اسی طرح کی سنگین سزاؤں سے دوچار ہوئیں جن کے چند نمونے ذکر کئے جا چکے ہیں۔ قبیلہ بنی عدی کے ایک خانوادے بنی مؤمل کی ایک لونڈی مسلمان ہوئیں تو انہیں حضرت عمر بن خطاب ـــــ جو بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ـــــ اس قدر مارتے تھے کہ مارتے مارتے خود تھک جاتے تھے اور اس کے بعد کہتے تھے کہ میں نے تجھے کسی مروت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض تھک جانے کی وجہ سے چھوڑا ہے[۳۹]

آخر کار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلالؓ اور عامر بن فہیرہؓ کی طرح ان لونڈیوں کو بھی خرید کر آزاد کر دیا[۴۰]

مشرکین نے سزا کی ایک شکل یہ بھی اختیار کی تھی کہ بعض بعض صحابہ کو اونٹ اور گائے کی کچی کھال میں لپیٹ کر دھوپ میں ڈال دیتے تھے اور بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتے ہوئے پتھر پر لٹا دیتے تھے[۴۱] درحقیقت اللہ کی راہ میں ظلم و جور کا نشانہ بننے والوں کی فہرست بڑی لمبی ہے اور بڑی تکلیف دہ بھی۔ حالت یہ تھی کہ جس کسی کے مسلمان ہونے کا پتہ چل جاتا تھا مشرکین اس کے درپے آزار ہو جاتے تھے۔

دارِ ارقم ان ستم رانیوں کے مقابل حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو قولاً اور عملاً دونوں طرح اسلام کے اظہار سے روک دیں اور ان کے ساتھ خفیہ طریقے پر اکٹھے ہوں کیونکہ اگر آپ ان کے ساتھ کھلم کھلا اکٹھا ہوتے تو مشرکین آپ کے تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت کے کام میں یقیناً رکاوٹ ڈالتے اور اس کے نتیجے میں فریقین کے درمیان تصادم ہو سکتا تھا بلکہ عملاً ۴ سنہ نبوت میں ہو بھی چکا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ صحابہ کرام گھاٹیوں میں اکٹھے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار کفار قریش کے کچھ لوگوں نے دیکھ لیا تو گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑے پر اتر آئے۔ جواباً حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک شخص کو ایسی ضرب لگائی کہ اس کا خون بہ پڑا اور یہ پہلا خون تھا جو اسلام میں بہایا گیا[۴۲]

---

۳۷ رحمۃ للعالمین ۱/۵۷ تلقیح الفہوم ص۶۰ ۳۸ زنیرہ بروزن مسکینہ یعنی زکوزیرہ اور نون کو زیر اور تشدید

۳۹ رحمۃ للعالمین ۱/۵۷، ابن ہشام ۱/۳۱۹ - ۴۰ ابن ہشام ۱/۳۱۸، ۳۱۹

۴۱ رحمۃ للعالمین ۱/۵۸ - ۴۲ ابن ہشام ۱/۲۶۳ مختصر السیرۃ محمد بن عبدالوہاب ص۶۰

یہ واضح ہی ہے کہ اگر اس طرح کا ٹکراؤ بار بار ہوتا اور طول پکڑ جاتا تو مسلمانوں کے خاتمے کی نوبت آسکتی تھی لہٰذا حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ کام پس پردہ کیا جائے۔ چنانچہ عام صحابہ کرام اپنا اسلام اپنی عبادت اپنی تبلیغ اور اپنے باہمی اجتماعات سب کچھ پس پردہ کرتے تھے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ تبلیغ کا کام بھی مشرکین کے رُوبرُو کھلم کھلا انجام دیتے تھے اور عبادت کا کام بھی۔ کوئی چیز آپؐ کو اس سے روک نہیں سکتی تھی، تاہم آپ بھی مسلمانوں کے ساتھ خود ان کی مصلحت کے پیش نظر خفیہ طور سے جمع ہوتے تھے۔ ادھر ارقمؓ بن ابی الارقم مخزُومی کا مکان کوہِ صفا پر سرکشوں کی نگاہوں اور ان کی مجلسوں سے دُور الگ تھلگ واقع تھا۔ اس لیے آپؐ نے پانچویں سنہ نبوت سے اسی مکان کو اپنی دعوت اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے اجتماع کا مرکز بنالیا۔[۴۳]

پہلی ہجرتِ حبشہ جَور و ستم کا مذکورہ سلسلہ نبوت کے چوتھے سال کے درمیان یا آخر میں شروع ہُوا تھا اور ابتداءً معمولی تھا مگر دن بدن اور ماہ بماہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ نبوت کے پانچویں سال کا وسط آتے آتے اپنے شباب کو پہنچ گیا حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے مکہ میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ اور انہیں ان پیہم ستم رانیوں سے نجات کی تدبیر سوچنے کے لیے مجبور ہوجانا پڑا۔ ان ہی سنگین اور تاریک حالات میں سورۂ کہف نازل ہوئی۔ یہ اصلاً تو مشرکین کے پیش کردہ سوالات کے جواب میں تھی لیکن اس میں جو تین واقعات بیان کیے گئے ان واقعات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مومن بندوں کے لیے مستقبل کے بارے میں نہایت بلیغ اشارات تھے چنانچہ اصحابِ کہف کے واقعے میں یہ درس موجود ہے کہ جب دین و ایمان خطرے میں ہو تو کفر و ظلم کے مراکز سے ہجرت کے لیے تن بہ تقدیر نکل پڑنا چاہیئے، ارشاد ہے:

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ○ (۱۸:۱۶)

"اور جب تم ان سے اور اللہ کے سوا ان کے دوسرے معبودوں سے الگ ہوگئے تو غار میں پناہ گیر ہوجاؤ، تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا۔ اور تمہارے کام کے لیے تمہاری سہولت کی چیز تمہیں مہیا کریگا"

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نتائج ہمیشہ ظاہری حالات کے مطابق نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات ظاہری حالات کے بالکل برعکس ہوتے ہیں لہٰذا اس واقعے

---

[۴۳] مختصر السیرہ محمد بن عبدالوہاب ص ۶۱۔

میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ پنہاں ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اس وقت جو ظلم و تشدد برپا ہے اس کے نتائج بالکل برعکس نکلیں گے اور یہ سرکش مشرکین اگر ایمان نہ لائے تو آئندہ ان ہی مقہور و مجبور مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہو کر اپنی قسمت کے فیصلے کے لیے پیش ہوں گے۔

ذُوالقَرنَین کے واقعے میں چند خاص باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ یہ کہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

۲۔ یہ کہ فلاح و کامرانی ایمان ہی کی راہ میں ہے، کفر کی راہ میں نہیں۔

۳۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ رہ رہ کر اپنے بندوں میں سے ایسے افراد کھڑے کرتا رہتا ہے جو مجبور و مقہور انسانوں کو اس دور کے یاجوج و ماجوج سے نجات دلاتے ہیں۔

۴۔ یہ کہ اللہ کے صالح بندے ہی زمین کی وراثت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

پھر سورہ کہف کے بعد سورۂ زُمَر کا نزول ہوا اور اس میں ہجرت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اور بتایا گیا کہ اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (۳۹:۱۰)

"جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھائی کی ان کے لیے اچھائی ہے اور اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بلا حساب دیا جائے گا۔"

ادھر رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ اَصْحَمَہ نجاشی شاہ حبش ایک عادل بادشاہ ہے۔ وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اس لیے آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ فتنوں سے اپنے دین کی حفاظت کے لیے حبشہ ہجرت کر جائیں۔ اس کے بعد ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق رجب ۵ سنہ نبوی میں صحابہ کرامؓ کے پہلے گروہ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ اس گروہ میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔ حضرت عثمانؓ بن عفان ان کے امیر تھے اور ان کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔[۴۴]

یہ لوگ رات کی تاریکی میں چپکے سے نکل کر اپنی نئی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔ رازداری

---

[۴۴] مختصر السیرہ شیخ عبداللہ ص ۹۲، ۹۳ زاد المعاد ۱/۲۴ رحمۃ للعالمین ۱/۶۱۔

کا مقصد یہ تھا کہ قریش کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ رُخ بحر احمر کی بندرگاہ شُعَیبَہ کی جانب تھا۔ خوش قسمتی سے وہاں دو تجارتی کشتیاں موجود تھیں جو انہیں اپنے دامنِ عافیت میں لے کر سمندر پار حبشہ چلی گئیں۔ قریش کو کسی قدر بعد میں ان کی روانگی کا علم ہو سکا۔ تاہم انہوں نے پیچھا کیا اور ساحل تک پہنچے لیکن صحابۂ کرام آگے جا چکے تھے، اس لیے نامراد واپس آئے۔ ادھر مسلمانوں نے حبشہ پہنچ کر بڑے چین کا سانس لیا۔[۴۵] اسی سال رمضان شریف میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نبی ﷺ ایک بار حرم تشریف لے گئے۔ وہاں قریش کا بہت بڑا مجمع تھا۔ ان کے سردار اور بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ آپؐ نے ایک دم اچانک کھڑے ہو کر سورہ نجم کی تلاوت شروع کر دی۔ ان کفار نے اس سے پہلے عموماً قرآن سنا نہ تھا کیونکہ ان کا دائمی وطیرہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ:

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (۴۱:۲۶)

"اس قرآن کو مت سنو اور اس میں خلل ڈالو۔ داد دھم مچاؤ تاکہ تم غالب رہو۔"

لیکن جب نبی ﷺ نے اچانک اس سورہ کی تلاوت شروع کر دی۔ اور ان کے کانوں میں ایک ناقابلِ بیان رعنائی و دلکشی اور عظمت لیے ہوئے کلامِ الٰہی کی آواز پڑی تو انہیں کچھ ہوش نہ رہا۔ سب کے سب گوش بر آواز ہو گئے کسی کے دل میں کوئی اور خیال ہی نہ آیا۔ یہاں تک کہ جب آپؐ نے سورہ کے اواخر میں دل ہلا دینے والی آیات تلاوت فرما کر اللہ کا یہ حکم سنایا کہ:

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ○ (۵۳:۶۲)

"اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔"

اور اس کے ساتھ ہی سجدہ فرمایا تو کسی کو اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور سب کے سب سجدے میں گر پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر حق کی رعنائی و جلال نے متکبرین و مستہزئین کی ہٹ دھرمی کا پردہ چاک کر دیا تھا اس لیے انہیں اپنے آپ پر قابو نہ رہ گیا تھا اور وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑے تھے۔[۴۶]

بعد میں جب انہیں احساس ہوا کہ کلامِ الٰہی کے جلال نے ان کی لگام موڑ دی۔ اور وہ ٹھیک وہی کام کر بیٹھے جسے مٹانے اور ختم کرنے کے لیے انہوں نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رکھا

---

[۴۵] رحمۃ للعالمین ۱/۶۱، زاد المعاد ۱/۲۴

[۴۶] صحیح بخاری میں اس سجدے کا واقعہ ابنِ مسعود اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مختصراً مروی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ ملاحظہ فرمائیں)

تھا اور اس کے ساتھ ہی اس واقعے میں غیر موجود مشرکین نے ان پر ہر طرف سے عتاب اور ملامت کی بوچھاڑ شروع کی تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور انہوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے رسُول اللہ ﷺ پر یہ افترا پردازی کی اور یہ جھوٹ گھڑا کہ آپؐ نے ان کے بتوں کا ذکر عزت و احترام سے کرتے ہُوئے یہ کہا تھا کہ:

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى، وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى

"یہ بلند پایہ دیویاں ہیں۔ اور ان کی شفاعت کی اُمید کی جاتی ہے"

حالانکہ یہ صریح جھوٹ تھا جو محض اس لیے گھڑ لیا گیا تھا تاکہ نبی ﷺ کے ساتھ سجدہ کرنے کی جو "غلطی" ہو گئی ہے اس کے لیے ایک "معقول" عذر پیش کیا جا سکے۔ اور ظاہر ہے کہ جو لوگ نبی ﷺ پر ہمیشہ جھوٹ گھڑتے اور آپؐ کے خلاف ہمیشہ دسیسہ کاری اور افترا پردازی کرتے رہے تھے وہ اپنا دامن بچانے کے لیے اس طرح کا جھوٹ کیوں نہ گھڑتے؟[۴۷]

بہرحال مشرکین کے سجدہ کرنے کے اس واقعے کی خبر حبشہ کے مہاجرین کو بھی معلوم ہُوئی لیکن اپنی اصل صورت سے بالکل ہٹ کر یعنی انہیں یہ معلوم ہوا کہ قریش مسلمان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ماہِ شوال میں مکّہ واپسی کی راہ لی لیکن جب اتنے قریب آ گئے کہ مکہ ایک دن سے بھی کم فاصلے پر رہ گیا تو حقیقت حال آشکارا ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگ تو سیدھے حبشہ پلٹ گئے اور کچھ لوگ چھپ چھپا کر یا قریش کے کسی آدمی کی پناہ لیکر مکّے میں داخل ہُوئے۔[۴۸]

دوسری ہجرت حبشہ

اس کے بعد ان مہاجرین پر خصوصاً اور مسلمانوں پر عموماً قریش کا ظلم و تشدد جور و ستم اور بڑھ گیا اور ان کے خاندان والوں نے انہیں خوب ستایا کیونکہ قریش کو ان کے ساتھ نجاشی کے حسنِ سلوک کی جو خبر ملی تھی اس پر وہ نہایت چیں بہ جبیں تھے۔ ناچار رسُول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو پھر ہجرتِ حبشہ کا مشورہ دیا، لیکن یہ دوسری ہجرت پہلی ہجرت کے بالمقابل اپنے دامن میں زیادہ مشکلات لیے ہُوئے تھی۔ کیونکہ اب کی بار قریش پہلے سے ہی چوکنا تھے اور ایسی کسی کوشش کو ناکام بنانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ لیکن مسلمان ان سے کہیں زیادہ مستعد ثابت ہُوئے اور اللہ نے ان کے لیے سفر آسان بنا دیا چنانچہ وہ قریش کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شاہ حبش کے پاس پہنچ گئے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) دیکھئے باب سجدۃ النجم اور باب سجود المسلمین والمشرکین ۱/۱۴۶ اور باب ما لقی النبی ﷺ واصحابہ بمکۃ ۱/۵۴۲

۴۷ محققین نے اس روایت کے تمام طرق کے تحلیل و تجزیے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

۴۸ زاد المعاد ۱/۴۴، ۲/۴۴، ابن ہشام ۱/۳۶۴۔

اس دفعہ کل ۸۲ یا ۸۳ مردوں نے ہجرت کی (حضرت عمار کی ہجرت مختلف فیہ ہے) اور اٹھارہ یا انیس عورتوں نے[۴۹] علامہ منصور پوریؒ نے یقین کے ساتھ عورتوں کی تعداد اٹھارہ لکھی ہے[۵۰]

مہاجرینِ حبشہ کے خلاف قریش کی سازش

مشرکین کو سخت قلق تھا کہ مسلمان اپنی جان اور اپنا دین بچا کر ایک پُرامن جگہ بھاگ گئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو جو گہری سوجھ بوجھ کے مالک تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ایک اہم سفارتی مہم کے لیے منتخب کیا اور ان دونوں کو نجاشی اور بطریقوں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بہترین تحفے اور ہدیے دے کر حبش روانہ کیا۔ ان دونوں نے پہلے حبش پہنچ کر بطریقوں کو تحائف پیش کئے۔ پھر انہیں اپنے ان دلائل سے آگاہ کیا جن کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو حبش سے نکلوانا چاہتے تھے۔ جب بطریقوں نے اس بات سے اتفاق کر لیا کہ وہ نجاشی کو مسلمانوں کے نکال دینے کا مشورہ دیں گے تو یہ دونوں نجاشی کے حضور حاضر ہوئے اور تحفے تحائف پیش کر کے اپنا مدعا یوں عرض کیا:

"اے بادشاہ! آپ کے ملک میں ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان بھاگ آئے ہیں۔ انہوں نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے لیکن آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک نیا دین ایجاد کیا ہے جسے نہ ہم جانتے ہیں نہ آپ۔ ہمیں آپ کی خدمت میں انہی کی بابت ان کے والدین چچاؤں اور کنبے قبیلے کے عمائدین نے بھیجا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ انہیں ان کے پاس واپس بھیجدیں کیونکہ وہ لوگ ان پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور ان کی خامی اور عتاب کے اسباب کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔" جب یہ دونوں اپنا مدعا عرض کر چکے تو بطریقوں نے کہا: "بادشاہ سلامت! یہ دونوں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ آپ ان جوانوں کو ان دونوں کے حوالے کر دیں۔ یہ دونوں انہیں ان کی قوم اور ان کے ملک میں واپس پہنچا دیں گے۔"

لیکن نجاشی نے سوچا کہ اس قضیے کو گہرائی سے کھنگالنا اور اس کے تمام پہلوؤں کو سننا ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ مسلمان یہ تہیہ کر کے اس کے دربار میں آئے کہ ہم سچ ہی بولیں گے خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ جب مسلمان آگئے تو نجاشی نے پوچھا "یہ کونسا دین ہے جس کی بنیاد پر تم نے اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، لیکن میرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہو۔ اور نہ ان ملتوں ہی میں سے کسی کے دین میں داخل ہوئے ہو؟"

مسلمانوں کے ترجمان حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: "اے بادشاہ! ہم ایسی

---

[۴۹] زاد المعاد ۱/۳۲، رحمۃ للعالمین ۱/۶۱ [۵۰] ایضاً رحمۃ للعالمین۔

قوم تھے جو جاہلیت میں مبتلا تھی۔ ہم بُت پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے۔ قرابتداروں سے تعلق توڑتے تھے، ہمسایوں سے بدسلوکی کرتے تھے اور ہم میں سے طاقتور کمزور کو کھا رہا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا اس کی عالی نسبی، سچائی، امانت اور پاکدامنی ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سمجھایا کہ ہم صرف ایک اللہ کو مانیں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا جن پتھروں اور بُتوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، انہیں چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، قرابت جوڑنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے اور حرام کاری و خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اور فواحش میں ملوث ہونے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن عورتوں پر جھوٹی تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اس نے ہمیں نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا حکم دیا" ـــــ اسی طرح حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے کام گنائے، پھر کہا، "ہم نے اس پیغمبر کو سچا مانا، اس پر ایمان لائے، اور اس کے لائے ہوئے دینِ خداوندی میں اس کی پیروی کی۔ چنانچہ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا اور جن باتوں کو اس پیغمبرؐ نے حرام بتایا انہیں حرام مانا، اور جن کو حلال بتایا انہیں حلال جانا۔ اس پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی۔ اس نے ہم پر ظلم و ستم کیا اور ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے فتنے اور سزاؤں سے دوچار کیا۔ تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر بُت پرستی کی طرف پلٹ جائیں۔ اور جن گندی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے انہیں پھر حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر بہت قہر و ظلم کیا، زمین تنگ کر دی اور ہمارے درمیان اور ہمارے دین کے درمیان روک بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم نے آپ کے ملک کی راہ لی۔ اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دیتے ہوئے آپ کی پناہ میں رہنا پسند کیا۔ اور یہ امید کی کہ اے بادشاہ! آپ کے پاس ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

نجاشی نے کہا: "وہ پیغمبر جو کچھ لائے ہیں اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہے؟"

حضرت جعفرؓ نے کہا: "ہاں!"

نجاشی نے کہا: "ذرا مجھے بھی پڑھ کر سناؤ۔"

حضرت جعفرؓ نے سورۃ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔ نجاشی اس قدر رویا کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ نجاشی کے تمام اسقف بھی حضرت جعفرؓ کی تلاوت سن کر اس قدر روئے کہ ان کے صحیفے تر ہو گئے۔ پھر نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ کلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ دونوں ایک ہی شمع دان سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد نجاشی نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دونوں چلے جاؤ۔ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا اور نہ یہاں ان کے خلاف کوئی چال چلی جا سکتی ہے۔

اس حکم پر وہ دونوں وہاں سے نکل گئے۔ لیکن پھر عمرو بن عاص نے عبداللہ بن ربیعہ سے کہا "خدا کی قسم! کل ان کے متعلق ایسی بات لاؤں گا کہ ان کی ہریالی کی جڑ کاٹ کر رکھ دوں گا۔" عبداللہ بن ربیعہ نے کہا "نہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ ان لوگوں نے اگرچہ ہمارے خلاف کیا ہے۔ لیکن ہیں بہرحال ہمارے اپنے ہی کنبے قبیلے کے لوگ۔" مگر عمرو بن عاص اپنی رائے پر اڑے رہے۔

اگلا دن آیا تو عمرو بن عاص نے نجاشی سے کہا: "اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں ایک بڑی بات کہتے ہیں۔" اس پر نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمان کیا کہتے ہیں۔ اس دفعہ مسلمانوں کو گھبراہٹ ہوئی۔ لیکن انہوں نے طے کیا کہ سچ ہی بولیں گے۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ چنانچہ جب مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور اس نے سوال کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ہم عیسےٰ علیہ السلام کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی ﷺ لے کر آئے ہیں۔ یعنی حضرت عیسےٰ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا وہ کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری پاکدامن حضرت مریم علیہا السلام کی طرف القا کیا تھا۔"

اس پر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور بولا "خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے حضرت عیسےٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی بڑھ کر نہ تھے۔" اس پر بطریقوں نے "ہونہہ" کی آواز لگائی۔ نجاشی نے کہا: اگرچہ تم لوگ "ہونہہ" کہو۔

اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے کہا "جاؤ! تم لوگ میرے قلمرو میں امن و امان سے ہو۔ جو تمہیں گالی دے گا اس پر تاوان لگایا جائے گا۔ مجھے گوارا نہیں کہ تم میں سے میں کسی آدمی کو

ستاؤں اور اس کے بدلے مجھے سونے کا پہاڑ مل جائے۔"

اس کے بعد اس نے اپنے حاشیہ نشینوں سے مخاطب ہو کر کہا: "ان دونوں کو ان کے ہدیے واپس کر دو۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے جب مجھے میرا ملک واپس کیا تھا تو مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی تھی کہ میں اس کی راہ میں رشوت لوں۔ نیز اللہ نے میرے بارے میں لوگوں کی بات قبول نہ کی تھی کہ میں اللہ کے بارے میں لوگوں کی بات مانوں۔"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جنہوں نے اس واقعے کو بیان کیا ہے، کہتی ہیں اس کے بعد وہ دونوں اپنے ہدیے تحفے لیے بے آبرو ہو کر واپس چلے گئے اور ہم نجاشی کے پاس ایک اچھے ملک میں ایک اچھے پڑوسی کے زیرِ سایہ مقیم رہے۔ [۵۱]

یہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے۔ دوسرے سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ نجاشی کے دربار میں حضرت عمرو بن عاصؓ کی حاضری جنگِ بدر کے بعد ہوئی تھی۔ بعض لوگوں نے تطبیق کی یہ صورت بیان کی ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کی واپسی کے لیے دو مرتبہ گئے تھے، لیکن جنگ بدر کے بعد کی حاضری کے ضمن میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور نجاشی کے درمیان سوال و جواب کی جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو ابنِ اسحاق نے ہجرتِ حبشہ کے بعد کی حاضری کے سلسلے میں بیان کی ہیں۔ پھر ان سوالات کے مضامین سے واضح ہوتا ہے کہ نجاشی کے پاس یہ معاملہ ابھی پہلی بار پیش ہوا تھا، اس لیے ترجیح اس بات کو حاصل ہے کہ مسلمانوں کو واپس لانے کی کوشش صرف ایک بار ہوئی تھی۔ اور وہ ہجرتِ حبشہ کے بعد تھی۔

بہرحال مشرکین کی چال ناکام ہو گئی اور ان کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنے جذبۂ عداوت کو اپنے دائرۂ اختیار ہی میں آسودہ کر سکتے ہیں، لیکن اس کے نتیجے میں انہوں نے ایک خوفناک بات سوچنی شروع کر دی۔ درحقیقت انہیں اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ اس "مصیبت" سے نمٹنے کے لیے اب ان کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے ہیں، یا تو رسول اللہ ﷺ کو تبلیغ سے بزورِ طاقت روک دیں یا پھر آپؐ کے وجود ہی کا صفایا کر دیں۔ لیکن دوسری صورت حد درجہ مشکل تھی کیونکہ ابوطالب آپؐ کے محافظ تھے اور مشرکین کے عزائم کے سامنے

---

[۵۱] ابنِ ہشام ملخصاً ۱/۳۳۴ تا ۳۳۸

آہنی دیوار بنے ہوئے تھے۔ اس لیے یہی مفید سمجھا گیا کہ ابوطالب سے دو دو باتیں ہو جائیں۔

ابوطالب کو قریش کی دھمکی

اس تجویز کے بعد سردارانِ قریش ابوطالب کے پاس حاضر ہوئے اور بولے: "ابوطالب! آپ ہمارے اندر سن و شرف اور اعزاز کے مالک ہیں۔ ہم نے آپ سے گذارش کی کہ اپنے بھتیجے کو روکیے۔ لیکن آپ نے نہیں روکا۔ آپ یاد رکھیں ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو گالیاں دی جائیں، ہماری عقل و فہم کو حماقت زدہ قرار دیا جائے اور ہمارے خداؤں کی عیب چینی کی جائے۔ آپ روک دیجئے ورنہ ہم آپ سے اور اُن سے ایسی جنگ چھیڑ دیں گے کہ ایک فریق کا صفایا ہو کر رہے گا۔"

ابوطالب پر اس زوردار دھمکی کا بہت زیادہ اثر ہُوا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بلا کر کہا: "بھتیجے! تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور ایسی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اب مجھ پر اور خود اپنے آپ پر رحم کرو اور اس معاملے میں مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میرے بس سے باہر ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے سمجھا کہ اب آپ کے چچا بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اور وہ بھی آپ کی مدد سے کمزور پڑ گئے ہیں۔ اس لیے فرمایا: "چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس حد تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں کہ یا تو اللہ اسے غالب کر دے یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

اس کے بعد آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ آپ رو پڑے اور اُٹھ گئے، جب واپس ہونے لگے تو ابوطالب نے پکارا اور سامنے تشریف لائے تو کہا: "بھتیجے! جاؤ جو چاہو کہو، خدا کی قسم میں تمہیں کبھی بھی کسی بھی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتا۔"[۵۲] اور یہ اشعار کہے:

وَاللّٰهِ لَنْ يَصِلُوْا اِلَيْكَ بِجَمْعِهِمْ ۔۔۔ حَتّٰى اُوَسَّدَ فِي التُّرَابِ دَفِيْنَا

فَاصْدَعْ بِاَمْرِكَ مَا عَلَيْكَ غَضَاضَةٌ ۔۔۔ وَابْشِرْ وَقَرَّ بِذَاكَ مِنْكَ عُيُوْنَا[۵۳]

"بخدا وہ لوگ تمہارے پاس اپنی جمعیت سمیت بھی ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ یہاں تک کہ میں

---

۵۲ ابن ہشام ۱/۲۶۵، ۲۶۶ ۵۳ مختصر السیرہ شیخ محمد بن عبدالوہاب ص ۶۸

مٹی میں دفن کر دیا جاؤں۔ تم اپنی بات کھلم کھلا کہو۔ تم پر کوئی قدغن نہیں، تم خوش ہو جاؤ اور تمہاری آنکھیں اس سے ٹھنڈی ہو جائیں۔"

قریش ایک بار پھر ابوطالب کے سامنے

پچھلی دھمکی کے باوجود جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنا کام کئے جا رہے ہیں تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ ابوطالب رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ نہیں سکتے، بلکہ اس بارے میں قریش سے جدا ہونے اور ان کی عداوت مول لینے کو تیار ہیں چنانچہ وہ لوگ ولید بن مغیرہ کے لڑکے عُمَارَہ کو ہمراہ لے کر ابوطالب کے پاس پہنچے اور ان سے یوں عرض کیا:

"اے ابوطالب! یہ قریش کا سب سے بانکا اور خوبصورت نوجوان ہے۔ آپ اسے لے لیں۔ اس کی دیت اور نصرت کے آپ حقدار ہوں گے۔ آپ اسے اپنا لڑکا بنا لیں۔ یہ آپ کا ہوگا اور آپ اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیں جس نے آپ کے آباء و اجداد کے دین کی مخالفت کی ہے، آپ کی قوم کا شیرازہ منتشر کر رکھا ہے اور ان کی عقلوں کو حماقت سے دوچار بتلایا ہے۔ ہم اسے قتل کریں گے۔ بس یہ ایک آدمی کے بدلے ایک آدمی کا حساب ہے۔"

ابوطالب نے کہا: "خدا کی قسم! کتنا بُرا سودا ہے جو تم لوگ مجھ سے کر رہے ہو! تم اپنا بیٹا مجھے دیتے ہو کہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں۔ پالوں پوسوں اور میرا بیٹا مجھ سے طلب کرتے ہو کہ اسے قتل کر دو۔ خدا کی قسم! یہ نہیں ہو سکتا۔"

اس پر نوفل بن عبدِ مَناف کا پوتا مُطعِم بن عَدِی بولا: "خدا کی قسم! اے ابوطالب! تم سے تمہاری قوم نے انصاف کی بات کہی ہے۔ اور جو صورت تمہیں ناگوار ہے اس سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم ان کی کسی بات کو قبول نہیں کرنا چاہتے۔"

جواب میں ابوطالب نے کہا: "بخدا تم لوگوں نے مجھ سے انصاف کی بات نہیں کی ہے بلکہ تم بھی میرا ساتھ چھوڑ کر میرے مخالف لوگوں کی مدد پر تلے بیٹھے ہو تو ٹھیک ہے جو چاہو کرو۔"[۵۴]

سیرت کے مآخذ میں پچھلی دونوں گفتگو کے زمانے کی تعیین نہیں ملتی لیکن قرائن و شواہد

---

[۵۴] ابن ہشام ۱/ ۲۶۶، ۲۶۷

سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں گفتگو سنہ ۶ نبوی کے وسط میں ہوئی تھیں اور دونوں کے درمیان فاصلہ مختصر ہی تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تجویز

ان دونوں گفتگوؤں کی ناکامی کے بعد قریش کا جذبۂ جور و ستم اور بھی بڑھ گیا اور ایذا رسانی کا سلسلہ پہلے سے فزوں تر اور سخت تر ہو گیا۔ ان ہی دنوں قریش کے سرکشوں کے دماغ میں نبی ﷺ کے خاتمے کی ایک تجویز اُبھری لیکن یہی تجویز اور یہی سختیاں مکہ کے جانبازوں میں سے دو نادرۂ روزگار سرفروشوں، یعنی حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے اور ان کے ذریعے اسلام کو تقویت پہنچانے کا سبب بن گئیں۔

جور و جفا کے سلسلۂ دراز کے ایک دو نمونے یہ ہیں کہ ایک روز ابو لہب کا بیٹا عُتَیبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور بولا: "میں وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى اور ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى کے ساتھ کفر کرتا ہوں"۔ اس کے بعد وہ آپؐ پر ایذا رسانی کے ساتھ مسلط ہو گیا۔ آپؐ کا کُرتا پھاڑ دیا اور آپؐ کے چہرے پر تھوک دیا۔ اگرچہ تھوک آپؐ پر نہ پڑا۔ اسی موقع پر نبی ﷺ نے بد دعا کی کہ اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط کر دے۔ نبی ﷺ کی یہ بد دُعا قبول ہوئی۔ چنانچہ عُتَیبہ ایک بار قریش کے کچھ لوگوں کے ہمراہ سفر میں گیا۔ جب انہوں نے ملک شام کے مقام زَرقاء میں پڑاؤ ڈالا تو رات کے وقت شیر نے ان کا چکر لگایا۔ عُتَیبہ نے دیکھتے ہی کہا: "ہائے میری تباہی! یہ خدا کی قسم مجھے کھا جائے گا۔ جیسا کہ محمد ﷺ نے مجھ پر بد دُعا کی ہے۔ دیکھو میں شام میں ہوں۔ لیکن اس نے مکہ میں رہتے ہوئے مجھے مار ڈالا۔" احتیاطاً لوگوں نے عُتَیبہ کو اپنے اور جانوروں کے گھیرے کے بیچوں بیچ سلایا۔ لیکن رات کو شیر سب کو پھلانگتا ہوا سیدھا عُتَیبہ کے پاس پہنچا۔ اور سر پکڑ کر ذبح کر ڈالا۔[۵۵]

ایک بار عُقبہ بن ابی مُعَیط نے رسول اللہ ﷺ کی گردن حالتِ سجدہ میں اس زور سے روندی کہ معلوم ہوتا تھا دونوں آنکھیں نکل آئیں گی۔[۵۶]

ابنِ اسحاق کی ایک طویل روایت سے بھی قریش کے سرکشوں کے اس ارادے پر

---

۵۵ مختصر السیرۃ شیخ عبد اللہ ص ۱۲۵، استیعاب، اصابہ، دلائل النبوۃ، الروض الانف

۵۶ ایضاً مختصر السیرہ ص ۱۱۳

روشنی پڑتی ہے کہ وہ نبی ﷺ کے خاتمے کے چکر میں تھے، چنانچہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار ابوجہل نے کہا:

"برادرانِ قریش! آپ دیکھتے ہیں کہ محمد ﷺ ہمارے دین کی عیب چینی ہمارے آباء و اجداد کی بدگوئی، ہماری عقلوں کی تخفیف اور ہمارے معبودوں کی تذلیل سے باز نہیں آتا۔ اس لیے میں اللہ سے عہد کر رہا ہوں کہ ایک بہت بھاری اور بمشکل اُٹھنے والا پتھر لے کر بیٹھوں گا اور جب وہ سجدہ کرے گا تو اسی پتھر سے اس کا سر کچل دوں گا۔ اب اس کے بعد چاہے تم لوگ مجھ کو بے یار و مددگار چھوڑ دو، چاہے میری حفاظت کرو۔ اور بنو عبدِ مناف بھی اس کے بعد جو جی چاہے کریں"۔ لوگوں نے کہا: "نہیں واللہ ہم تمہیں کبھی کسی معاملے میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو"۔

صبح ہوئی تو ابوجہل ویسا ہی ایک پتھر لے کر رسول اللہ ﷺ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ حسبِ دستور تشریف لائے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ قریش بھی اپنی اپنی مجلسوں میں آچکے تھے۔ اور ابوجہل کی کارروائی دیکھنے کے منتظر تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ سجدے میں تشریف لے گئے تو ابوجہل نے پتھر اٹھایا۔ پھر آپؐ کی جانب بڑھا۔ لیکن جب قریب پہنچا تو شکست خوردہ حالت میں واپس بھاگا۔ اس کا رنگ فق تھا اور وہ اس قدر مرعوب تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پتھر پر چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ بمشکل ہاتھ سے پتھر پھینک سکا۔ ادھر قریش کے کچھ لوگ اُٹھ کر اس کے پاس آئے اور کہنے لگے: "ابوالحکم! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"۔ اس نے کہا: "میں نے رات جو بات کہی تھی وہی کرنے جا رہا تھا لیکن جب اس کے قریب پہنچا تو ایک اونٹ آڑے آگیا۔ بخدا میں نے کبھی کسی اونٹ کی ویسی کھوپڑی ویسی گردن اور ویسے دانت دیکھے ہی نہیں۔ وہ مجھے کھا جانا چاہتا تھا"۔

ابنِ اسحاق کہتے ہیں: "مجھے بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ جبریل علیہ السلام تھے۔ اگر ابوجہل قریب آتا تو اسے دھر پکڑتے"[۵۷]

اس کے بعد ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف ایک ایسی حرکت کی جو حضرت

---

[۵۷] ابنِ ہشام ۱/ ۲۹۸، ۲۹۹

حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا سبب بن گئی۔ تفصیل آ رہی ہے۔

جہاں تک قریش کے دوسرے بدمعاشوں کا تعلق ہے تو ان کے دلوں میں بھی نبی ﷺ کے خاتمے کا خیال برابر پک رہا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے ابنِ اسحاق نے ان کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک بار مشرکین حطیم میں جمع تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر چھیڑا اور کہنے لگے "اس شخص کے معاملے میں ہم نے جیسا صبر کیا ہے اس کی مثال نہیں۔ درحقیقت ہم نے اس کے معاملے میں بہت ہی بڑی بات پر صبر کیا ہے۔" یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نمودار ہو گئے۔ آپؐ نے تشریف لا کر پہلے حجرِ اسود کو چوما پھر طواف کرتے ہوئے مشرکین کے پاس سے گذرے۔ انہوں نے کچھ کہہ کر طعنہ زنی کی جس کا اثر میں نے آپؐ کے چہرے پر دیکھا۔ اس کے بعد جب دوبارہ آپؐ کا گذر ہوا تو مشرکین نے پھر اسی طرح کی لعن طعن کی۔ میں نے اس کا بھی اثر آپؐ کے چہرے پر دیکھا۔ اس کے بعد آپؐ سہ بارہ گذرے تو مشرکین نے پھر آپؐ پر لعن طعن کی۔ اب کی بار آپؐ ٹھہر گئے اور فرمایا:

"قریش کے لوگو! سن رہے ہو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمہارے پاس (تمہارے) قتل و ذبح (کا حکم) لے کر آیا ہوں۔"

آپؐ کے اس ارشاد نے لوگوں کو پکڑ لیا۔ (ان پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ) گویا ہر آدمی کے سر پر چڑیا ہے، یہاں تک کہ جو آپؐ پر سب سے زیادہ سخت تھا وہ بھی بہتر سے بہتر لفظ جو پا سکتا تھا اس کے ذریعے آپؐ سے طلب گارِ رحمت ہوتے ہوئے کہنے لگا کہ "ابوالقاسم! واپس جائیے۔ خدا کی قسم! آپؐ کبھی بھی نادان نہ تھے۔"

دوسرے دن قریش پھر اسی طرح جمع ہو کر آپؐ کا ذکر کر رہے تھے کہ آپؐ نمودار ہوئے۔ دیکھتے ہی سب (یکجان ہو کر) ایک آدمی کی طرح آپؐ پر پل پڑے اور آپؐ کو گھیر لیا۔ پھر میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس نے گلے کے پاس سے آپؐ کی چادر پکڑ لی۔ (اور بل دینے لگا۔) ابوبکرؓ آپؐ کے بچاؤ میں لگ گئے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

"اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ؟ کیا تم لوگ ایک آدمی کو اس لیے قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" اس کے بعد وہ لوگ آپؐ کو چھوڑ کر پلٹ گئے۔ عبداللہ

بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ یہ سب سے سخت ترین ایذا رسانی تھی جو میں نے قریش کو کبھی کرتے ہوئے دیکھی۔ [۵۸] انتہی ملخصا

صحیح بخاری میں حضرت عُرْوَہ بن زُبَیْر رضی اللہ عنہ سے ان کا بیان مروی ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ مشرکین نے نبی ﷺ کے ساتھ جو سب سے سخت ترین بدسلوکی کی تھی آپ مجھے اس کی تفصیل بتایئے؟ — انہوں نے کہا کہ نبی ﷺ خانہ کعبہ کے پاس حِطیم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیط آگیا۔ اُس نے آتے ہی اپنا کپڑا آپؐ کی گردن میں ڈال کر نہایت سختی کے ساتھ آپؐ کا گلا گھونٹا۔ اتنے میں ابوبکرؓ آپہنچے۔ اور انہوں نے اس کے دونوں کندھے پکڑ کر دھکا دیا اور اسے نبی ﷺ سے دُور کرتے ہوئے فرمایا "اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ؟ تم لوگ ایک آدمی کو اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" [۵۹]

حضرت اسماءؓ کی روایت میں مزید تفصیل ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس یہ چیخ پہنچی کہ اپنے ساتھی کو بچاؤ۔ وہ جھٹ ہمارے پاس سے نکلے۔ ان کے سر پر چار چوٹیاں تھیں۔ وہ یہ کہتے ہوئے گئے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ؟ تم لوگ ایک آدمی کو محض اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ مشرکین نبی ﷺ کو چھوڑ کر ابوبکرؓ پر پل پڑے۔ وہ واپس آئے تو حالت یہ تھی کہ ہم ان کی چوٹیوں کا جو بال بھی چھوتے تھے، وہ ہماری (چٹکی) کے ساتھ چلا آتا تھا۔ [۶۰]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

مکہ کی فضا ظلم و جور کے ان سیاہ بادلوں سے گھبیر تھی کہ اچانک ایک بجلی چمکی اور مقہوروں کا راستہ روشن ہوگیا، یعنی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ سنہ ۶ نبوی کے اخیر کا ہے اور اغلب یہ ہے کہ وہ ماہ ذی الحجہ میں مسلمان ہوئے تھے

ان کے اسلام لانے کا سبب یہ ہے کہ ایک روز ابوجہل کوہِ صفا کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گذرا تو آپؐ کو ایذا پہنچائی اور سخت سُست کہا۔ رسول اللہ ﷺ

---

[۵۸] ابن ہشام ۱/ ۲۸۹، ۲۹۰ [۵۹] صحیح بخاری باب ذکر مالقی النبی ﷺ من المشرکین بمکۃ ۱/ ۵۴۴ [۶۰] مختصر السیرہ شیخ عبداللہ ص ۱۱۳

خاموش رہے، اور کچھ بھی نہ کہا لیکن اس کے بعد اس نے آپؐ کے سر پر ایک پتھر دے مارا، جس سے ایسی چوٹ آئی کہ خون بہ نکلا۔ پھر وہ خانۂ کعبہ کے پاس قریش کی مجلس میں جا بیٹھا۔ عبداللہ بن جُدعان کی ایک لونڈی کوہِ صفا پر واقع اپنے مکان سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کمان حمائل کئے شکار سے واپس تشریف لائے تو اس نے ان سے ابوجہل کی ساری حرکت کہہ سنائی۔ حضرت حمزہؓ غصے سے بھڑک اُٹھے — یہ قریش کے سب سے طاقتور اور مضبوط جوان تھے۔ ماجرا سن کر کہیں ایک لمحہ رُکے بغیر دوڑتے ہوئے اور یہ تہیہ کئے ہوئے آئے کہ جُوں ہی ابوجہل کا سامنا ہوگا، اس کی مرمت کردیں گے۔ چنانچہ مسجد حرام میں داخل ہوکر سیدھے اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے اور بولے: "او سرین پر خوشبو لگانے والے بُزدل! تو میرے بھتیجے کو گالی دیتا ہے حالانکہ میں بھی اسی کے دین پر ہوں"۔ اس کے بعد کمان سے اس زور کی مار ماری کہ اس کے سر پر بدترین قسم کا زخم آگیا۔ اس پر ابوجہل کے قبیلے بنو مخزوم اور حضرت حمزہؓ کے قبیلے بنو ہاشم کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف بھڑک اُٹھے۔ لیکن ابوجہل نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کردیا کہ ابو عمارہ کو جانے دو۔ میں نے واقعی اس کے بھتیجے کو بہت بُری گالی دی تھی۔[۶۱]

ابتداً حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا اسلام محض اس حمیت کے طور پر تھا کہ ان کے عزیز کی توہین کیوں کی گئی۔ لیکن پھر اللہ نے ان کا سینہ کھول دیا۔ اور انہوں نے اسلام کا کڑا مضبوطی سے تھام لیا[۶۲] اور مسلمانوں نے ان کی وجہ سے بڑی عزت و قوت محسوس کی۔

حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام

ظلم و طغیان کے سیاہ بادلوں کی اسی گمبھیر فضا میں ایک اور برقِ تاباں کا جلوہ نمودار ہُوا جس کی چمک پہلے سے زیادہ خیرہ کن تھی، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ ۶ نبوی کا ہے۔[۶۳] وہ حضرت حمزہؓ کے صرف تین دن بعد مسلمان ہوئے تھے اور نبی ﷺ نے ان کے اسلام لانے کے لیے دُعا کی تھی۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے ابن عمر سے روایت کی ہے اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اسی طرح طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ

---

[۶۱] مختصر السیرہ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ص ۶۶ رحمۃ للعالمین ۱/۶۸، ابن ہشام ۱/۲۹۱، ۲۹۲

[۶۲] اس کا اندازہ مختصر السیرہ شیخ عبداللہ میں مذکور ایک روایت سے ہوتا ہے۔ دیکھئے ص ۱۰۱

[۶۳] تاریخ عمر بن الخطاب لابن جوزی ص ۱۱

اور حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا،

اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَحَبِّ الرَّجُلَیْنِ اِلَیْکَ بعمر بن الخطاب اَوْ بِاَبِیْ جہل بن ھشام۔

"اے اللہ! عمر بن خطاب اور ابوجہل بن ہشام میں سے جو شخص تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعے سے اسلام کو قوت پہنچا۔"

اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی اور حضرت عمرؓ مسلمان ہوگئے۔ اللہ کے نزدیک ان دونوں میں زیادہ محبوب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ [۶۴]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے متعلق جملہ روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اسلام رفتہ رفتہ جاگزیں ہوا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا خلاصہ پیش کرنے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج اور جذبات و احساسات کی طرف بھی مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی تند مزاجی اور سخت خوئی کے لیے مشہور تھے۔ مسلمانوں نے طویل عرصے تک ان کے ہاتھوں طرح طرح کی سختیاں جھیلی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متضاد قسم کے جذبات باہم دست و گریباں تھے، چنانچہ ایک طرف تو وہ آبا و اجداد کی ایجاد کردہ رسموں کا بڑا احترام کرتے تھے اور بلا نوشی اور لہو و لعب کے دلدادہ تھے لیکن دوسری طرف وہ ایمان و عقیدے کی راہ میں مسلمانوں کی پختگی اور مصائب کے سلسلے میں ان کی قوتِ برداشت کو خوشگوار حیرت و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پھر ان کے اندر کسی بھی عقلمند آدمی کی طرح شکوک و شبہات کا ایک سلسلہ تھا جو رہ رہ کر ابھرا کرتا تھا کہ اسلام جس بات کی دعوت دے رہا ہے غالباً وہی زیادہ برتر اور پاکیزہ ہے۔ اسی لیے ان کی کیفیت دم میں ماشہ دم میں تولہ کی سی تھی کہ ابھی بھڑکے اور ابھی ڈھیلے پڑ گئے۔ [۶۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے متعلق تمام روایات کا خلاصہ مع جمع و تطبیق — یہ ہے کہ ایک دفعہ انہیں گھر سے باہر رات گزارنی پڑی۔ وہ حرم تشریف لائے اور خانۂ کعبہ کے پردے میں گھس گئے۔ اس وقت نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور سورہ

---

[۶۴] ترمذی ابواب المناقب، مناقب ابی حفص عمر بن الخطاب ۲/۲۰۹

[۶۵] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات کا یہ تجزیہ شیخ محمد غزالی نے کیا ہے۔ فقہ السیرہ ص ۹۲، ۹۳

الحاقہ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن سننے لگے اور اس کی تالیف پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے جی میں کہا: "خدا کی قسم یہ تو شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں" لیکن اتنے میں آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ (۶۹/۴۰، ۴۱)

"یہ ایک بزرگ رسول کا قول ہے۔ یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ـــــ اپنے جی میں ـــ کہا: (اوہو) "یہ تو کاہن ہے" لیکن اتنے میں آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۶۹/۴۲، ۴۳)

(إلى آخر السورة)

"یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں۔ تم لوگ کم ہی نصیحت قبول کرتے ہو۔ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔"

(اخیر سورۃ تک)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس وقت میرے دل میں اسلام جاگزیں ہو گیا۔[۶۶]

یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں اسلام کا بیج پڑا، لیکن ابھی ان کے اندر جاہلی جذبات، تقلیدی عصبیت اور آباء و اجداد کے دین کی عظمت کے احساس کا چھلکا اتنا مضبوط تھا کہ نہاں خانۂ دل کے اندر مچلنے والی حقیقت کے مغز پر غالب رہا، اس لیے وہ اس چھلکے کی تہ میں چھپے ہوئے شعور کی پروا کئے بغیر اپنے اسلام دشمن عمل میں سرگرداں رہے۔

ان کی طبیعت کی سختی اور رسول اللہ ﷺ سے فرطِ عداوت کا یہ حال تھا کہ ایک روز خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا کام تمام کرنے کی نیت سے تلوار لے کر نکل پڑے

---

[۶۶] تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی ص ۶۔ ابن اسحاق نے عطاء اور مجاہد سے بھی تقریباً یہی بات نقل کی ہے البتہ اس کا آخری ٹکڑا اس سے مختلف ہے۔ دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ۱/۳۴۶، ۳۴۸۔ اور خود ابن جوزی نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی کے قریب قریب روایت نقل کی ہے لیکن اس کا آخری حصہ بھی اس روایت سے مختلف ہے۔ دیکھئے تاریخ عمر بن الخطاب ص ۹۔۱۰

لیکن ابھی راستے ہی میں تھے کہ نُعَیم بن عبداللہ النحام عدوی[67] سے یا بنی زہرہ[68] یا بنی مخزوم[69] کے کسی آدمی سے ملاقات ہوگئی۔ اُس نے تیور دیکھ کر پوچھا: "عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟" انہوں نے کہا: "محمد ﷺ کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے کہا: "محمد ﷺ کو قتل کر کے بنو ہاشم اور بنو زہرہ سے کیسے بچ سکو گے؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "معلوم ہوتا ہے تم بھی اپنا پچھلا دین چھوڑ کر بے دین ہو چکے ہو۔" اس نے کہا: "عمرؓ! ایک عجیب بات نہ بتا دوں؟ تمہاری بہن اور بہنوئی بھی تمہارا دین چھوڑ کر بے دین ہو چکے ہیں۔" یہ سُن کر عمر غصّے سے بے قابو ہو گئے اور سیدھے بہن بہنوئی کا رُخ کیا۔ وہاں انہیں حضرت خبابؓ بن اَرَتّ سورہ طٰہٰ پر مشتمل ایک صحیفہ پڑھا رہے تھے اور قرآن پڑھانے کے لیے وہاں آنا جانا حضرت خبابؓ کا معمول تھا۔ جب حضرت خبابؓ نے حضرت عمرؓ کی آہٹ سنی تو گھر کے اندر چھپ گئے۔ ادھر حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ نے صحیفہ چھپا دیا؛ لیکن حضرت عمرؓ گھر کے قریب پہنچ کر حضرت خبابؓ کی قراءت سن چکے تھے؛ چنانچہ پوچھا کہ یہ کیسی دھیمی دھیمی سی آواز تھی جو تم لوگوں کے پاس میں نے سنی تھی؟ انہوں نے کہا: "کچھ بھی نہیں۔ بس ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "غالباً تم دونوں بے دین ہو چکے ہو؟" بہنوئی نے کہا: "اچھا عمر! یہ بتاؤ اگر حق تمہارے دین کے بجائے کسی اور دین میں ہو تو؟" حضرت عمرؓ کا اتنا سننا تھا کہ اپنے بہنوئی پر چڑھ بیٹھے اور انہیں بُری طرح کچل دیا۔ ان کی بہن نے لپک کر انہیں اپنے شوہر سے الگ کیا تو بہن کو ایسا چانٹا مارا کہ چہرہ خون آلود ہو گیا۔ ابنِ اسحاق کی روایت ہے کہ ان کے سر میں چوٹ آئی۔ بہن نے جوشِ غضب میں کہا: "عمر! اگر تیرے دین کے بجائے دوسرا ہی دین برحق ہو تو؟ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور میں شہادت دیتی ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔" یہ سُن کر حضرت عمرؓ پر مایوسی کے بادل چھا گئے اور انہیں اپنی بہن کے چہرے پر خون دیکھ کر شرم و ندامت بھی محسوس ہوئی۔ کہنے لگے: "اچھا یہ کتاب جو تمہارے پاس ہے ذرا مجھے بھی پڑھنے کو دو۔"

---

[67] یہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے۔ دیکھئے ابنِ ہشام ۱/۳۴۴

[68] یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھئے تاریخ عمرؓ بن الخطاب لابن الجوزی، ص ۱۰۔ و مختصر السیرۃ از شیخ عبداللہ ص ۱۰۲

[69] یہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھئے مختصر السیرۃ ایضاً ص ۱۰۲

بہن نے کہا "تم ناپاک ہو۔ اس کتاب کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ اٹھو غسل کرو" حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا۔ پھر کتاب لی اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھی۔ کہنے لگے "یہ تو بڑے پاکیزہ نام ہیں" اس کے بعد طٰہٰ سے اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○ (۲۰:۱-۱۴) تک قرأت کی۔ کہنے لگے "یہ تو بڑا عمدہ اور بڑا محترم کلام ہے۔ مجھے محمد ﷺ کا پتا بتاؤ!"

حضرت خبابؓ حضرت عمرؓ کے یہ فقرے سن کر اندر سے باہر آ گئے۔ کہنے لگے "عمر خوش ہو جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعرات کی رات تمہارے متعلق جو دعا کی تھی (کہ اے اللہ! عمرؓ بن خطاب یا ابوجہل بن ہشام کے ذریعے اسلام کو قوت پہنچا) یہ وہی ہے۔ اور اس وقت رسول اللہ ﷺ کوہ صفا کے پاس والے مکان میں تشریف فرما ہیں۔"

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار حمائل کی اور اس گھر کے پاس آ کر دروازے پر دستک دی۔ ایک آدمی نے اُٹھ کر دروازے کی دراز سے جھانکا تو دیکھا کہ عمر تلوار حمائل کئے موجود ہیں۔ لپک کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی اور سارے لوگ سمٹ کر یکجا ہو گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟" لوگوں نے کہا "عمرؓ ہیں"۔ حضرت حمزہؓ نے کہا: "بس! عمرؓ ہے دروازہ کھول دو۔ اگر وہ خیر کی نیت سے آیا ہے تو اسے ہم خیر عطا کریں گے اور اگر کوئی بُرا ارادہ لے کر آیا ہے تو ہم اسی کی تلوار سے اُس کا کام تمام کر دیں گے"۔ ادھر رسول اللہ ﷺ اندر تشریف فرما تھے۔ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ وحی نازل ہو چکی تو حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے۔ بیٹھک میں ان سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے انکے کپڑے اور تلوار کا پرتلا سمیٹ کر پکڑا اور سختی سے جھٹکتے ہوئے فرمایا: "عمر! کیا تم اس وقت تک باز نہیں آؤ گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی ویسی ہی ذلت و رسوائی اور عبرتناک سزا نازل نہ فرما دے جیسی ولید بن مغیرہ پر نازل ہو چکی ہے؟ یا اللہ! یہ عمر بن خطاب ہے۔ یا اللہ! اسلام کو عمر بن خطاب کے ذریعے قوت و عزت عطا فرما"۔ آپؐ کے اس ارشاد کے بعد حضرت عمرؓ نے حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہوئے کہا:

أشهد أن لا إله إلا الله وأنك رسول الله۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یقیناً آپؐ اللہ کے رسول ہیں"۔

یہ سُن کر گھر کے اندر موجود صحابہؓ نے اس زور سے تکبیر کہی کہ مسجد حرام والوں

سنائی پڑی[۷۰] معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ کی زور آوری کا حال یہ تھا کہ کوئی اُن سے مقابلے کی جرأت نہ کرتا تھا اس لیے ان کے مسلمان ہو جانے سے مُشرکین میں کہرام مچ گیا اور انہیں بڑی ذلّت و رسوائی محسوس ہوئی۔ دوسری طرف ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بڑی عزّت و قوت، شرف و اعزاز اور مسرّت و شادمانی حاصل ہوئی چنانچہ ابنِ اسحاق نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان روایت کیا ہے کہ جب مَیں مسلمان ہُوا تو میں نے سوچا کہ مکّے کا کون شخص رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا اور سخت ترین دشمن ہے؟ پھر مَیں نے جی ہی جی میں کہا' یہ ابوجہل ہے۔ اس کے بعد میں نے اس کے گھر جا کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا اور دیکھ کر بولا: اھلاً و سھلاً (خوش آمدید، خوش آمدید) کیسے آنا ہُوا؟ مَیں نے کہا "تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ مَیں اللہ اور اُس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لا چکا ہوں اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق کر چکا ہوں"۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ (یہ سنتے ہی) اس نے میرے رُخ پر دروازہ بند کر لیا اور بولا! "اللہ تیرا بُرا کرے اور جو کچھ تو لے کر آیا ہے اس کا بھی بُرا کرے"[۷۱]

امام ابنِ جوزی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی شخص مسلمان ہو جاتا تو لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ اسے زدوکوب کرتے۔ اور وہ بھی انہیں مارتا، اس لیے جب مَیں مسلمان ہُوا تو اپنے ماموں عاصی بن ہاشم کے پاس گیا اور اُسے خبر دی۔ وہ گھر کے اندر گھس گیا۔ پھر قریش کے ایک بڑے آدمی کے پاس گیا۔ شاید ابوجہل کی طرف اشارہ ہے ـــــ اور اسے خبر دی وہ بھی گھر کے اندر گھس گیا۔[۷۲]

ابنِ ہشام اور ابنِ جوزی کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے تو جمیل بن معمر جمحی کے پاس گئے۔ یہ شخص کسی بات کا ڈھول پیٹنے میں پورے قریش کے اندر سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے بتایا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس نے سنتے ہی نہایت بلند آواز سے چیخ کر کہا کہ خطاب کا بیٹا بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے پیچھے ہی تھے۔ بولے "یہ جھوٹ کہتا ہے۔ مَیں مسلمان ہو گیا ہوں"۔ بہرحال لوگ حضرت عمرؓ پر ٹوٹ پڑے اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ لوگ حضرت عمرؓ کو مار رہے تھے اور حضرت عمرؓ لوگوں کو مار رہے تھے یہاں تک کہ سورج

---

[۷۰] تاریخ عمر بن الخطاب ص ۷، ۱۰، ۱۱، مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ ص ۱۰۲، ۱۰۳، سیرت ابن ہشام ۱/ ۳۴۳ تا ۳۴۶

[۷۱] ابنِ ہشام ۱/ ۳۴۹، ۳۵۰ [۷۲] تاریخ عمرؓ بن الخطاب ص ۸

سر پر آگیا اور حضرت عمرؓ تھک کر بیٹھ گئے۔ لوگ سر پر سوار تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا جو بن پڑے کرلو۔ خدا کی قسم اگر ہم لوگ تین سو کی تعداد میں ہوتے تو پھر مکے میں یا تم ہی رہتے یا ہم ہی رہتے۔ [۷۳]

اس کے بعد مشرکین نے اس ارادے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر پر ہلہ بول دیا کہ انہیں جان سے مار ڈالیں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ خوف کی حالت میں گھر کے اندر تھے کہ اس دوران ابو عمرو عاص بن وائل سہمی آگیا۔ وہ دھاری دار یمنی چادر کا جوڑا اور ریشمی گوٹے سے آراستہ کرتا زیب تن کئے ہوئے تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ سہم سے تھا اور یہ قبیلہ جاہلیت میں ہمارا حلیف تھا۔ اس نے پوچھا کیا بات ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا میں مسلمان ہوگیا ہوں، اس لیے آپ کی قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔ عاص نے کہا: "یہ ممکن نہیں"۔ عاص کی یہ بات سن کر مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد عاص وہاں سے نکلا اور لوگوں سے ملا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ لوگوں کی بھیڑ سے وادی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عاص نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ لوگوں نے کہا یہی خطاب کا بیٹا مطلوب ہے جو بے دین ہوگیا ہے۔ عاص نے کہا: "اس کی طرف کوئی راہ نہیں"۔ یہ سنتے ہی لوگ واپس چلے گئے۔ [۷۴] ابن اسحاق کی ایک روایت میں ہے کہ واللہ ایسا لگتا تھا گویا وہ لوگ ایک کپڑا تھے جسے اس کے اوپر سے جھٹک کر پھینک دیا گیا۔ [۷۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر یہ کیفیت تو مشرکین کی ہوئی تھی۔ باقی رہے مسلمان تو ان کے احوال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مجاہد نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عمرؓ بن الخطاب سے دریافت کیا کہ کس وجہ سے آپ کا لقب فاروق پڑا؟ تو انہوں نے کہا مجھ سے تین دن پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرکے اخیر میں کہا کہ پھر جب میں مسلمان ہوا تو ـــــ میں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں خواہ زندہ رہیں خواہ مریں؟ آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم لوگ حق پر ہو خواہ زندہ رہو خواہ موت سے دوچار ہو ـــــ

---

[۷۳] ایضاً ص ۸۔ ابن ہشام ۱/ ۳۴۸، ۳۴۹

[۷۴] صحیح بخاری باب اسلام عمرؓ بن الخطاب ۱/ ۵۴۵ [۷۵] ابن ہشام ۱/ ۳۴۹

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ تب میں نے کہا کہ پھر چھپنا کیسا؟ اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے ہم ضرور باہر نکلیں گے۔ چنانچہ ہم دو صفوں میں آپؐ کو ہمراہ لے کر باہر آئے۔ ایک صف میں حمزہؓ تھے اور ایک میں میں تھا۔ ہمارے چلنے سے چکی کے آٹے کی طرح ہلکا ہلکا غبار اڑ رہا تھا، یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ قریش نے مجھے اور حمزہؓ کو دیکھا تو ان کے دلوں پر ایسی چوٹ لگی کہ اب تک نہ لگی تھی۔ اسی دن رسول اللہ ﷺ نے میرا لقب فاروق رکھ دیا۔ [۷۶]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہم خانۂ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے پر قادر نہ تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا۔ [۷۷]

حضرت خبیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو اسلام پردے سے باہر آیا۔ اس کی علانیہ دعوت دی گئی۔ ہم حلقے لگا کر بیت اللہ کے گرد بیٹھے بیت اللہ کا طواف کیا، اور جس نے ہم پر سختی کی اس سے انتقام لیا اور اس کے بعض مظالم کا جواب دیا۔ [۷۸]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب سے حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تب سے ہم برابر طاقتور اور باعزت رہے۔ [۷۹]

قریش کا نمائندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں

ان دونوں بطل جلیل

یعنی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کے مسلمان ہو جانے کے بعد ظلم و طغیان کے بادل چھٹنا شروع ہو گئے اور مسلمانوں کو جور و ستم کا تختۂ مشق بنانے کے لیے مشرکین پر جو بدمستی چھائی تھی اس کی جگہ سوجھ بوجھ نے لینی شروع کی۔ چنانچہ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ اس دعوت سے نبی ﷺ کا جو منشا اور مقصود ہو سکتا ہے اسے فراواں مقدار میں فراہم کرنے کی پیشکش کر کے آپؐ کو آپؐ کی دعوت و تبلیغ سے باز رکھنے کے لیے سودے بازی کی جائے لیکن ان غریبوں کو پتہ نہ تھا کہ وہ پوری کائنات جس پر سورج طلوع ہوتا ہے، آپ کی دعوت کے مقابل پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی اس لیے انہیں اپنے اس منصوبے میں ناکام و نامراد ہونا پڑا۔

---

[۷۶] تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی ص ۷۰۶ [۷۷] مختصر السیرہ للشیخ عبداللہ ص ۱۰۳
[۷۸] تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی ص ۱۳
[۷۹] صحیح البخاری: باب اسلام عمر بن الخطاب ۱/۵۴۵

ابنِ اسحاق نے یزید بن زیاد کے واسطے سے محمد بن کعب قرظی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مجھے بتایا گیا کہ عُتبہ بن رَبیعہ نے جو سردارِ قوم تھا، ایک روز قریش کی محفل میں کہا ـــــ اور اس وقت رسول اللہ ﷺ مسجدِ حرام میں ایک جگہ تن تنہا تشریف فرما تھے ـــ کہ قریش کے لوگو! کیوں نہ میں محمد کے پاس جا کر ان سے گفتگو کروں، اور ان کے سامنے چند امور پیش کروں، ہو سکتا ہے وہ کوئی چیز قبول کر لیں۔ تو جو کچھ وہ قبول کر لیں گے، اسے دے کر ہم انہیں اپنے آپ سے باز رکھیں گے! ـــ یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب حضرت حمزہؓ مسلمان ہو چکے تھے اور مشرکین نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے ـــــ

مشرکین نے کہا ابوالولید! آپ جائیے اور ان سے بات کیجئے۔ اس کے بعد عتبہ اُٹھا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا: "بھتیجے! ہماری قوم میں تمہارا جو مرتبہ و مقام ہے اور جو بلند پایہ نسب ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ اور اب تم اپنی قوم میں ایک بڑا معاملہ لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے تم نے ان کی جماعت میں تفرقہ ڈال دیا، ان کی عقلوں کو حماقت سے دوچار قرار دیا۔ ان کے معبودوں اور ان کے دین کی عیب چینی کی۔ اور ان کے جو آباؤ اجداد گذر چکے ہیں انہیں کافر ٹھہرایا۔ لہٰذا میری بات سنو! میں تم پر چند باتیں پیش کر رہا ہوں، ان پر غور کرو۔ ہو سکتا ہے کوئی بات قبول کر لو۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ابوالولید کہو! میں سنوں گا۔" ابوالولید نے کہا:

"بھتیجے! یہ معاملہ جسے تم لے کر آئے ہو اگر اس سے تم یہ چاہتے ہو کہ مال حاصل کرو تو ہم تمہارے لیے اتنا مال جمع کئے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ؛ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اعزاز و مرتبہ حاصل کرو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں یہاں تک کہ تمہارے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کریں گے؛ اور اگر تم چاہتے ہو کہ بادشاہ بن جاؤ تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں؛ اور اگر یہ جو تمہارے پاس آتا ہے کوئی جن بھوت ہے جسے تم دیکھتے ہو لیکن اپنے آپ سے دفع نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے لیے اس کا علاج تلاش کئے دیتے ہیں اور اس سلسلے میں ہم اپنا اتنا مال خرچ کرنے کو تیار ہیں کہ تم شفایاب ہو جاؤ؛ کیونکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جن بھوت انسان پر غالب آ جاتا ہے اور اس کا علاج کروانا پڑتا ہے۔"

عُتبہ یہ باتیں کہتا رہا۔ اور رسول اللہ ﷺ سُنتے رہے۔ جب فارغ ہو چکا تو آپ نے فرمایا: "ابوالولید تم فارغ ہو گئے؟" اس نے کہا: "ہاں"۔ آپ نے فرمایا: "اچھا اب میری سنو!" اس نے

کہا: ٹھیک ہے سنوں گا۔ آپؐ نے فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ○ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ ۔۔ (۴۱ : ۱ - ۵)

"حٰمٓ۔ یہ رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کی ہوئی ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ عربی قرآن ان لوگوں کیلیے جو علم رکھتے ہیں۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگوں نے اعراض کیا اور وہ سنتے نہیں۔ کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس کیلیے ہمارے دلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ الخ"

رسول اللہ ﷺ آگے پڑھتے جا رہے تھے۔ اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے چپ چاپ سنتا جا رہا تھا۔ جب آپؐ سجدے کی آیت پر پہنچے تو آپؐ نے سجدہ کیا پھر فرمایا: "ابوالولید! تمہیں جو کچھ سننا تھا سن چکے اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔"

عُتبہ اٹھا اور سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس آیا۔ اُسے آتا دیکھ کر مشرکین نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا: "خدا کی قسم! ابوالولید تمہارے پاس وہ چہرہ لے کر نہیں آ رہا ہے جو چہرہ لے کر گیا تھا۔" پھر جب ابوالولید آ کر بیٹھ گیا تو لوگوں نے پوچھا: "ابوالولید! پیچھے کی کیا خبر ہے؟" اس نے کہا: "پیچھے کی خبر یہ ہے کہ میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ ویسا کلام واللہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ خدا کی قسم وہ نہ شعر ہے نہ جادو، نہ کہانت، قریش کے لوگو! میری بات مانو اور اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔ (میری رائے یہ ہے کہ) اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ کر الگ تھلگ بیٹھ رہو۔ خدا کی قسم میں نے اس کا جو قول سنا ہے اس سے کوئی زبردست واقعہ رُونما ہو کر رہے گا۔ پھر اگر اس شخص کو عرب نے مار ڈالا تو تمہارا کام دوسروں کے ذریعے انجام پا جائے گا۔ اور اگر یہ شخص عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہت تمہاری بادشاہت اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی؛ اور اس کا وجود سب سے بڑھ کر تمہارے لیے سعادت کا باعث ہوگا۔" لوگوں نے کہا: "ابوالولید! خدا کی قسم تم پر بھی اس کی زبان کا جادو چل گیا۔" عُتبہ نے کہا: "اس شخص کے بارے میں میری رائے یہی ہے اب تمہیں جو ٹھیک معلوم ہو کرو۔"[۸۰]

---

[۸۰] ابن ہشام ۱/۲۹۳، ۲۹۴

ایک دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے جب تلاوت شروع کی تو عتبہ چپ چاپ سنتا رہا، جب آپؐ اللہ تعالےٰ کے اس قول پر پہنچے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ○ (۴۱:۱۳)

پس اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہدو کہ میں تمہیں عاد و ثمود کی کڑک جیسی ایک کڑک کے خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔

تو عتبہ تھرا کر کھڑا ہوگیا اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے منہ پر رکھ دیا کہ میں آپؐ کو اللہ کا اور قرابت کا واسطہ دیتا ہوں (کہ ایسا نہ کریں) اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ ڈراوا آن نہ پڑے۔ اس کے بعد وہ قوم کے پاس گیا اور مذکورہ گفتگو ہوئی۔ [۸۱]

ابوطالب بنی ہاشم اور بنی مُطّلِب کو جمع کرتے ہیں

حالات کی رفتار بدل چکی تھی۔ گرد و پیش کے ماحول میں فرق آچکا تھا، لیکن ابوطالب کے اندیشے برقرار تھے۔ انہیں مشرکین کی طرف سے اپنے بھتیجے کے متعلق برابر خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے واقعات پر برابر غور کر رہے تھے۔ مشرکین نے انہیں مقابلہ آرائی کی دھمکی دی تھی۔ پھر ان کے بھتیجے کو عمارہ بن ولید کے عوض حاصل کر کے قتل کرنے کے لیے سودے بازی کی کوشش کی تھی۔ ابوجہل ایک بھاری پتھر لے کر ان کے بھتیجے کا سر کچلنے اٹھا تھا۔ عُقبہ بن ابی مُعیط نے چادر لپیٹ کر گلا گھونٹنے اور مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ خطاب کا بیٹا تلوار لے کر ان کا کام تمام کرنے نکلا تھا۔ ابوطالب ان واقعات پر غور کرتے تو انہیں ایک ایسے سنگین خطرے کی بُو محسوس ہوتی جس سے ان کا دل کانپ اٹھتا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ مشرکین ان کا عہد توڑنے اور ان کے بھتیجے کو قتل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اور ان حالات میں خدانخواستہ اگر کوئی مشرک اچانک آپؐ پر ٹوٹ پڑا تو حمزہؓ یا عمرؓ یا اور کوئی شخص کیا کام دے سکے گا۔

ابوطالب کے نزدیک یہ بات یقینی تھی اور بہرحال صحیح بھی تھی کیونکہ مشرکین اعلانیہ رسول اللہ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اور ان کے اسی فیصلے کی طرف اللہ تعالےٰ کے اس قول میں اشارہ ہے:

---

[۸۱] تفسیر ابن کثیر ۶/ ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ○ (۴۳:۷۹)

"اگر انہوں نے ایک بات کا تہیہ کر رکھا ہے تو ہم بھی تہیہ کئے ہوئے ہیں۔"

اب سوال یہ تھا کہ ان حالات میں ابوطالب کو کیا کرنا چاہیئے! انہوں نے جب دیکھا کہ قریش ہر جانب سے ان کے بھتیجے کی مخالفت پر تُل پڑے ہیں تو انہوں نے اپنے جدِّ اعلیٰ عبدِ مناف کے دو صاحبزادوں ہاشم اور مُطّلب سے وجود میں آنے والے خاندانوں کو جمع کیا اور انہیں دعوت دی کہ اب تک وہ اپنے بھتیجے کی حفاظت و حمایت کا جو کام تنہا انجام دیتے رہے ہیں اب اسے سب مل کر انجام دیں۔ ابوطالب کی یہ بات عربی حمیّت کے پیشِ نظر ان دونوں خاندانوں کے سارے مسلم اور کافر افراد نے قبول کی۔ البتہ صرف ابوطالب کا بھائی ابولہب ایک ایسا فرد تھا جس نے اُسے منظور نہ کیا اور سارے خاندان سے الگ ہو کر مشرکینِ قریش سے جا ملا اور اُن کا ساتھ دیا۔ [۸۲]

○

[۸۲] ابنِ ہشام ۱/۲۶۹۔ مختصر السیرہ للشیخ عبداللہ ص ۱۰۶

مکمّل بائیکاٹ

صرف چار ہفتے یا اس سے بھی کم مدت میں مشرکین کو چار بڑے بڑے دھچکے لگ چکے تھے، یعنی حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کیا، پھر حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے، پھر محمد ﷺ نے ان کی پیش کش یا سودے بازی مسترد کی، پھر قبیلہ بنی ہاشم و بنی مُطّلب کے سارے ہی مسلم و کافر افراد نے ایک ہو کر نبی ﷺ کی حفاظت کا عہد و پیمان کیا۔ اس سے مشرکین چکرا گئے اور انہیں چکرانا ہی چاہیے تھا کیونکہ ان کی سمجھ میں آگیا کہ اگر انہوں نے نبی ﷺ کے قتل کا اقدام کیا تو آپؐ کی حفاظت میں مکّہ کی وادی مشرکین کے خون سے لالہ زار ہو جائے گی۔ بلکہ ممکن ہے ان کا مکمّل صفایا ہی ہو جائے، اس لیے انہوں نے قتل کا منصوبہ چھوڑ کر ظلم کی ایک اور راہ تجویز کی۔ جو ان کی اب تک کی تمام ظالمانہ کارروائیوں سے زیادہ سنگین تھی۔

ظلم و ستم کا پیمان

اس تجویز کے مطابق مشرکین وادیٔ مُحصّب میں خیف بنی کنانہ کے اندر جمع ہوئے اور آپس میں بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خلاف یہ عہد و پیمان کیا کہ نہ ان سے شادی بیاہ کریں گے، نہ خرید و فروخت کریں گے، نہ ان کے ساتھ اُٹھیں بیٹھیں گے، نہ ان سے میل جول رکھیں گے، نہ ان کے گھروں میں جائیں گے، نہ ان سے بات چیت کریں گے جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ان کے حوالے نہ کر دیں۔ مشرکین نے اس بائیکاٹ کی دستاویز کے طور پر ایک صحیفہ لکھا جس میں اس بات کا عہد و پیمان کیا گیا تھا کہ وہ بنی ہاشم کی طرف سے کبھی بھی کسی صلح کی پیش کش قبول نہ کریں گے نہ ان کے ساتھ کسی طرح کی مُروّت برتیں گے جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے مشرکین کے حوالے نہ کر دیں۔

ابن قیم کہتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحیفہ منصور بن عکرمہ بن عامر بن ہاشم نے لکھا تھا اور بعض کے نزدیک نضر بن حارث نے لکھا تھا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ لکھنے والا بغیض بن عامر بن ہاشم تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس پر بددُعا کی اور اس کا ہاتھ شل ہوگیا۔ [1]

بہرحال یہ عہد و پیمان طے پاگیا اور صحیفہ خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ابولہب کے سوا بنی ہاشم اور بنی مُطّلب کے سارے افراد خواہ مسلمان رہے ہوں یا کافر سمٹ سمٹا کر شِعبِ ابی طالب میں محبوس ہوگئے۔ یہ نبی ﷺ کی بعثت کے ساتویں سال محرم کی چاند رات کا واقعہ ہے۔

تین سال شِعب ابی طالب میں

اس بائیکاٹ کے نتیجے میں حالات نہایت سنگین ہوگئے۔ غلّے اور سامانِ خورد و نوش کی آمد بند ہوگئی کیونکہ مکّے میں جو غلّہ یا فروختنی سامان آتا تھا اسے مشرکین لپک کر خرید لیتے تھے۔ اس لیے محصورین کی حالت نہایت پتلی ہوگئی۔ انہیں پتّے اور چمڑے کھانے پڑے۔ فاقہ کشی کا حال یہ تھا کہ بھوک سے بلکتے ہوئے بچّوں اور عورتوں کی آوازیں گھاٹی کے باہر سنائی پڑتی تھیں۔ ان کے پاس بمشکل ہی کوئی چیز پہنچ پاتی تھی، وہ بھی بسِ پردہ۔ وہ لوگ حرمت والے مہینوں کے علاوہ باقی ایّام میں اشیائے ضرورت کی خرید کے لیے گھاٹی سے باہر نکلتے بھی نہ تھے۔ وہ اگرچہ قافلوں سے سامان خرید سکتے تھے جو باہر سے مکّہ آتے تھے لیکن ان کے سامان کے دام بھی مکّے والے اس قدر بڑھا کر خریدنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے کہ محصورین کے لیے کچھ خریدنا مشکل ہو جاتا تھا۔

حکیم بن حزام جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا کبھی کبھی اپنی پھوپھی کے لیے گیہوں بھجوا دیتا تھا۔ ایک بار ابوجہل سے سابقہ پڑ گیا۔ وہ غلّہ روکنے پر اَڑ گیا لیکن ابوالبختری نے مداخلت کی، اور اسے اپنی پھوپھی کے پاس گیہوں بھجوانے دیا۔

ادھر ابوطالب کو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں برابر خطرہ لگا رہتا تھا، اس لیے جب لوگ اپنے اپنے بستروں پر جاتے تو وہ رسول اللہ ﷺ سے کہتے کہ تم اپنے بستر پر سو رہو۔ مقصد یہ ہوتا کہ اگر کوئی شخص آپؐ کو قتل کرنے کی نیّت رکھتا ہو تو دیکھ لے کہ آپؐ کہاں سو رہے ہیں۔ پھر جب لوگ سو جاتے تو ابوطالب آپؐ کی جگہ بدل دیتے۔ یعنی اپنے بیٹوں، بھائیوں یا بھتیجوں میں سے کسی کو رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سلا دیتے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے کہتے کہ تم اس کے بستر پر چلے جاؤ۔

---

[1] زادالمعاد ۲/۴۶

اس محصوری کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمان حج کے ایام میں باہر نکلتے تھے اور حج کے لیے آنے والوں سے مل کر انہیں اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ اس موقع پر ابولہب کی جو حرکت ہوا کرتی تھی اس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔

صحیفہ چاک کیا جاتا ہے

ان حالات پر پورے تین سال گذر گئے۔ اس کے بعد محرم سنہ ۱۰ نبوت[۲] میں صحیفہ چاک کئے جانے اور اس ظالمانہ عہد و پیمان کو ختم کئے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع ہی سے قریش کے کچھ لوگ اگر اس عہد و پیمان سے راضی تھے تو کچھ ناراض بھی تھے اور ان ہی ناراض لوگوں نے اس صحیفے کو چاک کرنے کی تگ و دو کی۔

اس کا اصل محرک قبیلہ بنو عامر بن لوئی کا ہشام بن عمرو نامی ایک شخص تھا۔ یہ رات کی تاریکی میں چپکے چپکے شعب ابی طالب کے اندر غلہ بھیج کر بنو ہاشم کی مدد بھی کیا کرتا تھا ـــــ یہ زہیر بن ابی امیہ مخزومی کے پاس پہنچا ـــــ (زہیر کی ماں عاتکہ، عبدالمطلب کی صاحبزادی یعنی ابوطالب کی بہن تھیں۔) اور اس سے کہا: "زہیر! کیا تمہیں یہ گوارا ہے کہ تم تو مزے سے کھاؤ، پیو اور تمہارے ماموں کا وہ حال ہے جسے تم جانتے ہو؟" زہیر نے کہا: "افسوس! میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ ہاں اگر میرے ساتھ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اس صحیفے کو پھاڑنے کے لیے یقیناً اٹھ پڑتا۔" اس نے کہا اچھا تو ایک آدمی اور موجود ہے۔ پوچھا کون ہے؟ کہا میں ہوں۔ زہیر نے کہا اچھا تو اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔

اس پر ہشام، مطعم بن عدی کے پاس گیا اور بنو ہاشم اور بنو مطلب سے جو کہ عبد مناف کی اولاد تھے مطعم کے قریبی نسبی تعلق کا ذکر کر کے اسے ملامت کی کہ اس نے اس ظلم پر قریش کی ہمنوائی کیونکر کی؟ ـــــ یاد رہے کہ مطعم بھی عبد مناف ہی کی نسل سے تھا۔ مطعم نے کہا: "افسوس! میں تن تنہا کیا کر سکتا ہوں۔" ہشام نے کہا ایک آدمی اور موجود ہے۔ مطعم نے پوچھا کون ہے؟ ہشام نے کہا میں۔ مطعم نے کہا اچھا ایک تیسرا آدمی تلاش کرو۔ ہشام نے کہا: یہ بھی کر چکا ہوں۔ پوچھا وہ کون ہے؟ کہا زہیر بن ابی امیہ۔ مطعم نے کہا اچھا تو اب چوتھا آدمی تلاش کرو۔ اس

---

[۲] اس کی دلیل یہ ہے کہ ابوطالب کی وفات صحیفہ پھاڑے جانے کے چھ ماہ بعد ہوئی۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ ان کی موت رجب کے مہینے میں ہوئی تھی۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں ان کی وفات رمضان میں ہوئی تھی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی وفات صحیفہ پھاڑے جانے کے چھ ماہ بعد نہیں بلکہ آٹھ ماہ اور چند دن بعد ہوئی تھی۔ دونوں صورتوں میں وہ مہینہ جس میں صحیفہ پھاڑا گیا، محرم ثابت ہوتا ہے۔

پر ہشام بن عمرو، ابو البختری بن ہشام کے پاس گیا اور اس سے بھی اسی طرح کی گفتگو کی جیسی مطعم سے کی تھی۔ اس نے کہا بھلا کوئی اس کی تائید بھی کرنے والا ہے؟ ہشام نے کہا ہاں۔ پوچھا کون؟ کہا: زُہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی اور میں۔ اس نے کہا: اچھا تو اب پانچواں آدمی ڈھونڈو ـــــ اس کے لیے ہشام، زَمعہ بن اسود بن مُطّلب بن اسد کے پاس گیا۔ اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے بنو ہاشم کی قرابت اور ان کے حقوق یاد دلائے۔ اس نے کہا: بھلا جس کام کے لیے مجھے بلا رہے ہو اس سے کوئی اور بھی متفق ہے۔ ہشام نے اثبات میں جواب دیا اور سب کے نام بتلائے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حجون کے پاس جمع ہو کر آپس میں یہ عہد و پیمان کیا کہ صحیفہ چاک کرنا ہے۔ زہیر نے کہا: میں ابتدا کروں گا یعنی سب سے پہلے میں ہی زبان کھولوں گا۔

صبح ہوئی تو سب لوگ حسبِ معمول اپنی اپنی محفلوں میں پہنچے۔ زہیر بھی ایک جوڑا زیبِ تن کیے ہوئے پہنچا۔ پہلے بیت اللہ کے سات چکر لگائے پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا "مکے والو! کیا ہم کھانا کھائیں، کپڑے پہنیں اور بنو ہاشم تباہ و برباد ہوں، نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچا جائے نہ ان سے کچھ خریدا جائے۔ خدا کی قسم میں بیٹھ نہیں سکتا یہاں تک کہ اس ظالمانہ اور قرابت شکن صحیفے کو چاک کر دیا جائے"

ابو جہل ـــــ جو مسجد حرام کے ایک گوشے میں موجود تھا "بولا: تم غلط کہتے ہو خدا کی قسم اسے پھاڑا نہیں جا سکتا۔"

اس پر زَمعہ بن اسود نے کہا: "بخدا تم زیادہ غلط کہتے ہو، جب یہ صحیفہ لکھا گیا تھا تب بھی ہم اس سے راضی نہ تھے۔"

اس پر ابو البختری نے گرہ لگائی: "زمعہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے نہ ہم راضی ہیں نہ اسے ماننے کو تیار ہیں۔" اس کے بعد مُطعم بن عدی نے کہا: "تم دونوں ٹھیک کہتے ہو اور جو اس کے خلاف کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ ہم اس صحیفہ سے اور اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے اللہ کے حضور برأت کا اظہار کرتے ہیں۔"

پھر ہشام بن عمرو نے بھی اسی طرح کی بات کہی۔

یہ ماجرا دیکھ کر ابو جہل نے کہا: "ہونہہ! یہ بات رات میں طے کی گئی ہے۔ اور اس کا مشورہ یہاں کے بجائے کہیں اور کیا گیا ہے۔"

اس دوران ابو طالب بھی حرم پاک کے ایک گوشے میں موجود تھے۔ ان کے آنے کی وجہ یہ

تھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس صحیفے کے بارے میں یہ خبر دی تھی کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے کیڑے بھیج دیئے ہیں۔ جنہوں نے ظلم وستم اور قرابت شکنی کی ساری باتیں چٹ کر دی ہیں اور صرف اللہ عزّوجل کا ذکر باقی چھوڑا ہے۔ پھر نبی ﷺ نے اپنے چچا کو یہ بات بتائی تو وہ قریش سے یہ کہنے آئے تھے کہ ان کے بھتیجے نے انھیں یہ اور یہ خبر دی ہے اگر وہ جھوٹا ثابت ہوا تو ہم تمہارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں گے اور تمہارا جو جی چاہے کرنا۔ لیکن اگر وہ سچا ثابت ہوا تو تمہیں ہمارے بائیکاٹ اور ظلم سے باز آنا ہوگا۔ جب قریش کو یہ بتایا گیا تو انہوں نے کہا:

"آپ انصاف کی بات کہہ رہے ہیں"۔

ادھر ابوجہل اور باقی لوگوں کی نوک جھونک ختم ہوئی تو مطعم بن عدی صحیفہ چاک کرنے کے لیے اٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ واقعی کیڑوں نے اس کا صفایا کر دیا ہے۔ صرف باسمك اللّٰھم باقی رہ گیا ہے اور جہاں جہاں اللہ کا نام تھا وہ بچا ہے یا کیڑوں نے اُسے نہیں کھایا تھا۔

اس کے بعد صحیفہ چاک ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ اور بقیہ تمام حضرات شعب ابی طالب سے نکل آئے اور مشرکین نے آپؐ کی نبوت کی ایک عظیم الشان نشانی دیکھی۔ لیکن ان کا رویہ وہی رہا جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○ (۲:۵۴)

"اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو رخ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا پھرتا جادو ہے"۔

چنانچہ مشرکین نے اس نشانی سے بھی رُخ پھیر لیا اور اپنے کفر کی راہ میں چند قدم اور آگے بڑھ گئے۔ [۳]

○

---

[۳] بائیکاٹ کی یہ تفصیل حسبِ ذیل مآخذ سے مرتب کی گئی ہے۔ صحیح بخاری باب نزول النبی ﷺ بمکۃ ۱/۲۱۶ باب تقاسم المشرکین علی النبی ﷺ ۱/۵۴۸ زاد المعاد ۲/۴۶۔ ابن ہشام ۱/۳۵۰، ۳۵۱، ۳۷۴ تا ۳۷۷۔ رحمۃ للعالمین ۱/۶۹، ۷۰ مختصر السیرہ للشیخ عبد اللہ ص ۱۰۶ تا ۱۱۰ و مختصر السیرہ للشیخ محمد بن عبد الوہاب ص ۶۸ تا ۷۳۔ ان مآخذ میں قدرے اختلاف بھی ہے۔ ہم نے قرائن کی روشنی میں راجح پہلو درج کیا ہے۔

ابوطالب کی خدمت میں قریش کا آخری وفد

رسول اللہ ﷺ نے شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد پھر حسب معمول دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور اب مشرکین نے اگرچہ بائیکاٹ ختم کر دیا تھا لیکن وہ بھی حسب معمول مسلمانوں پر دباؤ ڈالنے اور اللہ کی راہ سے روکنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے اور جہاں تک ابوطالب کا تعلق ہے تو وہ بھی اپنی دیرینہ روایت کے مطابق پوری جاں سپاری کے ساتھ اپنے بھتیجے کی حمایت و حفاظت میں لگے ہوئے تھے لیکن اب ان کی عمر اسّی سال سے متجاوز ہو چلی تھی۔ کئی سال سے پے در پے سنگین آلام و حوادث نے اور خصوصاً محصوری نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُن کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور کمر ٹوٹ چکی تھی؛ چنانچہ گھاٹی سے نکلنے کے بعد چند ہی مہینے گزرے تھے کہ انہیں سخت بیماری نے آن پکڑا۔ اس موقع پر مشرکین نے سوچا کہ اگر ابوطالب کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد ہم نے اس کے بھتیجے پر کوئی زیادتی کی تو بڑی بدنامی ہوگی؛ اس لیے ابوطالب کے سامنے ہی نبی ﷺ سے کوئی معاملہ طے کر لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ بعض ایسی رعائتیں بھی دینے کے لیے تیار ہو گئے جس پر اب تک راضی نہ تھے۔ چنانچہ ان کا ایک وفد ابوطالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور یہ ان کا آخری وفد تھا۔

ابنِ اسحاق وغیرہ کا بیان ہے کہ جب ابوطالب بیمار پڑ گئے اور قریش کو معلوم ہوا کہ اُن کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھو حمزہؓ اور عمرؓ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اور محمد ﷺ کا دین قریش کے ہر قبیلے میں پھیل چکا ہے اس لیے چلو ابوطالب کے پاس چلیں کہ وہ اپنے بھتیجے کو کسی بات کا پابند کریں اور ہم سے بھی ان کے متعلق عہد لے لیں کیونکہ واللہ ہمیں اندیشہ ہے لوگ اس کی وفات کے بعد ہمارے قابو میں نہ رہیں گے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ بڈھا مر گیا اور محمد (ﷺ) کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو عرب ہمیں طعنہ دیں گے۔ کہیں گے کہ انہوں نے محمد (ﷺ) کو چھوڑے رکھا۔ اور اس کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہ کی۔ لیکن جب اس کا چچا مر گیا تو اس پر چڑھ دوڑے۔

بہرحال قریش کا یہ وفد ابوطالب کے پاس پہنچا اور ان سے گفت و شنید کی۔ وفد کے ارکان قریش کے معزز ترین افراد تھے یعنی عُتبہ بن ربیعہ شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، اُمیّہ بن خلف ابوسفیان بن حرب اور دیگر اشرافِ قریش جن کی کُل تعداد تقریباً پچیس تھی۔

انہوں نے کہا:

"اے ابوطالب! ہمارے درمیان آپ کا جو مرتبہ و مقام ہے اسے آپ بخوبی جانتے ہیں اور اب آپ جس حالت سے گذر رہے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ آپ کے آخری ایام ہیں۔ ادھر ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان جو معاملہ چل رہا ہے اس سے بھی آپ واقف ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ انہیں بلائیں اور ان کے بارے میں ہم سے کچھ عہد و پیمان لیں اور ہمارے بارے میں ان سے عہد و پیمان لیں یعنی وہ ہم سے دستکش رہیں اور ہم ان سے دستکش رہیں۔ وہ ہم کو ہمارے دین پر چھوڑ دیں اور ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں۔"

اس پر ابوطالب نے آپؐ کو بلوایا اور آپؐ تشریف لائے تو کہا: "بھتیجے! یہ تمہاری قوم کے معزز لوگ ہیں۔ تمہارے ہی لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں کچھ عہد و پیمان دے دیں اور تم بھی انہیں کچھ عہد و پیمان دے دو۔" اس کے بعد ابوطالب نے ان کی یہ پیش کش ذکر کی کہ کوئی بھی فریق دوسرے سے تعرض نہ کرے۔

جواب میں رسول ﷺ نے وفد کو مخاطب کر کے فرمایا: "آپ لوگ یہ بتائیں کہ اگر میں ایک ایسی بات پیش کروں جس کے اگر آپ قائل ہو جائیں تو عرب کے بادشاہ بن جائیں اور عجم آپ کے زیرِ نگیں آ جائے تو آپ کی رائے کیا ہوگی؟" بعض روایتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ آپؐ نے ابوطالب کو مخاطب کر کے فرمایا: "میں ان سے ایک ایسی بات چاہتا ہوں جس کے یہ قائل ہو جائیں تو عرب ان کے تابع فرمان بن جائیں اور عجم انہیں جزیہ ادا کریں۔" ایک اور روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا: "چچا جان! آپ کیوں نہ انہیں ایک ایسی بات کی طرف بلائیں جو ان کے حق میں بہتر ہے؟" انہوں نے کہا تم انہیں کس بات کی طرف بلانا چاہتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: "میں ایک ایسی بات کی طرف بلانا چاہتا ہوں جس کے یہ قائل ہو جائیں تو عرب ان کا تابع فرمان بن جائے اور عجم پر ان کی بادشاہت قائم ہو جائے۔" ـــــ ابنِ اسحاق کی ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: "آپ لوگ صرف ایک بات مان لیں جس کی بدولت آپ عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور عجم آپ کے

زیرِ نگیں آجائے گا۔"

بہرحال جب یہ بات آپ نے کہی تو وہ لوگ کسی قدر توقف میں پڑ گئے اور سٹپٹا سے گئے۔ وہ حیران تھے کہ صرف ایک بات جو اس قدر مفید ہے۔ اسے مسترد کیسے کر دیں؟ آخر کار ابوجہل نے کہا: "اچھا بتاؤ تو وہ بات ہے کیا؟ تمہارے باپ کی قسم! ایسی ایک بات کیا دس باتیں بھی پیش کرو تو ہم ماننے کو تیار ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: "آپ لوگ لا الٰہ الا اللہ کہیں اور اللہ کے سوا جو کچھ پوجتے ہیں اسے چھوڑ دیں۔" اس پر انہوں نے ہاتھ پیٹ پیٹ کر اور تالیاں بجا بجا کر کہا: "محمد (ﷺ)! تم یہ چاہتے ہو کہ سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالو؟ واقعی تمہارا معاملہ بڑا عجیب ہے۔"

پھر آپس میں ایک دوسرے سے بولے: "خدا کی قسم یہ شخص تمہاری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں۔ لہٰذا چلو اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ڈٹ جاؤ۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور اس شخص کے درمیان فیصلہ فرما دے۔" اس کے بعد انہوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ اس واقعے کے بعد انہی لوگوں کے بارے میں قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ○ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ ○ کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ○ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ○ اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ○ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْھُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ ۚ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ○ مَا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ ۚ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ○ (۳۸: ۱-۷)

"ص، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی۔ بلکہ جنہوں نے کفر کیا ہیکڑی اور ضد میں ہیں۔ ہم نے کتنی ہی قومیں ان سے پہلے ہلاک کر دیں اور وہ چیخے چلائے (لیکن اس وقت) جبکہ بچنے کا وقت نہ تھا۔ انہیں تعجب ہے کہ ان کے پاس خود انہیں میں سے ایک ڈرانے والا آگیا۔ کافر کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے۔ بڑا جھوٹا ہے۔ کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ بس ایک ہی معبود بنا ڈالا! یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اور ان کے بڑے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو۔ یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ ہم نے کسی اور ملت میں یہ بات نہیں سنی۔ یہ محض گھڑنت ہے۔" [1]

---

[1] ابن ہشام ۱/۴۱۷ تا ۴۱۹۔ مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ ص ۹۱

غم کا سال

ابوطالب کی وفات

ابوطالب کا مرض بڑھتا گیا اور بالآخر وہ انتقال کر گئے۔ ان کی وفات شعب ابی طالب کی محصوری کے خاتمے کے چھ ماہ بعد رجب سنہ ۱۰ نبوی میں ہوئی۔[1] ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات سے صرف تین دن پہلے ماہ رمضان میں وفات پائی۔

صحیح بخاری میں حضرت مسیبؓ سے مروی ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو نبی ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں ابوجہل بھی موجود تھا۔ آپؐ نے فرمایا "چچا جان، آپ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیجئے۔ بس ایک کلمہ جس کے ذریعے میں اللہ کے پاس آپ کے لیے حجت پیش کر سکوں گا۔" ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے کہا "ابوطالب! کیا عبدالمطلب کی ملت سے رُخ پھیر لو گے؟" پھر یہ دونوں برابر ان سے بات کرتے رہے یہاں تک کہ آخری بات جو ابوطالب نے لوگوں سے کہی یہ تھی کہ "عبدالمطلب کی ملت پر" نبی ﷺ نے فرمایا "میں جب تک آپ سے روک نہ دیا جاؤں آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔" اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○ (۹/۱۱۳)

"نبی (ﷺ) اور اہل ایمان کے لیے درست نہیں کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کریں، اگرچہ وہ قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ وہ لوگ جہنمی ہیں۔"

اور یہ آیت بھی نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ..[2] (۲۸/۵۶)

"آپ جسے پسند کریں ہدایت نہیں دے سکتے۔"

---

[1] سیرت کے مآخذ میں بڑا اختلاف ہے کہ ابوطالب کی وفات کس مہینے میں ہوئی۔ ہم نے رجب کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ بیشتر مآخذ کا اتفاق ہے کہ ان کی وفات شعب ابی طالب سے نکلنے کے چھ ماہ بعد ہوئی۔ اور محصوری کا آغاز محرم سنہ ۱۰ نبوی کی چاند رات سے ہوا تھا۔ اس حساب سے ان کی موت کا زمانہ رجب سنہ ۱۰ نبوی ہی ہوتا ہے۔

[2] صحیح بخاری باب قصۃ ابی طالب ۱/۵۴۸

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ابوطالب نے نبی ﷺ کی کس قدر حمایت وحفاظت کی تھی۔ وہ درحقیقت مکے کے بڑوں اور احمقوں کے حملوں سے اسلامی دعوت کے بچاؤ کے لیے ایک قلعہ تھے، لیکن وہ بذاتِ خود اپنے بزرگ آباؤ اجداد کی ملت پر قائم رہے، اس لیے مکمل کامیابی نہ پا سکے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا: "آپ اپنے چچا کے کیا کام آسکے؟ کیونکہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لیے (دوسروں پر) بگڑتے (اور ان سے لڑائی مول لیتے) تھے۔" آپ نے فرمایا: "وہ جہنم کی ایک چھچھلی جگہ میں ہیں۔ اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں ہوتے۔"[۳]

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک بار نبی ﷺ کے پاس آپ کے چچا کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا: "ممکن ہے قیامت کے دن انہیں میری شفاعت فائدہ پہنچا دے اور انہیں جہنم کی ایک کم گہری جگہ میں رکھ دیا جائے کہ آگ صرف ان کے دونوں ٹخنوں تک پہنچ سکے۔"[۴]

حضرت خدیجہؓ جوارِ رحمت میں

جناب ابوطالب کی وفات کے دو ماہ بعد یا صرف تین دن بعد ـــــ علی اختلاف الاقوال ـــــ حضرت اُمّ المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی رحلت فرما گئیں۔ ان کی وفات نبوت کے دسویں سال ماہِ رمضان میں ہوئی۔ اس وقت وہ ۶۵ برس کی تھیں اور رسول اللہ ﷺ اپنی عمر کی پچاسویں منزل میں تھے۔[۵]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی بڑی گرانقدر نعمت تھیں۔ وہ ایک چوتھائی صدی آپ کی رفاقت میں رہیں اور اس دوران رنج وقلق کا وقت آتا تو آپ کے لیے تڑپ اٹھتیں، سنگین اور مشکل ترین حالات میں آپ کو قوت پہنچاتیں، تبلیغ رسالت میں آپ کی مدد کرتیں اور اس تلخ ترین جہاد کی سختیوں میں آپ کی شریک کار رہتیں۔ اور اپنی جان ومال سے آپ کی خیر خواہی وغمگساری کرتیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

[۳-۴] صحیح بخاری باب قصۃ ابی طالب ۱/ ۵۴۸

[۵] رمضان میں وفات کی صراحت ابن جوزی نے تلقیح الفہوم ص ۷ میں اور علامہ منصور پوری نے رحمۃ للعالمین ۲/ ۱۶۴ میں کی ہے۔

"جس وقت لوگوں نے میرے ساتھ کفر کیا وہ مجھ پر ایمان لائیں، جس وقت لوگوں نے مجھے جھٹلایا انہوں نے میری تصدیق کی جس وقت لوگوں نے مجھے محروم کیا انہوں نے مجھے اپنے مال میں شریک کیا اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی اور دوسری بیویوں سے کوئی اولاد نہ دی"[۶]

صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "اے اللہ کے رسولؐ! یہ خدیجہؓ تشریف لا رہی ہیں۔ ان کے پاس ایک برتن ہے جس میں سالن یا کھانا یا کوئی مشروب ہے۔ جب وہ آپؐ کے پاس آپہنچیں تو آپؐ انہیں ان کے رب کی طرف سے سلام کہیں اور جنت میں موتی کے ایک محل کی بشارت دیں جس میں نہ شور و شغب ہوگا نہ درماندگی و تکان"[۷]

غم ہی غم

یہ دونوں الم انگیز حادثے صرف چند دنوں کے دوران پیش آئے۔ جس سے نبی ﷺ کے دل میں غم و الم کے احساسات موجزن ہوگئے اور اس کے بعد قوم کی طرف سے بھی مصائب کا طومار بندھ گیا کیونکہ ابوطالب کی وفات کے بعد ان کی جسارت بڑھ گئی اور وہ کھل کر آپؐ کو اذیت اور تکلیف پہنچانے لگے۔ اس کیفیت نے آپؐ کے غم و الم میں اور اضافہ کر دیا۔ آپؐ نے ان سے مایوس ہو کر طائف کی راہ لی کہ ممکن ہے وہاں لوگ آپؐ کی دعوت قبول کر لیں، آپؐ کو پناہ دے دیں۔ اور آپؐ کی قوم کے خلاف آپؐ کی مدد کریں، لیکن وہاں نہ کوئی پناہ دہندہ ملا نہ مددگار، بلکہ اُلٹے انہوں نے سخت اذیت پہنچائی اور ایسی بدسلوکی کہ خود آپؐ کی قوم نے ویسی بدسلوکی نہ کی تھی۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

یہاں اس بات کا اعادہ بے محل نہ ہوگا کہ اہلِ مکہ نے جس طرح نبی ﷺ کے خلاف ظلم و جور کا بازار گرم کر رکھا تھا اسی طرح وہ آپؐ کے رفقاء کے خلاف بھی ستم رانی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے، چنانچہ آپؐ کے ہمدم و ہمراز ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور حبشہ کے ارادے سے تن بہ تقدیر نکل پڑے، لیکن برکِ غماد پہنچے تو ابنِ دغنہ سے ملاقات ہوگئی اور وہ اپنی پناہ میں آپؓ کو مکہ واپس لے آیا۔[۸]

ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ جب ابوطالب انتقال کر گئے تو قریش نے رسول اللہ ﷺ

---

[۶] مسند احمد ۶/ ۱۱۸ [۷] صحیح بخاری باب تزویج النبی ﷺ خدیجۃ وفضلہا ۱/ ۵۲۹

[۸] اکبر شاہ نجیب آبادی نے صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ اسی سال پیش آیا تھا۔ دیکھئے تاریخ اسلام ۱/ ۱۲۰، اصل واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ ابنِ ہشام ۱/ ۳۷۲ تا ۳۷۴۔ اور صحیح بخاری ۱/ ۵۵۲، ۵۵۳ میں مذکور ہے۔

کو ایسی اذیت پہنچائی کہ ابوطالب کی زندگی میں کبھی اس کی آرزو بھی نہ کر سکے تھے حتیٰ کہ قریش کے ایک احمق نے سامنے آکر آپؐ کے سر پر مٹی ڈال دی۔ آپؐ اسی حالت میں گھر تشریف لائے۔ مٹی آپؐ کے سر پر پڑی ہوئی تھی۔ آپؐ کی ایک صاحبزادی نے اُٹھ کر مٹی دھوئی۔ وہ دھوتے ہوئے روتی جا رہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ انہیں تسلی دیتے ہوئے فرماتے جا رہے تھے: "بیٹی! روؤ نہیں اللہ تمہارے ابا کی حفاظت کرے گا" اِس دوران آپؐ یہ بھی فرماتے جا رہے تھے کہ قریش نے میرے ساتھ کوئی ایسی بدسلوکی نہ کی جو مجھے ناگوار گذری ہو یہاں تک کہ ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔[۹]

اسی طرح کے پے در پے آلام و مصائب کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے اس سال کا نام عام الحزن یعنی غم کا سال رکھ دیا اور یہ سال اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہو گیا۔

حضرت سَوْدَہ رضی اللہ عنہا سے شادی

اسی سال۔ شوال سنہ نبوت — میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت سَوْدَہ بنت زَمْعَہ رضؓ سے شادی کی۔ یہ ابتدائی دَور میں مسلمان ہو گئی تھیں اور دوسری ہجرتِ حبشہ کے موقع پر ہجرت بھی کی تھی۔ ان کے شوہر کا نام سکرانؓ بن عمرو تھا۔ وہ بھی قدیم الاسلام تھے اور حضرت سَوْدَہؓ نے انہیں کی رفاقت میں حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی لیکن وہ حبشہ ہی میں — اور کہا جاتا ہے کہ مکہ واپس آکر انتقال کر گئے، اس کے بعد جب حضرت سَوْدَہؓ کی عدت ختم ہو گئی تو نبی ﷺ نے ان کو شادی کا پیغام دیا اور پھر شادی ہو گئی۔ یہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد پہلی بیوی ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے شادی کی۔ چند برس بعد انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی۔[۱۰]

○

---

[۹] ابن ہشام ۱/۱۶۴ [۱۰] رحمۃ للعالمین ۲/۱۶۵، تلقیح الفہوم ص ۶

ابتدائی مسلمانوں کا صبر و ثبات اور اسکے اسباب و عوامل

یہاں پہنچ کر گہری سوجھ بوجھ اور مضبوط دل و دماغ کا آدمی بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور بڑے بڑے عقلاء دم بخود ہو کر پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کیا اسباب و عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اس قدر انتہائی اور معجزانہ حد تک ثابت قدم رکھا؟ آخر مسلمانوں نے کس طرح ان بے پایاں مظالم پر صبر کیا جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل لرز اٹھتا ہے۔ بار بار کھٹکنے اور دل کی تہوں سے ابھرنے والے اس سوال کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و عوامل کی طرف ایک سرسری اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ ان میں سب سے پہلا اور اہم سبب اللہ کی ذاتِ واحد پر ایمان اور اس کی ٹھیک ٹھیک معرفت ہے کیونکہ جب ایمان کی بشاشت دلوں میں جاگزین ہو جاتی ہے تو وہ پہاڑوں سے ٹکرا جاتا ہے اور اسی کا پلہ بھاری رہتا ہے اور جو شخص ایسے ایمانِ محکم اور یقین کامل سے بہرہ ور ہو وہ دُنیا کی مشکلات کو ــ خواہ وہ جتنی بھی زیادہ ہوں اور جیسی بھی بھاری بھرکم، خطرناک اور سخت ہوں ــ اپنے ایمان کے بالمقابل اس کائی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جو کسی بند توڑ اور قلعہ شکن سیلاب کی بالائی سطح پر جم جاتی ہے۔ اس لیے مومن اپنے ایمان کی حلاوت، یقین کی تازگی اور اعتقاد کی بشاشت کے سامنے ان مشکلات کی کوئی پروا نہیں کرتا کیونکہ:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ۚ (۱۳:۱۷)

"جو جھاگ ہے وہ تو بے کار ہو کر اُڑ جاتا ہے اور جو لوگوں کو نفع دینے والی چیز ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے۔"

پھر اسی ایک سبب سے ایسے اسباب وجود میں آتے ہیں جو اِس صبر و ثبات کو قوت بخشتے ہیں مثلاً:

۲۔ پُرکشش قیادت، نبی اکرم ﷺ جو اُمتِ اسلامیہ ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کے سب سے بلند پایہ قائد و رہنما تھے ایسے جسمانی جمال، نفسانی کمال، کریمانہ اخلاق، باعظمت کردار اور شریفانہ عادات و اطوار سے بہرہ ور تھے کہ دل خود بخود آپ ﷺ کی جانب کھنچے جاتے تھے اور

طبیعتیں خود بخود آپ ﷺ پر نچھاور ہوتی تھیں، کیونکہ جن کمالات پر لوگ جان چھڑکتے ہیں ان سے آپ ﷺ کو اتنا بھرپور حصہ ملا تھا کہ اتنا کسی اور انسان کو دیا ہی نہیں گیا۔ آپ ﷺ شرف و عظمت اور فضل و کمال کی سب سے بلند چوٹی پر جلوہ فگن تھے۔ عفت و امانت، صدق و صفا اور جملہ اُمورِ خیر میں آپ ﷺ کا وہ امتیازی مقام تھا کہ رفقاء تو رفقاء آپ ﷺ کے دشمنوں کو بھی آپ ﷺ کی یکتائی و انفرادیت پر کبھی شک نہ گذرا۔ آپ ﷺ کی زبان سے جو بات نکل گئی، دشمنوں کو بھی یقین ہوگیا کہ وہ سچی ہے اور ہو کر رہے گی۔ واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ایک بار قریش کے ایسے تین آدمی اکٹھے ہوئے جن میں سے ہر ایک نے اپنے بقیہ دو ساتھیوں سے چھپ چھپا کر تن تنہا قرآنِ مجید سنا تھا لیکن بعد میں ہر ایک کا راز دوسرے پر فاش ہوگیا تھا۔ ان ہی تینوں میں سے ایک ابوجہل بھی تھا۔ تینوں اکٹھے ہوئے تو ایک نے ابوجہل سے دریافت کیا کہ بتاؤ تم نے جو کچھ محمد (ﷺ) سے سنا ہے اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟ ابوجہل نے کہا "میں نے کیا سنا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے اور بنو عبدِ مناف نے شرف و عظمت میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے (غربا و مساکین کو) کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا، انہوں نے داد و دہش میں سواریاں عطا کیں تو ہم نے بھی عطا کیں، انہوں نے لوگوں کو عطیات سے نوازا تو ہم نے بھی ایسا کیا، یہاں تک کہ جب ہم اور وہ گھٹنوں گھٹنوں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوگئے اور ہماری اور ان کی حیثیت ریس کے دو مدِّمقابل گھوڑوں کی ہوگئی تو اب بنو عبدِ مناف کہتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نبی (ﷺ) ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ بھلا بتایئے ہم اسے کب پا سکتے ہیں؟ خدا کی قسم! ہم اس شخص پر کبھی ایمان نہ لائیں گے، اور اس کی ہرگز تصدیق نہ کریں گے۔" چنانچہ ابوجہل کہا کرتا تھا: "اے محمد (ﷺ)، ہم تمہیں جھوٹا نہیں کہتے، لیکن تم جو کچھ لے کر آئے ہو اس کی تکذیب کرتے ہیں" اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۶:۳۳)

"یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے، بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔"

اس واقعے کی تفصیل گذر چکی ہے کہ ایک روز کفار نے نبی ﷺ کو تین بار لعن طعن کی اور تیسری دفعہ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے قریش کی جماعت! میں تمہارے پاس ذبح (کا حکم) لیکر آیا ہوں تو یہ بات ان پر اس طرح اثر کر گئی کہ جو شخص عداوت میں سب سے بڑھ کر تھا وہ بھی

بہتر سے بہتر جو جملہ پا سکتا تھا اس کے ذریعے آپ ﷺ کو راضی کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اسی طرح اس کی بھی تفصیل گذر چکی ہے کہ جب حالت سجدہ میں آپ ﷺ پر اوجھڑی ڈالی گئی، اور آپ ﷺ نے سر اٹھانے کے بعد اس حرکت کے کرنے والوں پر بددعا کی تو ان کی ہنسی ہوا ہو گئی۔ اور ان کے اندر غم و قلق کی لہر دوڑ گئی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب ہم بچ نہیں سکتے۔

یہ واقعہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ ﷺ نے ابولہب کے بیٹے عُتَیبہ پر بددعا کی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ آپ ﷺ کی بددعا کی زد سے بچ نہیں سکتا، چنانچہ اس نے ملک شام کے سفر میں شیر کو دیکھتے ہی کہا: "واللہ محمد (ﷺ) نے مکہ میں رہتے ہوئے مجھے قتل کر دیا۔"

اُبَیّ بن خَلَف کا واقعہ ہے کہ وہ بار بار آپ ﷺ کو قتل کی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ ایک بار آپ ﷺ نے جواباً فرمایا کہ (تم نہیں) بلکہ میں تمہیں قتل کروں گا، ان شاء اللہ۔ اسکے بعد جب آپ ﷺ نے جنگ احد کے روز اُبَیّ کی گردن پر نیزہ مارا تو اگرچہ اس سے معمولی خراش آئی تھی لیکن اُبَیّ برابر یہی کہے جا رہا تھا کہ محمد ﷺ نے مجھ سے مکہ میں کہا تھا کہ میں تمہیں قتل کروں گا اس لیے اگر وہ مجھ پر تھوک ہی دیتا تو بھی میری جان نکل جاتی۔[1] (تفصیل آگے آرہی ہے)

اسی طرح ایک بار حضرت سَعد بن معاذ نے مکے میں اُمَیّہ بن خلف سے کہہ دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مسلمان تمہیں قتل کریں گے تو اس سے اُمَیّہ پر سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی، جو مسلسل قائم رہی چنانچہ اس نے عہد کر لیا کہ وہ مکے سے باہر ہی نہ نکلے گا اور جب جنگ بدر کے موقع پر ابوجہل کے اصرار سے مجبور ہو کر نکلنا پڑا تو اس نے مکے کا سب سے تیز رو اونٹ خریدا تاکہ خطرے کی علامات ظاہر ہوتے ہی چمپت ہو جائے۔ ادھر جنگ میں جانے پر آمادہ دیکھ کر اس کی بیوی نے بھی ٹوکا کہ ابوصفوان! آپ کے یثربی بھائی نے جو کچھ کہا تھا اسے آپ بھول گئے؟ ابوصفوان نے جواب میں کہا کہ نہیں، بلکہ میں خدا کی قسم ان کے ساتھ تھوڑی ہی دور جاؤں گا۔[2]

یہ تو آپ ﷺ کے دشمنوں کا حال تھا۔ باقی رہے آپ ﷺ کے صحابہؓ اور رفقاء

---

[1] ابن ہشام ۱/۳۱۶
[2] ترمذی: تفسیر سورۃ الانعام ۲/۱۳۲
[3] ابن ہشام ۲/۸۴
[4] صحیح بخاری ۲/۵۶۳

تو آپ ﷺ تو ان کے لیے دیدہ و دل اور جان و روح کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے آپ ﷺ کے لیے حُبِّ صادق کے جذبات اس طرح اُبلتے تھے جیسے نشیب کی طرف پانی بہتا ہے اور جان و دل اس طرح آپ ﷺ کی طرف کھنچتے تھے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ ؎

فصورته هيولى كل جسم ومغناطيس افئدة الرجال

آپ کی صورت ہر جسم کا ہیُولیٰ تھی اور آپ کا وجود ہر دل کے لیے مقناطیس

اس محبت و فداکاری اور جاں نثاری و جاں سپاری کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ ﷺ کے ناخن میں خراش تک آجائے یا آپ ﷺ کے پاؤں میں کانٹا ہی چبھ جائے خواہ اس کے لیے ان کی گردنیں ہی کیوں نہ کوٹ دی جائیں۔

ایک روز ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بری طرح کچل دیا گیا اور انہیں سخت مار ماری گئی۔ عُتبہ بن ربیعہ ان کے قریب آکر انھیں دو پیوند لگے ہوئے جوتوں سے مارنے لگا۔ چہرے کو خصوصیت سے نشانہ بنایا۔ پھر پیٹ پر چڑھ گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ چہرے اور ناک کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ پھر ان کے قبیلہ بنو تیم کے لوگ انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے گئے۔ انہیں یقین تھا کہ اب یہ زندہ نہ بچیں گے لیکن دن کے خاتمے کے قریب ان کی زبان کھل گئی۔ (اور زبان کھلی تو یہ) بولے کہ رسول اللہ ﷺ کیا ہوئے؟ اس پر بنو تیم نے انہیں سخت سست کہا۔ ملامت کی اور ان کی ماں اُمّ الخیر سے یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ انہیں کچھ کھلا پلا دینا۔ جب وہ تنہا رہ گئیں تو انہوں نے ابوبکرؓ سے کھانے پینے کے لیے اصرار کیا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ یہی کہتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا ہوا؟ آخر کار ام الخیر نے کہا "مجھے تمہارے ساتھی کا حال معلوم نہیں"۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اُمِّ جمیل بنت خطاب کے پاس جاؤ اور اس سے دریافت کرو"۔ وہ اُمِّ جمیل کے پاس گئیں اور بولیں، "ابوبکرؓ تم سے محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں"۔ اُمِّ جمیل نے کہا: "میں نہ ابوبکرؓ کو جانتی ہوں نہ محمد بن عبداللہ ﷺ کو۔ البتہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ تمہارے صاحبزادے کے پاس چل سکتی ہوں"۔ اُمّ الخیر نے کہا بہتر ہے۔ اس کے بعد ام جمیل ان کے ہمراہ آئیں دیکھا تو ابوبکرؓ انتہائی خستہ حال پڑے تھے۔ پھر قریب ہوئیں تو چیخ پڑیں اور کہنے لگیں "جس قوم نے آپ کی یہ درگت بنائی ہے وہ یقیناً بدقماش اور کافر قوم ہے مجھے امید ہے

کہ اللہ آپ کا بدلہ ان سے لے کر رہے گا"۔ ابوبکرؓ نے پوچھا: "رسول اللہ ﷺ کیا ہوئے؟" انہوں نے کہا: "یہ آپ کی ماں سُن رہی ہیں"۔ کہا کوئی بات نہیں۔ بولیں: "آپ صحیح سالم ہیں"۔ پوچھا کہاں ہیں؟ کہا: "ابن ارقم کے گھر میں ہیں"۔ ابوبکرؓ نے فرمایا: "اچھا تو پھر اللہ کے لیے مجھ پر عہد ہے کہ میں نہ کوئی کھانا کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں"۔ اس کے بعد اُمّ الخیر اور اُمّ جمیل رکی رہیں۔ جب آمد و رفت بند ہو گئی اور سناٹا چھا گیا تو یہ دونوں ابوبکرؓ کو لے کر نکلیں۔ وہ ان پر ٹیک لگائے ہوئے تھے اور اس طرح انہوں نے ابوبکرؓ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا دیا۔[۵]

محبت و جاں سپاری کے کچھ اور بھی نادر واقعات ہم اپنی اس کتاب میں موقع بہ موقع نقل کریں گے خصوصاً جنگ احد کے واقعات اور حضرت خبیبؓ کے حالات کے ضمن میں۔

۳۔ احساسِ ذمہ داری ــ صحابہ کرامؓ جانتے تھے کہ یہ مشتِ خاک جسے انسان کہا جاتا ہے اس پر کتنی بھاری بھرکم اور زبردست ذمہ داریاں ہیں اور یہ کہ ان ذمہ داریوں سے کسی صورت میں گریز اور پہلو تہی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس گریز کے جو نتائج ہوں گے وہ موجودہ ظلم و ستم سے زیادہ خوفناک اور ہلاکت آفریں ہوں گے۔ اور اس گریز کے بعد خود ان کو اور ساری انسانیت کو جو خسارہ لاحق ہوگا وہ اس قدر شدید ہوگا کہ اس ذمہ داری کے نتیجہ میں پیش آنے والی مشکلات اس خسارے کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

۴۔ آخرت پر ایمان ــ جو مذکورہ احساسِ ذمہ داری کی تقویت کا باعث تھا صحابہ کرامؓ اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے کہ انہیں رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونا ہے پھر ان کے چھوٹے بڑے اور معمولی و غیر معمولی ہر طرح کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اس کے بعد یا تو نعمتوں بھری دائمی جنّت ہوگی یا عذاب سے بھڑکتی ہوئی جہنم۔ اس یقین کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ اپنی زندگی امید و بیم کی حالت میں گذارتے تھے، یعنی اپنے پروردگار کی رحمت کی امید رکھتے تھے اور اس کے عذاب کا خوف بھی اور ان کی کیفیت وہی رہتی تھی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ○ (۲۳:۶۰)

---

[۵] البدایہ والنہایہ ۳/۲۰

"وہ جو کچھ کرتے ہیں دل کے اس خوف کے ساتھ کرتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔"

انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ دُنیا اپنی ساری نعمتوں اور مصیبتوں سمیت آخرت کے مقابل مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں اور یہ یقین اتنا پختہ تھا کہ اس کے سامنے دنیا کی ساری مشکلات، مشقتیں اور تلخیاں ہیچ تھیں۔ اس لیے وہ ان مشکلات اور تلخیوں کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔

۵۔ ان ہی پُرخطر، مشکل ترین اور تیرہ و تار حالات میں ایسی سورتیں اور آیتیں بھی نازل ہو رہی تھیں جن میں بڑے ٹھوس اور پُرکشش انداز سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر دلائل و براہین قائم کیے گئے تھے اور اس وقت اسلام کی دعوت انہی اصولوں کے گرد گردش کر رہی تھی۔ ان آیتوں میں اہلِ اسلام کو ایسے بنیادی اُمور بتلائے جا رہے تھے جن پر اللہ تعالےٰ نے عالمِ انسانیت کے سب سے باعظمت اور پُررونق معاشرے یعنی اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل مقدر کر رکھی تھی۔ نیز ان آیات میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو پامردی و ثابت قدمی پر اُبھارا جا رہا تھا، اس کے لیے مثالیں دی جا رہی تھیں اور اس کی حکمتیں بیان کی جاتی تھیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○ (۲:۲۱۴)

"تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ وہ سختیوں اور بدحالیوں سے دوچار ہوئے اور انہیں جھنجھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ رسول اور جو لوگ ان پر ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سنو! اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔"

الٓمّٓ ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (۲۹:۱-۳)

"الٓمّٓ۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی حالانکہ ان سے پہلے جو لوگ تھے ہم نے ان کی آزمائش کی؛ لہٰذا (ان کے بارے میں بھی) اللہ یہ ضرور معلوم کرے گا کہ کن لوگوں نے سچ کہا اور یہ بھی ضرور معلوم کرے گا کہ کون لوگ جھوٹے ہیں۔"

اور انہی کے پہلو بہ پہلو ایسی آیات کا نزول بھی ہو رہا تھا جن میں کفار و معاندین کے اعتراضات کے دندان شکن جواب دیے گئے تھے۔ ان کے لیے کوئی حیلہ باقی نہیں چھوڑا گیا تھا اور انہیں

بڑے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بتلا دیا گیا تھا کہ اگر وہ اپنی گمراہی اور عناد پر مُصر رہے تو اس کے نتائج کس قدر سنگین ہوں گے۔ اس کی دلیل میں گذشتہ قوموں کے ایسے واقعات اور تاریخی شواہد پیش کئے گئے تھے جن سے واضح ہوتا تھا کہ اللہ کی سنّت اپنے اولیاء اور اعداء کے بارے میں کیا ہے۔ پھر اس ڈراوے کے پہلو بہ پہلو لطف و کرم کی باتیں بھی کہی جا رہی تھیں اور افہام و تفہیم اور ارشاد و رہنمائی کا حق بھی ادا کیا جا رہا تھا تاکہ باز آنے والے اپنی کھلی گمراہی سے باز آ سکیں۔

درحقیقت قرآن مسلمانوں کو ایک دوسری ہی دنیا کی سیر کراتا تھا اور انہیں کائنات کے مشاہد، ربوبیت کے جمال، الوہیت کے کمال، رحمت و رافت کے آثار اور لطف و رضا کے ایسے ایسے جلوے دکھاتا تھا کہ ان کے جذب و شوق کے آگے کوئی رکاوٹ برقرار ہی نہ رہ سکتی تھی۔

پھر انہیں آیات کی تہ میں مسلمانوں سے ایسے ایسے خطاب بھی ہوتے تھے جن میں پروردگار کی طرف سے رحمت و رضوان اور دائمی نعمتوں سے بھری ہوئی جنت کی بشارت ہوتی تھی اور ظالم و سرکش دشمنوں اور کافروں کے ان حالات کی تصویر کشی ہوتی تھی کہ وہ رب العالمین کی عدالت میں فیصلے کے لیے کھڑے کئے جائیں گے۔ ان کی بھلائیاں اور نیکیاں ضبط کر لی جائیں گی اور انہیں چہروں کے بل گھسیٹ کر یہ کہتے ہوئے جہنم میں پھینک دیا جائے گا کہ لو جہنم کا لطف اٹھاؤ۔

۶۔ **کامیابی کی بشارتیں** ۔ ان ساری باتوں کے علاوہ مسلمانوں کو اپنی مظلومیت کے پہلے ہی دن سے ـــ بلکہ اس کے بھی پہلے سے ـــ معلوم تھا کہ اسلام قبول کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دائمی مصائب اور ہلاکت خیزیاں مول لے لی گئیں بلکہ اسلامی دعوت روزِ اوّل سے جاہلیتِ جہلاء اور اس کے ظالمانہ نظام کے خاتمے کے عزائم رکھتی ہے اور اس دعوت کا ایک اہم نشانہ یہ بھی ہے کہ وہ روئے زمین پر اپنا اثر و نفوذ پھیلائے اور دنیا کے سیاسی موقف پر اس طرح غالب آجائے کہ انسانی جمعیت اور اقوامِ عالم کو اللہ کی مرضی کی طرف لے جا سکے۔ اور انہیں بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کر سکے۔

قرآن مجید میں یہ بشارتیں ـــ کبھی اشارۃً اور کبھی صراحۃً ـ نازل ہوتی تھیں (چنانچہ ایک

طرف حالات یہ تھے کہ مسلمانوں پر پوری روئے زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ بنی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اب وہ پنپ نہ سکیں گے بلکہ ان کا مکمل صفایا کر دیا جائے گا مگر دوسری طرف ان ہی حوصلہ شکن حالات میں ایسی آیات کا نزول بھی ہوتا رہتا تھا جن میں پچھلے انبیاء کے واقعات اور ان کی قوم کی تکذیب و کفر کی تفصیلات مذکور ہوتی تھیں اور ان آیات میں ان کا جو نقشہ کھینچا جاتا تھا وہ بعینہٖ وہی ہوتا تھا جو مکے کے مسلمانوں اور کافروں کے مابین درپیش تھا۔ اس کے بعد یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ ان حالات کے نتیجے میں کس طرح کافروں اور ظالموں کو ہلاک کیا گیا اور اللہ کے نیک بندوں کو روئے زمین کا وارث بنایا گیا۔ اس طرح ان آیات میں واضح اشارہ ہوتا تھا کہ آگے چل کر اہل مکہ ناکام و نامراد رہیں گے اور مسلمان اور ان کی اسلامی دعوت کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ پھر ان ہی حالات و ایام میں بعض ایسی بھی آیتیں نازل ہو جاتی تھیں جن میں صراحت کے ساتھ اہل ایمان کے غلبے کی بشارت موجود ہوتی تھی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ○ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ○ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ○ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ○ وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ○ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ○ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ○ (۳۷: ۱۷۱-۱۷۷)

"اپنے فرستادہ بندوں کے لیے ہمارا پہلے ہی یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی اور یقیناً ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا، پس (اے نبی ﷺ) ایک وقت تک کے لیے تم ان سے رُخ پھیر لو اور انہیں دیکھتے رہو عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں تو جب وہ ان کے صحن میں اتر پڑے گا تو ڈرائے گئے لوگوں کی صبح بُری ہو جائے گی۔"

نیز ارشاد ہے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ○ (۵۴: ۴۵)

"عنقریب اس جمعیت کو شکست دے دی جائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔"

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ○ (۳۸: ۱۱)

"یہ جتھوں میں سے ایک معمولی سا جتھہ ہے جسے یہیں شکست دی جائے گی۔"

مہاجرینِ حبشہ کے بارے میں ارشاد ہوا۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○ (۱۶: ۴۱)

"جن لوگوں نے مظلومیت کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہم انہیں یقیناً دنیا میں بہترین ٹھکانہ عطا کریں گے۔ اور آخرت کا اجر بہت ہی بڑا ہے اگر لوگ جانیں۔"

اسی طرح کفار نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ پوچھا تو جواب میں ضمناً یہ آیت بھی نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ○ (۱۲ : ۷)

"یوسف اور ان کے بھائیوں (کے واقعے) میں پوچھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔"

یعنی اہلِ مکہ جو آج حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ پوچھ رہے ہیں یہ خود بھی اسی طرح ناکام ہوں گے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ناکام ہوئے تھے اور ان کی سپر اندازی کا وہی حال ہوگا جو ان کے بھائیوں کا ہوا تھا۔ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے واقعے سے عبرت پکڑنی چاہیئے کہ ظالم کا حشر کیا ہوتا ہے۔ ایک جگہ پیغمبروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ○ (۱۴ : ۱۳/۱۴)

"کفار نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تمہیں اپنی زمین سے ضرور نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ۔ اس پر ان کے رب نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو یقیناً ہلاک کر دیں گے۔ یہ (وعدہ) ہے اس شخص کے لیے جو میرے پاس کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے۔"

اسی طرح جس وقت فارس و روم میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور کفار چاہتے تھے کہ فارسی غالب آجائیں کیونکہ فارسی مشرک تھے اور مسلمان چاہتے تھے کہ رومی غالب آجائیں، کیونکہ رومی بہرحال اللہ پر، پیغمبروں پر، وحی پر، آسمانی کتابوں پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے کے دعویدار تھے۔ لیکن غلبہ فارسیوں کو حاصل ہوتا جا رہا تھا تو اس وقت اللہ نے یہ خوشخبری نازل فرمائی کہ چند برس بعد رومی غالب آجائیں گے، لیکن اسی ایک بشارت پر اکتفا نہ کی بلکہ اس ضمن میں یہ بشارت بھی نازل فرمائی کہ رومیوں کے غلبے کے وقت اللہ تعالیٰ مومنین کی بھی خاص مدد فرمائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے؛ چنانچہ ارشاد ہے:

..وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ○ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۔ (۳۰: ۴/۵)

"یعنی اس دن اہلِ ایمان بھی اللہ کی (ایک خاص) مدد سے خوش ہو جائیں گے۔"

(اور آگے چل کر اللہ کی یہ مدد جنگِ بدر کے اندر حاصل ہونے والی عظیم کامیابی اور فتح کی شکل میں نازل ہوئی۔)

قرآن کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ بھی مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً اس طرح کی خوشخبری سنایا کرتے تھے؛ چنانچہ موسم حج میں آپ عکاظ، مجنہ اور ذو المجاز کے بازاروں میں لوگوں کے اندر تبلیغِ رسالت کے لیے تشریف لے جاتے تو صرف جنت ہی کی بشارت نہیں دیتے تھے بلکہ دو ٹوک لفظوں میں اس کا بھی اعلان فرماتے تھے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا وَتَمْلِكُوا بِهَا الْعَرَبَ وَتَدِينُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ فَإِذَا مُتُّمْ كُنْتُمْ مُلُوكًا فِي الْجَنَّةِ۔ [۱]

"لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو، کامیاب رہو گے؛ اور اس کی بدولت عرب کے بادشاہ بن جاؤ گے اور اس کی وجہ سے عجم بھی تمہارے زیرِ نگیں آجائے گا پھر جب تم وفات پاؤ گے تو جنت کے اندر بادشاہ رہو گے۔"

یہ واقعہ پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے کہ جب عُتبہ بن ربیعہ نے آپ ﷺ کو متاعِ دنیا کی پیشکش کر کے سودے بازی کرنی چاہی اور آپ ﷺ نے جواب میں حٰم تنزیل السجدہ کی آیات پڑھ کر سنائیں تو عتبہ کو یہ توقع بندھ گئی کہ انجام کار آپؐ غالب رہیں گے۔

اسی طرح ابوطالب کے پاس آنے والے قریش کے آخری وفد سے آپ ﷺ کی جو گفتگو ہوئی تھی اس کی بھی تفصیلات گذر چکی ہیں۔ اس موقعے پر بھی آپ ﷺ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا تھا کہ آپ ﷺ ان سے صرف ایک بات چاہتے ہیں جسے وہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان بن جائے اور عجم پر ان کی بادشاہت قائم ہو جائے۔

حضرت خَبّاب بن اَرَت کا ارشاد ہے کہ ایک بار میں خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا۔ آپؐ کعبہ کے سائے میں ایک چادر کو تکیہ بنائے تشریف فرما تھے۔ اس وقت ہم مشرکین کے ہاتھوں سختی سے دوچار تھے۔ میں نے کہا: "کیوں نہ آپ ﷺ اللہ سے دعا فرمائیں۔" یہ سن کر آپ ﷺ اُٹھ بیٹھے، آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: "جو لوگ تم سے پہلے تھے، ان کی ہڈیوں تک گوشت اور اعصاب میں لوہے

---

[۱] ترمذی

کی کنگھیاں کر دی جاتی تھیں لیکن یہ سختی بھی انہیں دین سے باز نہ رکھتی تھی"۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ اس امر کو یعنی دین کو مکمل کر کے رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضرموت تک جائیگا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ البتہ بکری پر بھیڑیے کا خوف ہوگا"[۷]

ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ ـــــ لیکن تم لوگ جلدی کر رہے ہو[۸] یاد رہے کہ یہ بشارتیں کچھ ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ بلکہ معروف و مشہور تھیں اور مسلمانوں ہی کی طرح کفار بھی ان سے واقف تھے، چنانچہ جب اَسْوَد بن مُطّلِب اور اس کے رفقاء صحابہ کرام کو دیکھتے تو طعنہ زنی کرتے ہوئے آپس میں کہتے کہ لیجئے آپ کے پاس رُوئے زمین کے بادشاہ آگئے ہیں۔ یہ جلد ہی شاہانِ قیصر و کسریٰ کو مغلوب کر لیں گے۔ اس کے بعد وہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے۔[۹]

بہر حال صحابۂ کرام کے خلاف اس وقت ظلم و ستم اور مصائب و آلام کا جو ہمہ گیر طوفان برپا تھا اس کی حیثیت حصولِ جنت کی ان یقینی امیدوں اور تابناک و پُر وقار مستقبل کی ان بشارتوں کے مقابل اس بادل سے زیادہ نہ تھی جو ہوا کے ایک ہی جھٹکے سے بکھر کر تحلیل ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ اہلِ ایمان کو ایمانی مرغوبات کے ذریعے مسلسل روحانی غذا فراہم کر رہے تھے۔ تعلیم کتاب و حکمت کے ذریعے ان کے نفوس کا تزکیہ فرما رہے تھے۔ نہایت دقیق اور گہری تربیت دے رہے تھے اور رُوح کی بلندی، قلب کی صفائی، اخلاق کی پاکیزگی مادّیات کے غلبے سے آزادی، شہوات کی مُقاوَمت اور رب السموات والارض کی کشش کے مقامات کی جانب ان کے نفوسِ قدسیہ کی حدی خوانی فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ ان کے دلوں کی بجھتی ہوئی چنگاری کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل کر دیتے تھے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر نورزارِ ہدایت میں پہنچا رہے تھے۔ انہیں اذیتوں پر صبر کی تلقین فرماتے تھے اور شریفانہ درگذر اور ضبطِ نفس کی ہدایت دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی دینی پختگی فزوں تر ہوتی گئی۔ اور وہ شہوات سے کنارہ کشی، رضائے الٰہی کی راہ میں جاں سپاری، جنت کے شوق، علم کی حرص، دین کی سمجھ، نفس کے محاسبے، جذبات کو دبانے، رجحانات کو موڑنے، ہیجانات کی لہروں پر قابو پانے اور صبر و سکون اور عزّ و وقار کی پابندی کرنے میں انسانیت کا نادرۂ روزگار نمونہ بن گئے۔

---

[۷] صحیح بخاری ۱/۵۴۳ [۸] صحیح بخاری ۱/۵۱۰ [۹] فقہ السیرہ ص ۸۴

تیسرا مرحلہ :

بیرونِ مکّہ دعوتِ اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں

شوال ۱۰ سنہ نبوت (آواخر مئی یا اوائل جون ۶۱۹ء) میں نبی ﷺ طائف تشریف لے گئے۔ یہ مکے سے تقریباً ساٹھ میل دُور ہے۔ آپ ﷺ نے یہ مسافت آتے جاتے پیدل طے فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کے ہمراہ آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زَیْد بن حارثہ تھے۔ راستے میں جس قبیلے سے گذر ہوتا اسے اسلام کی دعوت دیتے لیکن کسی نے بھی یہ دعوت قبول نہ کی۔ جب طائف پہنچے تو قبیلہ ثَقِیف کے تین سرداروں کے پاس تشریف لے گئے جو آپس میں بھائی تھے اور جن کے نام یہ تھے: عَبْدِ یَالِیل، مسعود اور حبیب ان تینوں کے والد کا نام عَمْرو بن عُمَیر ثَقَفی تھا۔ آپ ﷺ نے ان کے پاس بیٹھنے کے بعد انہیں اللہ کی اطاعت اور اسلام کی مدد کی دعوت دی۔ جواب میں ایک نے کہا کہ وہ کعبے کا پردہ پھاڑے اگر اللہ نے تمہیں رسول بنایا ہو۔[۲] دوسرے نے کہا: "کیا اللہ کو تمہارے علاوہ کوئی اور نہ ملا؟" تیسرے نے کہا: "میں تم سے ہرگز بات نہ کروں گا۔ اگر تم واقعی پیغمبر ہو تو تمہاری بات رد کرنا میرے لیے انتہائی خطرناک ہے اور اگر تم نے اللہ پر جھوٹ گھڑ رکھا ہے تو پھر مجھے تم سے بات کرنی ہی نہیں چاہیئے۔" یہ جواب سُن کر آپ ﷺ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور صرف اتنا فرمایا: "تم لوگوں نے جو کچھ کیا کیا، بہرحال اسے پسِ پردہ ہی رکھنا۔"

رسول اللہ ﷺ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔ اس دوران آپ ﷺ ان کے ایک ایک سردار کے پاس تشریف لے گئے اور ہر ایک سے گفتگو کی لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا کہ تم ہمارے شہر سے نکل جاؤ۔ بلکہ انہوں نے اپنے اوباشوں کو شہ دے دی۔

---

[۱] مولانا نجیب آبادی نے تاریخ اسلام (۱/۱۲۲) میں اس کی صراحت کی ہے اور یہی میرے نزدیک بھی راجح ہے۔

[۲] یہ اردو کے اس محاورے سے ملتا جلتا ہے کہ "اگر تم پیغمبر ہو تو اللہ مجھے غارت کرے۔" مقصود اس یقین کا اظہار ہے کہ تمہارا پیغمبر ہونا ناممکن ہے جیسے کعبے کے پردے پر دست درازی کرنا ناممکن ہے۔

چنانچہ جب آپ ﷺ نے واپسی کا قصد فرمایا تو یہ اوباش گالیاں دیتے، تالیاں پیٹتے اور شور مچاتے آپ ﷺ کے پیچھے لگ گئے، اور دیکھتے دیکھتے اتنی بھیڑ جمع ہو گئی کہ آپ ﷺ کے راستے کے دونوں جانب لائن لگ گئی۔ پھر گالیوں اور بدزبانیوں کے ساتھ ساتھ پتھر بھی چلنے لگے جس سے آپ ﷺ کی ایڑی پر اتنے زخم آئے کہ دونوں جوتے خون میں تربتر ہو گئے۔ ادھر حضرت زیدؓ بن حارثہ ڈھال بن کر چلتے ہوئے پتھروں کو روک رہے تھے جس سے ان کے سر میں کئی جگہ چوٹ آئی۔ بدمعاشوں نے یہ سلسلہ برابر جاری رکھا یہاں تک کہ آپ کو عُتبہ اور شیبہ ابنائے ربیعہ کے ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ باغ طائف سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جب آپ ﷺ نے یہاں پناہ لی تو بھیڑ واپس چلی گئی اور آپ ﷺ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ قدرے اطمینان ہوا تو دعا فرمائی جو دعائے مستضعفین کے نام سے مشہور ہے۔ اُس دُعا کے ایک ایک فقرے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ طائف میں اس بدسلوکی سے دوچار ہونے کے بعد اور کسی ایک بھی شخص کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ ﷺ کس قدر دل فگار تھے اور آپ ﷺ کے احساسات پر حزن والم اور غم و افسوس کا کس قدر غلبہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اللهم اليك اشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس يا ارحم الراحمين، انت رب المستضعفين وانت ربي، الى من تكلني؟ الى بعيد يتجهمني ام الى عدو ملكته امري؟ ان لم يكن بك علي غضب فلا ابالي، ولكن عافيتك هي اوسع لي، اعوذ بنور وجهك الذي اشرقت له الظلمات وصلح عليه امر الدنيا والاخرة من ان تنزل بي غضبك او يحل علي سخطك لك العتبى حتى ترضى، ولاحول ولا قوة الا بك.

"بارالہا! میں تجھ ہی سے اپنی کمزوری و بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ یا ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تُو ہی میرا بھی رب ہے۔ تُو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو میرے ساتھ تندی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے جس کو تُو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں، لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ کشادہ ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہو گئیں اور جس پر دنیا و آخرت کے معاملات درست

ہوئے کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے، یا تیرا عتاب مجھ پر وارد ہو۔ تیری ہی رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔"

ادھر آپ ﷺ کو ابنائے ربیعہ نے اس حالتِ زار میں دیکھا تو ان کے جذبۂ قرابت میں حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے ایک عیسائی غلام کو جس کا نام عداس تھا بلا کر کہا کہ اس انگور سے ایک گچھا لو۔ اور اس شخص کو دے آؤ۔ جب اس نے انگور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے بسم اللہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کیا۔

عداس نے کہا "یہ جملہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں بولتے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟" اس نے کہا میں عیسائی ہوں اور نینویٰ کا باشندہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اچھا! تم مردِ صالح یونس بن متی کی بستی کے رہنے والے ہو؟" اُس نے کہا، "آپ ﷺ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ میرے بھائی تھے۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔" یہ سُن کر عداس رسول اللہ ﷺ پر جھک پڑا اور آپ ﷺ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔

یہ دیکھ کر ربیعہ کے دونوں بیٹوں نے آپس میں کہا لو: اب اس شخص نے ہمارے غلام کو بگاڑ دیا۔ اس کے بعد جب عداس واپس گیا تو دونوں نے اس سے کہا: "اجی! یہ کیا معاملہ تھا؟" اُس نے کہا "میرے آقا! روئے زمین پر اس شخص سے بہتر کوئی اور نہیں۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" ان دونوں نے کہا "دیکھو عداس کہیں یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے پھیر نہ دے۔ کیونکہ تمہارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔"

قدرے ٹھہر کر رسول اللہ ﷺ باغ سے نکلے تو مکے کی راہ پر چل پڑے۔ غم و الم کی شدت سے طبیعت نڈھال اور دل پاش پاش تھا۔ قرن منازل پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ بھی تھا۔ وہ آپ ﷺ سے یہ گذارش کرنے آیا تھا کہ آپ ﷺ حکم دیں تو وہ اہلِ مکہ کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالے۔

اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک روز رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ﷺ پر کوئی ایسا دن بھی آیا ہے جو اُحد کے دن سے زیادہ سنگین رہا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں!

تمہاری قوم سے مجھے جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے سنگین مصیبت وہ تھی جس سے میں گھاٹی کے دن دوچار ہوا، جب میں نے اپنے آپ کو عبدِ یالیل بن عبدِ کلال کے صاحبزادے پر پیش کیا مگر اس نے میری بات منظور نہ کی تو میں غم و الم سے نڈھال اپنے رُخ پر چل پڑا اور مجھے قرن ثعالب پہنچ کر ہی افاقہ ہوا۔ وہاں میں نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہے۔ میں نے بغور دیکھا تو اس میں حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا: آپ ﷺ کی قوم نے آپ سے جو بات کہی اللہ نے اُسے سُن لیا ہے۔ اب اس نے آپ ﷺ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تاکہ آپ ﷺ ان کے بارے میں اسے جو حکم چاہیں دیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی اور سلام کرنے کے بعد کہا: اے محمد (ﷺ)! بات یہی ہے۔ اب آپ (ﷺ) جو چاہیں ..... اگر چاہیں کہ میں انہیں دو پہاڑوں[1] کے درمیان کچل دوں ـــــ تو ایسا ہی ہوگا ـــــ نبی ﷺ نے فرمایا (نہیں) بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ عزّوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی۔[2]

رسول اللہ ﷺ کے اس جواب میں آپ کی یگانہ روزگار شخصیت اور ناقابلِ ادراک گہرائی رکھنے والے اخلاقِ عظیمہ کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہرحال اب سات آسمانوں کے اوپر سے آنے والی اس غیبی مدد کی وجہ سے آپ ﷺ کا دل مطمئن ہوگیا اور غم و الم کے بادل چھٹ گئے چنانچہ آپ ﷺ نے مکّے کی راہ پر مزید پیش قدمی فرمائی اور وادیٔ نخلہ میں جا فروکش ہوئے۔ یہاں دو جگہیں قیام کے لائق ہیں۔ ایک السیل الکبیر اور دوسرے زیمہ کیونکہ دونوں ہی جگہ پانی اور شادابی موجود ہے لیکن کسی ماخذ سے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آپ ﷺ نے ان میں سے کس جگہ قیام فرمایا تھا۔

وادیٔ نخلہ میں آپ ﷺ کا قیام چند دن رہا۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے پاس جنّوں کی ایک جماعت بھیجی جس کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک

---

[1] اس موقع پر صحیح بخاری میں لفظ اخشبین استعمال کیا گیا ہے جو مکّہ کے دو مشہور پہاڑوں ابو قبیس اور قعیقعان پر بولا جاتا ہے۔ یہ دونوں پہاڑ علی الترتیب حرم کے جنوب و شمال میں آمنے سامنے واقع ہیں۔ اُس وقت مکّے کی عام آبادی ان ہی دو پہاڑوں کے بیچ میں تھی۔

[2] صحیح بخاری کتاب بدء الخلق ۱/۴۵۸ مسلم باب ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین ۲/۱۰۹

سورۃ الاحقاف میں، دوسرے سورۂ جن میں، سورۃ الاحقاف کی آیات یہ ہیں:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○
(۴۶: ۲۹-۳۱)

"اور جب کہ ہم نے آپؐ کی طرف جنوں کے ایک گروہ کو پھیرا کہ وہ قرآن سنیں تو جب وہ (تلاوت) قرآن کی جگہ پہنچے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ چپ ہو جاؤ؛ پھر جب اس کی تلاوت پوری کی جا چکی تو وہ اپنی قوم کی طرف عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے بن کر چلے۔ انہوں نے کہا: اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے۔ اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والی ہے حق اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات مان لو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچائے گا۔"

سورۂ جن کی آیات یہ ہیں:۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ○ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ○ (۷۲: ۱/۲)

"آپ کہہ دیں: میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا، اور باہم کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہیں کر سکتے۔" (پندرھویں آیت تک)

یہ آیات جو اس واقعے کے بیان کے سلسلے میں نازل ہوئیں ان کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو ابتداءً جنوں کی اس جماعت کی آمد کا علم نہ ہو سکا تھا بلکہ جب ان آیات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تب آپؐ واقف ہو سکے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی یہ آمد پہلی بار ہوئی تھی اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد ان کی آمد و رفت ہوتی رہی۔

جنوں کی آمد اور قبولِ اسلام کا واقعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوسری مدد تھی جو اس نے اپنے غیبِ مکنون کے خزانے سے اپنے اس لشکر کے ذریعے فرمائی تھی جس کا

علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں پھر اس واقعے کے تعلق سے جو آیات نازل ہوئیں ان کے بیچ میں نبی ﷺ کی دعوت کی کامیابی کی بشارتیں بھی ہیں اور اس بات کی وضاحت بھی کہ کائنات کی کوئی بھی طاقت اس دعوت کی کامیابی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (۴۶:۳۲)

"جو اللہ کے داعی کی دعوت قبول نہ کرے وہ زمین میں (اللہ کو) بے بس نہیں کر سکتا، اور اللہ کے سوا اس کا کوئی کارساز ہے بھی نہیں اور ایسے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔"

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ○ (۷۲:۱۲)

"ہماری سمجھ میں آگیا ہے کہ ہم اللہ کو زمین میں بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہم بھاگ کر ہی اسے (پکڑنے سے) عاجز کر سکتے ہیں۔"

اس نصرت اور ان بشارتوں کے سامنے غم و الم اور حزن و مایوسی کے وہ سارے بادل چھٹ گئے جو طائف سے نکلتے وقت گالیاں اور تالیاں سننے اور پتھر کھانے کی وجہ سے آپ ﷺ پر چھائے تھے۔ آپ ﷺ نے عزم مصمم فرمالیا کہ اب مکہ پلٹنا ہے اور نئے سرے سے دعوتِ اسلام اور تبلیغِ رسالت کے کام میں چستی اور گرمجوشی کے ساتھ لگ جانا ہے۔ یہی موقع تھا جب حضرت زید بن حارثہ نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ آپ مکہ کیسے جائیں گے جبکہ وہاں کے باشندوں یعنی قریش نے آپ ﷺ کو نکال دیا ہے؟ اور جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: "اے زید! تم جو حالت دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے کشادگی اور نجات کی کوئی راہ ضرور بنائے گا۔ اللہ یقیناً اپنے دین کی مدد کرے گا۔ اور اپنے نبی کو غالب فرمائے گا۔"

آخر رسول اللہ ﷺ وہاں سے روانہ ہوئے اور مکے کے قریب پہنچ کر کوہِ حرا کے دامن میں ٹھہر گئے۔ پھر خزاعہ کے ایک آدمی کے ذریعے اخنس بن شریق کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کو پناہ دے دے مگر اخنس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں حلیف ہوں اور حلیف پناہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے سہیل بن عمرو کے پاس یہی پیغام بھیجا مگر اس نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ بنی عامر کی دی ہوئی پناہ بنو کعب پر لاگو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا۔ مطعم نے کہا: ہاں اور پھر ہتھیار پہن کر اپنے

بیٹوں اور قوم کے لوگوں کو بلایا اور کہا تم لوگ ہتھیار باندھ کر خانہ کعبہ کے گوشوں پر جمع ہو جاؤ کیونکہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دے دی ہے۔ اس کے بعد مطعم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ مکّے کے اندر آجائیں۔ آپ ﷺ پیغام پانے کے بعد حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ہمراہ لے کر مکّہ تشریف لائے، اور مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد مُطعِم بن عدی نے اپنی سواری پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ قریش کے لوگو! میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دے دی ہے۔ اب اُسے کوئی نہ چھیڑے۔ ادھر رسول اللہ ﷺ سیدھے حجرِ اسود کے پاس پہنچے اسے چُوما۔ پھر دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے گھر کو پلٹ آئے۔ اس دوران مطعم بن عدی اور ان کے لڑکوں نے ہتھیار بند ہو کر آپ ﷺ کے اردگرد حلقہ باندھے رکھا تا آنکہ آپ ﷺ اپنے مکان کے اندر تشریف لے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر ابوجہل نے مطعم سے پوچھا تھا کہ تم نے پناہ دی ہے یا پیروکار مسلمان بن گئے ہو؟ اور مطعم نے جواب دیا تھا کہ پناہ دی ہے اور اس جواب کو سن کر ابوجہل نے کہا تھا کہ جسے تم نے پناہ دی اسے ہم نے بھی پناہ دی [۶]

رسول اللہ ﷺ نے مطعم بن عدی کے اس حُسنِ سلوک کو کبھی فراموش نہ فرمایا۔ چنانچہ بدر میں جب کُفّارِ مکّہ کی ایک بڑی تعداد قید ہو کر آئی۔ اور بعض قیدیوں کی رہائی کے لیے حضرت جُبیرؓ بن مُطعِم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

لوکان المطعم بن عدی حیا ثم کلمنی فی ھٰؤلاء النتنی لترکتھم له [۷]

"اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا، پھر مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا تو میں اس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔"

○

---

[۶] سفرِ طائف کے واقعے کی یہ تفصیلات ابنِ ہشام ۱/۴۱۹ تا ۴۲۲۔ زاد المعاد ۲/۴۶، ۴۷، مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ ص ۱۴۱ تا ۱۴۳، رحمۃ للعالمین ۱/۷۱ تا ۷۴، تاریخ اسلام نجیب آبادی ۱/۱۲۳، ۱۲۴۔ اور معروف و معتبر کتب تفاسیر سے جمع کی گئی ہیں۔

[۷] صحیح بخاری ۲/۵۷۳

قبائل اور افراد کو اسلام کی دعوت

ذی قعدہ سنہ ۱۰ نبوت (اواخر جون یا اوائل جولائی سنہ ۶۱۹ء) میں رسول اللہ ﷺ طائف سے مکہ تشریف لائے، اور یہاں افراد اور قبائل کو پھر سے اسلام کی دعوت دینی شروع کی۔ چونکہ موسم حج قریب تھا اس لیے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے دُور و نزدیک ہر جگہ سے پیدل اور سواروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقعے کو غنیمت سمجھا۔ اور ایک ایک قبیلے کے پاس جا کر اسے اسلام کی دعوت دی جیسا کہ نبوت کے چوتھے سال سے آپ ﷺ کا معمول تھا۔

وہ قبائل جنہیں اسلام کی دعوت دی گئی

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ جن قبائل کے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو ان پر پیش کیا ان میں سے حسب ذیل قبیلوں کے نام ہمیں بتائے گئے ہیں۔

بنو عامر بن صعصعہ، محارب بن خصفہ، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سُلیم، عبس، بنو نصر بنو البکاء، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسلام قبول نہ کیا۔ [1]

واضح رہے کہ امام زہری کے ذکر کردہ ان سارے قبائل پر ایک ہی سال یا ایک ہی موسم حج میں اسلام پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ نبوت کے چوتھے سال سے ہجرت سے پہلے کے آخری موسم حج تک دس سالہ مدت کے دوران پیش کیا گیا تھا۔ [2]

ابن اسحاق نے بعض قبائل پر اسلام کی پیشی اور ان کے جواب کی کیفیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ذیل میں مختصراً ان کا بیان نقل کیا جا رہا ہے:

۱۔ **بنو کلب** ۔ نبی ﷺ اس قبیلے کی ایک شاخ بنو عبداللہ کے پاس تشریف لے

---

[1] ترمذی، مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ ص ۱۴۹ [2] دیکھیے رحمۃ للعالمین ۱/۷۴

گئے۔ انہیں اللہ کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان پر پیش کیا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی فرمایا کہ اے بنو عبداللہ! اللہ نے تمہارے جدِّ اعلیٰ کا نام بہت اچھا رکھا تھا، لیکن اس قبیلے نے آپ کی دعوت قبول نہ کی۔

۲۔ **بنو حنیفہ** ۔ آپ ﷺ ان کے ڈیرے پر تشریف لے گئے۔ انہیں اللہ کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان پر پیش کیا، لیکن ان جیسا برا جواب اہلِ عرب میں سے کسی نے بھی نہ دیا۔

۳۔ **عامر بن صَعْصَعَہ** ۔ انہیں بھی آپ ﷺ نے اللہ کی طرف دعوت دی اور اپنے آپ کو ان پر پیش کیا۔ جواب میں ان کے ایک آدمی، بُحَیْرَہ بن فراس نے کہا: "خدا کی قسم اگر میں قریش کے اس جوان کو لے لوں تو اس کے ذریعے پورے عرب کو کھا جاؤں گا۔" پھر اس نے دریافت کیا کہ اچھا یہ بتایئے: "اگر ہم آپ ﷺ سے آپ کے اس دین پر بیعت کرلیں پھر اللہ آپ کو مخالفین پر غلبہ عطا فرمائے تو کیا آپ کے بعد زمام کار ہمارے ہاتھ میں ہوگی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "زمام کار تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جہاں چاہے گا رکھے گا۔ اس پر اس شخص نے کہا: خوب! آپ ﷺ کی حفاظت میں تو ہمارا سینہ اہلِ عرب کے نشانے پر رہے، لیکن جب اللہ آپ ﷺ کو غلبہ عطا فرمائے تو زمام کار کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ ہمیں آپ ﷺ کے دین کی ضرورت نہیں۔" غرض انہوں نے انکار کر دیا۔

اس کے بعد جب قبیلہ بنو عامر اپنے علاقے میں واپس گیا تو اپنے ایک بوڑھے آدمی کو ——— جو کبرسنی کے باعث حج میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ سارا ماجرا سنایا اور بتایا کہ ہمارے پاس قبیلہ قریش کے خاندان بنو عبد المطّلب کا ایک جوان آیا تھا جس کا خیال تھا کہ وہ نبی ہے۔ اس نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اس کی حفاظت کریں، اس کا ساتھ دیں اور اپنے علاقے میں لے آئیں۔ یہ سُن کر اس بڈھے نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور بولا: "اے بنو عامر! کیا اب اس کی تلافی کی کوئی سبیل ہے؟ اور کیا اس از دست رفتہ کو ڈھونڈھا جا سکتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں فلاں کی جان ہے۔ کسی اسماعیل نے کبھی اس (نبوّت) کا جھوٹا دعویٰ نہیں کیا۔

یقیناً حق ہے۔ آخر تمہاری عقل کہاں چلی گئی تھی؟"[۳]

ایمان کی شعاعیں مکّے سے باہر

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے قبائل اور وفود پر اسلام پیش کیا، اسی طرح افراد اور اشخاص کو بھی اسلام کی دعوت دی اور بعض نے اچھا جواب بھی دیا۔ پھر اس موسم حج کے کچھ ہی عرصے بعد کئی افراد نے اسلام قبول کیا۔ ذیل میں ان کی ایک مختصر رُوداد پیش کی جارہی ہے۔

۱۔ **سُوَیْدؓ بن صَامت** ۔ یہ شاعر تھے۔ گہری سوجھ بوجھ کے حامل اور یثرب کے باشندے۔ ان کی پختگی، شعر گوئی اور شرف و نسب کی وجہ سے ان کی قوم نے انہیں کامل کا خطاب دے رکھا تھا۔ یہ حج یا عمرہ کے لیے مکّہ تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ کہنے لگے: "غالباً آپؐ کے پاس جو کچھ ہے وہ ویسا ہی ہے جیسا میرے پاس ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے پاس کیا ہے؟" سُوَیْدؓ نے کہا: "حکمتِ لقمان"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "پیش کرو۔" انہوں نے پیش کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کلام یقیناً اچھا ہے۔ لیکن میرے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے بھی اچھا ہے، وہ قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے۔ وہ ہدایت اور نور ہے۔" اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انہیں قرآن پڑھ کر سنایا۔ اور اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اور بولے: "یہ تو بہت ہی اچھا کلام ہے۔" اس کے بعد وہ مدینہ پلٹ کر آئے ہی تھے کہ جنگ بُعاث چھڑ گئی اور اسی میں قتل کردیے گئے۔[۴] انہوں نے سنہ نبوی کے آغاز میں اسلام قبول کیا تھا۔[۵]

۲۔ **اِیَاس بن معاذ** ۔ یہ بھی یثرب کے باشندے تھے اور نوخیز جوان۔ سنہ نبوت میں جنگ بُعاث سے کچھ پہلے اَوس کا ایک وفد خَزرَج کے خلاف قریش سے حلف و تعاون کی تلاش میں مکّہ آیا تھا۔ آپ بھی اسی کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ اس وقت یثرب میں ان دونوں قبیلوں کے درمیان عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی اور اَوس کی تعداد خَزرَج سے کم تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو وفد کی آمد کا علم ہُوا تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور اُن کے درمیان بیٹھ کر یوں خطاب فرمایا: "آپ لوگ جس مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں کیا اس

---

[۳] ابن ہشام ۱/۴۲۴، ۴۲۵ [۴] ابن ہشام ۱/۴۲۵-۴۲۷۔ رحمۃ للعالمین ۱/۷۴

[۵] تاریخ اسلام اکبر شاہ نجیب آبادی ۱/۱۲۵

سے بہتر چیز قبول کر سکتے ہیں؟" ان سب نے کہا وہ کیا چیز ہے ؟ آپ ﷺ نے فرمایا "میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ نے مجھے اپنے بندوں کے پاس اس بات کی دعوت دینے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔ اللہ نے مجھ پر کتاب بھی اتاری ہے۔" پھر آپ ﷺ نے اسلام کا ذکر کیا۔ اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔

ایاس بن معاذ بولے: اے قوم یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لیے آپ لوگ یہاں تشریف لائے ہیں۔ لیکن وفد کے ایک رکن ابوالحیسر انس بن رافع نے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر ایاس کے منہ پر دے ماری اور بولا "یہ بات چھوڑو! میری عمر کی قسم! یہاں ہم اس کے بجائے دوسرے ہی مقصد سے آئے ہیں۔" ایاس نے خاموشی اختیار کر لی اور رسول اللہ ﷺ بھی اٹھ گئے۔ وفد قریش کے ساتھ حلف و تعاون کا معاہدہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور یوں ہی ناکام مدینہ واپس ہو گیا۔

مدینہ پلٹنے کے تھوڑے ہی دن بعد ایاس انتقال کر گئے۔ وہ اپنی وفات کے وقت تہلیل و تکبیر اور حمد و تسبیح کر رہے تھے اس لیے لوگوں کو یقین ہے کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی۔[۶]

۳۔ **ابوذر غفاریؓ** ۔ یہ یثرب کے اطراف میں سکونت پذیر تھے۔ جب سُوَید بن صامت اور ایاس بن معاذ کے ذریعے یثرب میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر پہنچی تو یہ خبر ابوذر رضی اللہ عنہ کے کان سے بھی ٹکرائی اور یہی ان کے اسلام لانے کا سبب بنی۔[۷]

ان کے اسلام لانے کا واقعہ صحیح بخاری میں تفصیل سے مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں قبیلہ غفار کا ایک آدمی تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مکے میں ایک آدمی نمودار ہوا ہے جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا: تم اس آدمی کے پاس جاؤ اس سے بات کرو۔ اور میرے پاس اس کی خبر لاؤ۔ وہ گیا، ملاقات کی، اور واپس آیا۔ میں نے پوچھا: کیا خبر لائے ہو؟ بولا: خدا کی قسم میں نے ایک ایسا آدمی دیکھا ہے جو بھلائی کا حکم دیتا ہے، اور برائی سے روکتا ہے۔ میں نے کہا: تم نے تشفی بخش خبر نہیں دی۔ آخر میں نے خود توشہ دان اور ڈنڈا اٹھایا اور مکہ کے لیے چل پڑا۔ وہاں پہنچ تو گیا، لیکن آپ ﷺ کو پہچانتا نہ تھا اور یہ

---

[۶] ابن ہشام ۱/ ۴۲۷، ۴۲۸

[۷] یہ بات اکبر شاہ نجیب آبادی نے تحریر کی ہے۔ دیکھئے ان کی تاریخ اسلام ۱/ ۱۲۸

بھی گوارا نہ تھا کہ آپ کے متعلق کسی سے پوچھوں۔ چنانچہ میں زمزم کا پانی پیتا اور مسجد حرام میں پڑا رہتا۔ آخر میرے پاس سے علیؓ کا گذر ہوا۔ کہنے لگے: آدمی اجنبی معلوم ہوتے ہو! میں نے کہا: جی ہاں۔ انہوں نے کہا: اچھا تو گھر چلو۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ نہ وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے نہ میں ان سے کچھ پوچھ رہا تھا اور نہ انہیں کچھ بتا ہی رہا تھا۔

صبح ہوئی تو میں اس ارادے سے پھر مسجد حرام گیا کہ آپ ﷺ کے متعلق دریافت کروں۔ لیکن کوئی نہ تھا جو مجھے آپ ﷺ کے متعلق کچھ بتاتا۔ آخر میرے پاس سے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ گذرے (دیکھ کر) بولے: اس آدمی کو ابھی اپنا ٹھکانہ معلوم نہ ہو سکا؟ میں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: اچھا تو میرے ساتھ چلو۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: اچھا تمہارا معاملہ کیا ہے؟ اور تم کیوں اس شہر میں آئے ہو؟ میں نے کہا: آپ راز داری سے کام لیں تو بتاؤں۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ میں نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ایک آدمی نمودار ہوا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کا نبی بتاتا ہے۔ میں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ وہ بات کر کے آئے۔ مگر اس نے پلٹ کر کوئی تشفی بخش بات نہ بتلائی اس لیے میں نے سوچا کہ خود ہی ملاقات کر لوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: بھئی تم صحیح جگہ پہنچے۔ دیکھو میرا رخ انہیں کی طرف ہے۔ جہاں میں گھسوں وہاں تم بھی گھس جانا۔ اور ہاں اگر میں کسی ایسے شخص کو دیکھوں جس سے تمہارے لیے خطرہ ہے تو دیوار کی طرف اس طرح جا رہوں گا گویا اپنا جوتا ٹھیک کر رہا ہوں لیکن تم راستہ چلتے رہنا۔" اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے اور میں بھی ساتھ ساتھ چل پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اندر داخل ہوئے اور میں بھی ان کے ساتھ نبی ﷺ کے پاس جا داخل ہوا اور عرض پرداز ہوا کہ آپ (ﷺ) مجھ پر اسلام پیش کریں۔ آپ ﷺ نے اسلام پیش فرمایا۔ اور میں وہیں مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے ابوذرؓ! اس معاملے کو پس پردہ رکھو۔ اور اپنے علاقے میں واپس چلے جاؤ۔ جب ہمارے ظہور کی خبر ملے تو آجانا۔ میں نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں تو ان کے درمیان ببانگ دہل اس کا اعلان کروں گا۔ اس کے بعد میں مسجد حرام آیا۔ قریش موجود تھے۔ میں نے کہا: قریش کے لوگو!

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله

"میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ

ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

لوگوں نے کہا: اٹھو۔ اس بے دین کی خبر لو، لوگ اُٹھ پڑے۔ اور مجھے اسقدر مارا گیا کہ مرجاؤں۔ لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے آبچایا۔ انہوں نے مجھے جھک کر دیکھا۔ پھر قریش کی طرف پلٹ کر بولے: تمہاری بربادی ہو۔ تم لوگ غفار کے ایک آدمی کو مارے دے رہے ہو؟ حالانکہ تمہاری تجارت گاہ اور گذرگاہ غفار ہی سے ہو کر جاتی ہے! اس پر لوگ مجھے چھوڑ کر ہٹ گئے۔ دوسرے دن صبح ہوئی تو میں پھر وہیں گیا اور جو کچھ کل کہا تھا آج پھر کہا اور لوگوں نے پھر کہا کہ اٹھو اس بے دین کی خبر لو۔ اس کے بعد پھر میرے ساتھ وہی ہُوا جو کل ہو چکا تھا اور آج بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہی نے مجھے آبچایا۔ وہ مجھ پر جھکے پھر ویسی ہی بات کہی جیسی کل کہی تھی[۸]

۴۔ **طُفَیلؓ بن عَمرو دَوسِیؓ** ۔ یہ شریف انسان شاعر، سوجھ بوجھ کے مالک اور قبیلۂ دَوس کے سردار تھے۔ ان کے قبیلے کو بعض نواحی یمن میں امارت یا تقریباً امارت حاصل تھی۔ وہ نبوت کے گیارہویں سال مکہ تشریف لائے تو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اہلِ مکہ نے ان کا استقبال کیا اور نہایت عزت و احترام سے پیش آئے۔ پھر ان سے عرض پرداز ہوئے کہ اے طفیل! آپ ہمارے شہر تشریف لائے ہیں اور یہ شخص جو ہمارے درمیان ہے اس نے ہمیں سخت پیچیدگی میں پھنسا رکھا ہے۔ ہماری جمعیت بکھیر دی ہے اور ہمارا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ اس کی بات جادو کا سا اثر رکھتی ہے کہ آدمی اور اس کے باپ کے درمیان، آدمی اور اس کے بھائی کے درمیان اور آدمی اور اس کی بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتی ہے۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ جس افتاد سے ہم دوچار ہیں کہیں وہ آپ پر اور آپ کی قوم پر بھی نہ آن پڑے، لہٰذا آپ اس سے ہرگز گفتگو نہ کریں اور اس کی کوئی چیز نہ سنیں۔

حضرت طُفَیلؓ کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ مجھے برابر اسی طرح کی باتیں سمجھاتے رہے یہاں تک کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ نہ آپؐ کی کوئی چیز سنوں گا نہ آپ ﷺ سے بات چیت کروں گا؛ حتیٰ کہ جب میں صبح کو مسجد حرام گیا تو کان میں روئی ٹھونس رکھی تھی کہ مبادا آپ ﷺ کی کوئی بات میرے کان میں پڑ جائے، لیکن اللہ کو منظور تھا کہ آپؐ کی بعض باتیں مجھے سُنا ہی دے۔ چنانچہ میں نے بڑا عمدہ کلام سُنا۔ پھر میں نے اپنے جی میں کہا: ہائے مجھ پر میری ماں کی آہ و فغاں! میں تو بخدا، ایک سوجھ

---

[۸] صحیح بخاری باب قصۃ زمزم ۱/۴۹۹، ۵۰۰۔ باب اسلام ابی ذر ۱/۵۴۴، ۵۴۵

بوجھ رکھنے والا شاعر آدمی ہوں، مجھ پر بھلا برا چھپا نہیں رہ سکتا۔ پھر کیوں نہ میں اس شخص کی بات سنوں؟ اگر اچھی ہوئی تو قبول کرلوں گا۔ بُری ہوئی تو چھوڑ دوں گا۔ یہ سوچ کر میں رُک گیا اور جب آپؐ گھر پلٹے تو میں بھی پیچھے ہولیا۔ آپ ﷺ اندر داخل ہوئے تو میں بھی داخل ہوگیا اور آپؐ کو اپنی آمد کا واقعہ اور لوگوں کے خوف دلانے کی کیفیت، پھر کان میں روئی ٹھونسنے اور اس کے باوجود آپؐ کی بعض باتیں سن لینے کی تفصیلات بتائیں، پھر عرض کیا کہ آپؐ اپنی بات پیش کیجئے۔ آپ ﷺ نے مجھ پر اسلام پیش کیا۔ اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ خدا گواہ ہے: میں نے اس سے عمدہ قول اور اس سے زیادہ انصاف کی بات کبھی نہ سُنی تھی؛ چنانچہ میں نے وہیں اسلام قبول کرلیا اور حق کی شہادت دی۔ اس کے بعد آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے۔ میں ان کے پاس پلٹ کر جاؤں گا اور انہیں اسلام کی دعوت دوں گا۔ لہٰذا آپ ﷺ اللہ سے دُعا فرمائیں کہ وہ مجھے کوئی نشانی دے دے۔ آپ ﷺ نے دُعا فرمائی۔

حضرت طفیل کو جو نشانی عطا ہوئی وہ یہ تھی کہ جب وہ اپنی قوم کے قریب پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے پر چراغ جیسی روشنی پیدا کردی۔ انہوں نے کہا: "یا اللہ چہرے کے بجائے کسی اور جگہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اسے مثلہ کہیں گے۔" چنانچہ یہ روشنی ان کے ڈنڈے میں پلٹ گئی۔ پھر انہوں نے اپنے والد اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی اور وہ دونوں مسلمان ہوگئے؛ لیکن قوم نے اسلام قبول کرنے میں تاخیر کی۔ مگر حضرت طفیلؓ بھی مسلسل کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ غزوۂ خندق کے بعد[1] جب انہوں نے ہجرت فرمائی تو ان کے ساتھ ان کی قوم کے ستّر یا اسّی[2] خاندان تھے۔ حضرت طفیلؓ نے اسلام میں بڑے اہم کارنامے انجام دے کر یمامہ کی جنگ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔[3]

۵۔ ضِمَادُ اَزْدِی ۔ یہ یمن کے باشندے اور قبیلہ اَزْدِ شَنُوْءَۃ کے ایک فرد تھے۔ جھاڑ پھونک کرنا اور آسیب اتارنا ان کا کام تھا۔ مکہ آئے تو وہاں کے احمقوں سے سنا کہ محمد ﷺ پاگل ہیں۔ سوچا کیوں نہ اس شخص کے پاس چلوں ہوسکتا ہے اللہ میرے ہی ہاتھوں سے اسے شفا دے دے؛ چنانچہ آپؐ سے ملاقات کی، اور کہا: اے محمد (ﷺ)! میں آسیب اتارنے کے لیے

---

[1] بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کیونکہ جب وہ مدینہ تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ خیبر میں تھے۔ دیکھئے ابن ہشام ۱/ ۳۸۵

[2] ابن ہشام ۱/ ۱۸۲، ۱۸۵۔ رحمۃ للعالمین ۱/ ۸۱، ۸۲۔ مختصر السیرہ للشیخ عبداللہ ص ۱۴۴

جھاڑ پھونک کیا کرتا ہوں، کیا آپ (ﷺ) کو بھی اس کی ضرورت ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا:

ان الحمد لله نحمده ونستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له، واشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله، امابعد!

"یقیناً ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ بھٹکا دے اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ امابعد:

ضمادؓ نے کہا ذرا اپنے یہ کلمات مجھے پھر سنا دیجئے۔ آپ ﷺ نے تین بار دہرایا۔ اس کے بعد ضمادؓ نے کہا، میں کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کی بات سن چکا ہوں لیکن میں نے آپ ﷺ کے ان جیسے کلمات کہیں نہیں سنے۔ یہ تو سمندر کی اتھاہ گہرائی کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لائیے اپنا ہاتھ بڑھائیے! آپ ﷺ سے اسلام پر بیعت کروں، اور اس کے بعد انہوں نے بیعت کر لی۔[1]

یثرب کی چھ سعادت مند روحیں

گیارہویں سن نبوت کے موسم حج (جولائی ۶۲۰ء) میں اسلامی دعوت کو چند کارآمد بیج دستیاب ہوئے۔ جو دیکھتے دیکھتے سرو قامت درختوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور ان کی لطیف اور گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر مسلمانوں نے برسوں ظلم و ستم کی تپش سے راحت و نجات پائی۔

اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کا جو بیڑا اٹھا رکھا تھا اس کے تئیں نبی ﷺ کی حکمت عملی یہ تھی کہ آپؐ رات کی تاریکی میں قبائل کے پاس تشریف لے جاتے تاکہ مکے کا کوئی مشرک رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

اسی حکمت عملی کے مطابق ایک رات آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر باہر نکلے۔ بنو ذہل اور بنو شیبان بن ثعلبہ کے ڈیروں سے گذرے تو ان سے اسلام کے بارے میں بات چیت کی۔ انہوں نے جواب تو بڑا امید افزا دیا لیکن اسلام

---

[1] صحیح مسلم، مشکاۃ المصابیح باب علامات النبوۃ ۲/۵۲۵

قبول کرنے کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بنو ذہل کے ایک آدمی کے درمیان سلسلۂ نسب کے متعلق بڑا دلچسپ سوال وجواب بھی ہوا۔ دونوں ہی ماہرِ انساب تھے۔[۱۲]

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ منیٰ کی گھاٹی سے گذرے تو کچھ لوگوں کو باہم گفتگو کرتے سنا۔[۱۳] آپ ﷺ نے سیدھے ان کا رُخ کیا اور ان کے پاس جا پہنچے۔ یہ یثرب کے چھ جوان تھے اور سب کے سب قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ نام یہ ہیں:

(۱) اَسعَد بن زُرارہ (قبیلۂ بنی النجار)

(۲) عوفؓ بن حارث بن رفاعہ (ابن عفراء) (" " ")

(۳) رافعؓ بن مالک بن عجلان (قبیلۂ بنی زُریق)

(۴) قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ (قبیلۂ بنی سلمہ)

(۵) عقبہؓ بن عامر بن نابی (قبیلۂ بنی حرام بن کعب)

(۶) حارثؓ بن عبد اللہ بن رئاب، (قبیلۂ بنی عبید بن غنم)

یہ اہلِ یثرب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے حلیف یہود مدینہ سے سُنا کرتے تھے کہ اس زمانے میں ایک نبی بھیجا جانے والا ہے اور اب جلد ہی وہ نمودار ہوگا۔ ہم اس کی پیروی کرکے اس کی معیت میں تمہیں عادِ اِرم کی طرح قتل کر ڈالیں گے۔[۱۴]

رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس پہنچ کر دریافت کیا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا، ہم قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یعنی یہود کے حلیف؟" بولے، ہاں۔ فرمایا، "پھر کیوں نہ آپ حضرات بیٹھیں، کچھ بات چیت کی جائے"۔ وہ لوگ بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان فرمائی۔ انہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا، بھئی دیکھو! یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کا حوالہ دے کر یہود تمہیں دھمکیاں دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہود تم پر سبقت نہ لے جانے پائیں۔ اس کے بعد انہوں نے فوراً آپؐ کی دعوت قبول کرلی اور مسلمان ہوگئے۔

---

[۱۲] دیکھئے مختصر السیرۃ للشیخ عبد اللہ ص ۱۵۰ تا ۱۵۲ [۱۳] رحمۃ للعالمین ۱/ ۸۴

[۱۴] زاد المعاد ۲/ ۵۰ - ابن ہشام ۱/ ۴۲۹، ۴۳۰

یہ یثرب کے عقلاء الرجال تھے۔ حال ہی میں جو جنگ گذر چکی تھی، اور جس کے دھوئیں اب تک فضا کو تاریک کئے ہوئے تھے، اس جنگ نے انہیں چُور چُور کر دیا تھا اس لیے انہوں نے بجا طور پر یہ توقع قائم کی کہ آپؐ کی دعوت، جنگ کے خاتمے کا ذریعہ ثابت ہوگی، چنانچہ انہوں نے کہا "ہم اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ کسی اور قوم میں ان کے جیسی عداوت و دشمنی نہیں پائی جاتی۔ امید ہے کہ اللہ آپؐ کے ذریعے انہیں یکجا کر دے گا۔ ہم وہاں جا کر لوگوں کو آپؐ کے مقصد کی طرف بلائیں گے اور یہ دین جو ہم نے خود قبول کر لیا ہے ان پر بھی پیش کریں گے۔ اگر اللہ نے آپؐ پر ان کو یکجا کر دیا تو پھر آپؐ سے بڑھ کر کوئی اور معزز نہ ہوگا۔"

اس کے بعد جب یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو اپنے ساتھ اسلام کا پیغام بھی لے گئے؛ چنانچہ وہاں گھر گھر رسول اللہ ﷺ کا چرچا پھیل گیا۔[۱۵]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

اسی سال شوال ۱۱ھ نبوت میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر چھ برس تھی۔ پھر ہجرت کے پہلے سال شوال ہی کے مہینہ میں مدینہ کے اندر ان کی رخصتی ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔[۱۶]

○

---

[۱۵] ابن ہشام ۱/۴۲۸، ۴۳۰ [۱۶] تلقیح الفہوم ص ۱۰۔ صحیح البخاری ۱/۵۵۰

اسراء اور معراج

نبی ﷺ کی دعوت و تبلیغ ابھی کامیابی اور ظلم و ستم کے اس درمیانی مرحلے سے گذر رہی تھی اور افق کی دُور دراز پہنائیوں میں دھندلے تاروں کی جھلک دکھائی پڑنا شروع ہو چکی تھی کہ اسراء اور معراج کا واقعہ پیش آیا۔ یہ معراج کب واقع ہوئی؟ اس بارے میں اہل سیر کے اقوال مختلف ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ جس سال آپ ﷺ کو نبوت دی گئی اسی سال معراج بھی واقع ہوئی (یہ طبری کا قول ہے)

۲۔ نبوت کے پانچ سال بعد معراج ہوئی (اسے امام نووی اور امام قرطبی نے راجح قرار دیا ہے)

۳۔ نبوت کے دسویں سال ۲۷ رجب کو ہوئی (اسے علامہ منصور پوری نے اختیار کیا ہے۔)

۴۔ ہجرت سے سولہ مہینے پہلے یعنی نبوت کے بارہویں سال ماہ رمضان میں ہوئی۔

۵۔ ہجرت سے ایک سال دو ماہ پہلے یعنی نبوت کے تیرہویں سال محرم میں ہوئی۔

۶۔ ہجرت سے ایک سال پہلے یعنی نبوت کے تیرہویں سال ماہ ربیع الاول میں ہوئی۔

ان میں سے پہلے تین اقوال اس لیے صحیح نہیں مانے جا سکتے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات نماز پنجگانہ فرض ہونے سے پہلے ہوئی تھی اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت معراج کی رات ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات معراج سے پہلے ہوئی تھی اور معلوم ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات نبوت کے دسویں سال ماہ رمضان میں ہوئی تھی۔ لہٰذا معراج کا زمانہ اس کے بعد کا ہوگا اس سے پہلے کا نہیں۔ باقی رہے آخر کے تین اقوال تو ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینے کے لیے کوئی دلیل نہ مل سکی۔ البتہ سورہ اسراء کے سیاق سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مکی زندگی کے بالکل آخری دور کا ہے۔ [1]

ائمہ حدیث نے اس واقعے کی جو تفصیلات روایت کی ہیں ہم اگلی سطور میں ان کا حاصل

---

[1] ان اقوال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ زاد المعاد ۲/ ۴۹۔ مختصر السیرۃ للشیخ عبد اللہ ص ۱۴۸، ۱۴۹، رحمۃ للعالمین ۱/ ۷۶

پیش کر رہے ہیں۔

ابنِ قیم لکھتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو آپ کے جسم مبارک سمیت بُراق پر سوار کر کے حضرت جبریل علیہ السّلام کی معیت میں مسجد حرام سے بیت المقدس تک سیر کرائی گئی پھر آپ ﷺ نے وہاں نزول فرمایا، اور انبیاء کی امامت فرماتے ہوئے نماز پڑھائی، اور بُراق کو مسجد کے دروازے کے حلقے سے باندھ دیا تھا۔

اس کے بعد اسی رات آپ ﷺ کو بیت المقدس سے آسمانِ دنیا تک لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السّلام نے دروازہ کھلوایا۔ آپ ﷺ کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ آپ ﷺ نے وہاں انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السّلام کو دیکھا، اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے آپؐ کو مرحبا کہا۔ سلام کا جواب دیا اور آپ ﷺ کی نبوّت کا اقرار کیا۔ اللہ نے آپؐ کو ان کے دائیں جانب سعادت مندوں کی رُوحیں اور بائیں جانب بدبختوں کی رُوحیں دکھلائیں۔

پھر آپ ﷺ کو دوسرے آسمان پر لے جایا گیا اور دروازہ کھلوایا گیا۔ آپؐ نے وہاں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اور حضرت عیسےٰ بن مریم علیہما السّلام کو دیکھا۔ دونوں سے ملاقات کی اور سلام کیا۔ دونوں نے سلام کا جواب دیا، مبارک باد دی، اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

پھر تیسرے آسمان پر لے جایا گیا۔ آپ ﷺ نے وہاں حضرت یوسف علیہ السّلام کو دیکھا اور سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا، مبارک باد دی، اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

پھر چوتھے آسمان پر لے جایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ نے حضرت ادریس علیہ السّلام کو دیکھا اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا، مرحبا کہا، اور آپؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔

پھر پانچویں آسمان پر لے جایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ نے حضرت ہارون بن عمران علیہ السّلام کو دیکھا۔ اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا، مبارک باد دی اور اقرارِ نبوّت کیا۔

پھر آپ ﷺ کو چھٹے آسمان پر لے جایا گیا۔ وہاں آپؐ کی ملاقات حضرت موسیٰ بن عمران سے ہُوئی۔ آپ ﷺ نے سلام کیا۔ انہوں نے مرحبا کہا، اور اقرارِ نبوت کیا۔ البتہ جب آپؐ وہاں سے آگے بڑھے تو وہ رونے لگے۔ اُن سے کہا گیا آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: میں اس لیے رو رہا ہوں کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث کیا گیا اس کی امّت کے لوگ میری امّت کے لوگوں سے بہت زیادہ تعداد میں جنّت کے اندر داخل ہوں گے۔

اس کے بعد آپ ﷺ کو ساتویں آسمان پر لے جایا گیا۔ وہاں آپؐ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ آپؐ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا، مبارک باد دی اور آپ ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا۔

اس کے بعد آپ ﷺ کو سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی تک لے جایا گیا۔ پھر آپؐ کے لیے بیتِ مَعْمُور کو ظاہر کیا گیا۔

پھر خدائے جبّار جَلّ جلالہٗ کے دربار میں پہنچایا گیا اور آپ ﷺ اللہ کے اتنے قریب ہوئے کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس وقت اللہ نے اپنے بندے پر وحی فرمائی جو کچھ کہ وحی فرمائی اور پچاس وقت کی نمازیں فرض کیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ واپس ہوئے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرے تو انہوں نے پوچھا کہ اللہ نے آپ ﷺ کو کس چیز کا حکم دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا پچاس نمازوں کا؛ انہوں نے کہا، "آپؐ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیے اور اپنی امت کے لیے تخفیف کا سوال کیجئے"۔ آپ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف دیکھا گویا ان سے مشورہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ ہاں، اگر آپؐ چاہیں۔ اس کے بعد حضرت جبریلؑ آپ ﷺ کو جبّار تبارک تعالیٰ کے حضور لے گئے، اور وہ اپنی جگہ تھا ــــ بعض طرق میں صحیح بخاری کا لفظ یہی ہے ــــ اس نے دس نمازیں کم کر دیں اور آپ ﷺ نیچے لائے گئے۔ جب موسےٰ علیہ السلام کے پاس سے گذر ہوا تو انہیں خبر دی۔ انہوں نے کہا "آپ ﷺ اپنے رب کے پاس واپس جائیے اور تخفیف کا سوال کیجئے"۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ عزّوجل کے درمیان آپؐ کی آمد و رفت برابر جاری رہی۔ یہاں تک کہ اللہ عزّوجل نے صرف پانچ نمازیں باقی رکھیں۔ اس کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کو واپسی اور طلبِ تخفیف کا مشورہ دیا مگر آپ ﷺ نے فرمایا: "اب مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں اسی پر راضی ہوں اور سرِ تسلیم خم کرتا ہوں"۔ پھر جب آپؐ مزید کچھ دور تشریف لے گئے تو ندا آئی کہ میں نے اپنا فریضہ نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی[۲]

اس کے بعد ابنِ قیم نے اس بارے میں اختلاف ذکر کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے رب

---

[۲] زاد المعاد ۲/ ۴۷، ۴۸

تبارک تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں؟ پھر امام ابن تیمیہ کی ایک تحقیق ذکر کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آنکھ سے دیکھنے کا سرے سے کوئی ثبوت نہیں اور نہ کوئی صحابی اس کا قائل ہے؛ اور ابن عباس سے مطلقاً دیکھنے اور دل سے دیکھنے کے جو دو قول منقول ہیں۔ ان میں سے پہلا دوسرے کے منافی نہیں اس کے بعد امام ابن قیم لکھتے ہیں کہ سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ کا جو یہ ارشاد ہے:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○ (۵۳:۸)

"پھر وہ نزدیک آیا اور قریب تر ہو گیا۔"

تو یہ اس قربت کے علاوہ ہے جو معراج کے واقعے میں حاصل ہوئی تھی کیونکہ سورۂ نجم میں جس قربت کا ذکر ہے اس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام کی قربت و تدلّی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے؛ اور سیاق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے اس کے برخلاف حدیث معراج میں جس قربت و تدلی کا ذکر ہے اس کے بارے میں صراحت ہے کہ یہ رب تبارک و تعالیٰ سے قربت و تدلی تھی، اور سورۂ نجم میں اس کو سرے سے چھیڑا ہی نہیں گیا، بلکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا اور یہ حضرت جبریلؑ تھے۔ انہیں محمد ﷺ نے ان کی اپنی شکل میں دو مرتبہ دیکھا تھا ایک مرتبہ زمین پر اور ایک مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ واللہ اعلم[۳]

اس دفعہ بھی نبی ﷺ کے ساتھ شقِ صدر (سینہ چاک کئے جانے) کا واقعہ پیش آیا اور آپؐ کو اس سفر کے دوران کئی چیزیں دکھلائی گئیں۔

آپ ﷺ پر دودھ اور شراب پیش کئے گئے۔ آپؐ نے دودھ اختیار فرمایا۔ اس پر آپؐ سے کہا گیا کہ آپ ﷺ کو فطرت کی راہ بتائی گئی، یا آپؐ نے فطرت پالی۔ اور یاد رکھیے کہ اگر آپ ﷺ نے شراب لی ہوتی تو آپؐ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

آپ ﷺ نے جنت میں چار نہریں دیکھیں، دو ظاہری اور دو باطنی، ظاہری نہریں نیل و فرات تھیں۔ (اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ آپؐ کی رسالت نیل و فرات کی شاداب وادیوں کو اپنا وطن بنائے گی، یعنی یہاں کے باشندے نسلاً بعد نسل مسلمان ہوں گے۔ یہ نہیں کہ ان دونوں نہروں کے

---

[۳] زاد المعاد ۲/۴۷، ۴۸۔ نیز دیکھئے صحیح بخاری۔ ۱/۵۰، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۸۱، ۵۴۸، ۵۴۹، ۲/۵۵۰، ۶۸۴، صحیح مسلم ۱/۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶،

پانی کا منبع جنت میں ہے۔ واللہ اعلم)

آپ ﷺ نے مالک، داروغۂ جہنم کو بھی دیکھا۔ وہ ہنستا نہ تھا اور نہ اس کے چہرے پر خوشی اور بشاشت تھی، آپ ﷺ نے جنت و جہنم بھی دیکھی۔

آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو یتیموں کا مال ظلماً کھا جاتے ہیں۔ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے اور وہ اپنے منہ میں پتھر کے ٹکڑوں جیسے انگارے ٹھونس رہے تھے جو دوسری جانب ان کے پاخانے کے راستے سے نکل رہے تھے۔

آپ ﷺ نے سود خوروں کو بھی دیکھا۔ ان کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے تھے اور جب آلِ فرعون کو آگ پر پیش کرنے کے لیے لے جایا جاتا تو ان کے پاس سے گذرتے وقت انہیں روندتے ہوئے جاتے تھے۔

آپ ﷺ نے زنا کاروں کو بھی دیکھا۔ اُن کے سامنے تازہ اور فربہ گوشت تھا اور اسی کے پہلو بہ پہلو سڑا ہُوا چھیچھڑا بھی تھا۔ یہ لوگ تازہ اور فربہ گوشت چھوڑ کر سڑا ہُوا چھیچھڑا کھا رہے تھے۔

آپ ﷺ نے ان عورتوں کو دیکھا جو اپنے شوہروں پر دوسروں کی اولاد داخل کر دیتی ہیں۔ (یعنی دوسروں سے زنا کے ذریعے حاملہ ہوتی ہیں لیکن لاعلمی کی وجہ سے بچہ ان کے شوہر کا سمجھا جاتا ہے) آپ ﷺ نے انہیں دیکھا کہ ان کے سینوں میں بڑے بڑے ٹیڑھے کانٹے چبھا کر انہیں آسمان و زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا ہے۔

آپ ﷺ نے آتے جاتے ہوئے اہلِ مکہ کا ایک قافلہ بھی دیکھا اور انہیں ان کا ایک اونٹ بھی بتایا جو بھڑک کر بھاگ گیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کا پانی بھی پیا جو ایک ڈھکے ہوئے برتن میں رکھا تھا۔ اس وقت قافلہ سو رہا تھا، پھر آپؐ نے اُسی طرح برتن ڈھک کر چھوڑ دیا اور یہ بات معراج کی صبح آپ ﷺ کے دعوی کی صداقت کی ایک دلیل ثابت ہوئی۔[۱]

علامہ ابنِ قیم فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صبح کی اور اپنی قوم کو ان بڑی بڑی نشانیوں کی خبر دی جو اللہ عزوجل نے آپؐ کو دکھلائی تھیں تو قوم کی تکذیب اور اذیت و ضرر رسانی میں اور شدت آگئی۔ انہوں نے آپؐ سے سوال کیا کہ بیت المقدس کی کیفیت بیان کریں۔ اس پر اللہ نے آپ ﷺ کے لیے بیت المقدس کو ظاہر فرما دیا اور وہ آپؐ کی نگاہوں کے سامنے آگیا چنانچہ

---

[۱] سابقہ حوالے۔ نیز ابنِ ہشام ۱/۳۹۷، ۴۰۲-۴۰۶۔ اور کتب تفاسیر، تفسیر سورہ اسراء

آپ ﷺ نے قوم کو اس کی نشانیاں بتلانا شروع کیں اور ان سے کسی بات کی تردید نہ بن پڑی۔ آپ ﷺ نے جاتے اور آتے ہوئے اُن کے قافلے سے ملنے کا بھی ذکر فرمایا اور بتلایا کہ اس کی آمد کا وقت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس اونٹ کی بھی نشاندہی کی جو قافلے کے آگے آگے آرہا تھا؛ پھر جیسا کچھ آپؐ نے بتایا تھا ویسا ہی ثابت ہوا لیکن ان سب کے باوجود ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔ اور ان ظالموں نے کفر کرتے ہوئے کچھ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ [۵]

کہا جاتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اسی موقع پر صدیق کا خطاب دیا گیا کیونکہ آپ نے اس واقعے کی اس وقت تصدیق کی جبکہ اور لوگوں نے تکذیب کی تھی۔ [۶]

معراج کا فائدہ بیان فرماتے ہوئے جو سب سے مختصر اور عظیم بات کہی گئی وہ یہ ہے:

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ (۱۷:۱)

"تاکہ ہم (اللہ تعالیٰ) آپ کو اپنی کچھ نشانیاں دکھلائیں۔"

اور انبیاء کرام کے بارے میں یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ (۶:۷۵)

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمان و زمین کا نظامِ سلطنت دکھلایا۔ اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو۔"

اور موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ○ (۲۰:۲۳)

"تاکہ ہم تمہیں اپنی کچھ بڑی نشانیاں دکھلائیں۔"

پھر ان نشانیوں کے دکھلانے کا جو مقصود تھا اسے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو) کے ذریعے واضح فرما دیا۔ چنانچہ جب انبیاء کرامؑ کے علوم کو اس طرح کے مشاہدات کی سند حاصل ہو جاتی تھی تو انہیں عین الیقین کا وہ مقام حاصل ہو جاتا تھا جس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرامؑ اللہ کی راہ میں ایسی ایسی مشکلات جھیل لیتے تھے جنہیں کوئی اور جھیل ہی نہیں سکتا۔

---

[۵] زاد المعاد ۱/۴۸ نیز دیکھئے صحیح بخاری ۲/۶۸۴ صحیح مسلم ۱/۹۶، ابن ہشام ۱/۴۰۲، ۴۰۳۔

[۶] ابن ہشام ۱/۳۹۹

درحقیقت ان کی نگاہوں میں دُنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی مچھر کے پَر کے برابر حیثیت نہیں رکھتی تھیں اسی لیے وہ ان قوتوں کی طرف سے ہونے والی سختیوں اور ایذا رسانیوں کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔

اس واقعۂ معراج کی جزئیات کے پس پردہ مزید جو حکمتیں اور اسرار کارفرما تھے ان کی بحث کا اصل مقام اسرارِ شریعت کی کتابیں ہیں البتہ چند موٹے موٹے حقائق ایسے ہیں، جو اس مبارک سفر کے سرچشموں سے پھوٹ کر سیرت نبوی کے گلشن کی طرف رواں دواں ہیں اس لیے یہاں مختصراً انہیں قلمبند کیا جا رہا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالےٰ نے سورہ اسراء میں اسراء کا واقعہ صرف ایک آیت میں ذکر کر کے کلام کا رُخ یہود کی سیاہ کاریوں اور جرائم کے بیان کی جانب موڑ دیا ہے؛ پھر انہیں آگاہ کیا ہے کہ یہ قرآن اس راہ کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھی اور صحیح راہ ہے۔ قرآن پڑھنے والے کو بسا اوقات شبہ ہوتا ہے کہ دونوں باتیں بے جوڑ ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالےٰ اس اسلوب کے ذریعے یہ اشارہ فرما رہا ہے کہ اب یہود کو نوعِ انسانی کی قیادت سے معزول کیا جانے والا ہے کیونکہ انہوں نے ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن سے ملوث ہونے کے بعد انہیں اس منصب پر باقی نہیں رکھا جا سکتا؛ لہٰذا اب یہ منصب رسول اللہ ﷺ کو سونپا جائے گا اور دعوتِ ابراہیمی کے دونوں مراکز ان کے ماتحت کر دیئے جائیں گے۔ بالفاظ دیگر اب وقت آگیا ہے کہ روحانی قیادت ایک امت سے دوسری امت کو منتقل کر دی جائے، یعنی ایک ایسی امت سے جس کی تاریخ غدر و خیانت اور ظلم و بدکاری سے بھری ہوئی ہے، یہ قیادت چھین کر ایک ایسی امت کے حوالے کر دی جائے جس سے نیکیوں اور بھلائیوں کے چشمے پھوٹیں گے اور جس کا پیغمبر سب سے زیادہ درست راہ بتانے والے قرآن کی وحی سے بہرہ ور ہے۔

لیکن یہ قیادت منتقل کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس امت کا رسول مکے کے پہاڑوں میں لوگوں کے درمیان ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے؟ اس وقت یہ ایک سوال تھا جو ایک دوسری حقیقت سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ اور وہ حقیقت یہ تھی کہ اسلامی دعوت کا ایک دَور اپنے خاتمے اور اپنی تکمیل کے قریب آلگا ہے اور اب ایک دوسرا دَور شروع ہونے والا ہے جس کا دھارا پہلے سے مختلف ہوگا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آیات میں مشرکین کو کھلی وارننگ اور سخت دھمکی دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ○ (۱۷: ۱۶)

"اور جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے اصحابِ ثروت کو حکم دیتے ہیں مگر وہ کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ پس اس بستی پر (تباہی کا) قول برحق ہو جاتا ہے اور ہم اسے کچل کر رکھ دیتے ہیں۔"

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ○ (۱۷: ۱۷)

"اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قوموں کو تباہ کر دیا؛ اور تمہارا رب اپنے بندوں کے جرائم کی خبر رکھنے اور دیکھنے کے لیے کافی ہے۔"

پھر ان آیات کے پہلو بہ پہلو کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن میں مسلمانوں کو ایسے تمدنی قواعد و ضوابط اور دفعات و مبادی بتلائے گئے ہیں جن پر آئندہ اسلامی معاشرے کی تعمیر ہونی تھی۔ گویا اب وہ کسی ایسی سرزمین پر اپنا ٹھکانا بنا چکے ہیں، جہاں ہر پہلو سے ان کے معاملات ان کے اپنے ہاتھ میں ہیں اور انہوں نے ایک ایسی وحدت متماسکہ بنالی ہے جس پر سماج کی چکی گھوما کرتی ہے لہٰذا ان آیات میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عنقریب ایسی جائے پناہ اور امن گاہ پالیں گے جہاں آپ ﷺ کے دین کو استقرار نصیب ہوگا۔

یہ اسرار و معراج کے بابرکت واقعے کی تہ میں پوشیدہ حکمتوں اور رازہائے سربستہ میں سے ایک ایسا راز اور ایک ایسی حکمت ہے جس کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق ہے۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اسے بیان کر دیں۔ اسی طرح کی دو بڑی حکمتوں پر نظر ڈالنے کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسرار کا یہ واقعہ یا تو بیعتِ عقبۂ اُولیٰ سے کچھ ہی پہلے کا ہے یا عقبہ کی دونوں بیعتوں کے درمیان کا ہے۔ واللہ اعلم

○

پہلی بیعتِ عقبہ[1]

ہم بتا چکے ہیں کہ نبوت کے گیارہویں سال موسم حج میں یثرب کے چھ آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی قوم میں جا کر آپ ﷺ کی رسالت کی تبلیغ کریں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے سال جب موسم حج آیا (یعنی ذی الحجہ ۱۲ سنہ نبوی، مطابق جولائی ۶۲۱ء) تو بارہ آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ بن رئاب کو چھوڑ کر باقی پانچ وہی تھے جو پچھلے سال بھی آ چکے تھے اور ان کے علاوہ سات آدمی نئے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) معاذؓ بن الحارث ابن عفراء	قبیلہ بنی النجار	(خزرج)
(۲) ذکوانؓ بن عبد القیس	" بنی زریق	(")
(۳) عبادہؓ بن صامت	" بنی غنم	(")
(۴) یزیدؓ بن ثعلبہ	" بنی غنم کے حلیف	(")
(۵) عباسؓ بن عبادہ بن نضلہ	قبیلہ بنی سالم	(خزرج)
(۶) ابوالہیثمؓ بن التیہان	" بنی عبدالاشہل	(اوس)
(۷) عویمؓ بن ساعدہ	" بنی عمرو بن عوف	(")

---

[1] عقبہ (ع۔ ق۔ ب تینوں کو زبر) پہاڑ کی گھاٹی یعنی تنگ پہاڑی گذرگاہ کو کہتے ہیں۔ مکہ سے منیٰ آتے جاتے ہوئے منیٰ کے مغربی کنارے پر ایک تنگ پہاڑی راستے سے گذرنا پڑتا تھا۔ یہی گذرگاہ عقبہ کے نام سے مشہور رہے۔ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو جس ایک جمرہ کو کنکری ماری جاتی ہے وہ اسی گذرگاہ کے سرے پر واقع ہے اسلئے اسے جمرۂ عقبہ کہتے ہیں۔ اس جمرہ کا دوسرا نام جمرۂ کبریٰ بھی ہے۔ باقی دو جمرے اس سے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ چونکہ منیٰ کا پورا میدان جہاں حجاج قیام کرتے ہیں، ان تینوں جمرات کے مشرق میں ہے اس لیے ساری چہل پہل ادھر ہی رہتی تھی اور کنکریاں مارنے کے بعد اس طرف لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بیعت لینے کے لیے اس گھاٹی کو منتخب کیا اور اسی مناسبت سے اس کو بیعت عقبہ کہتے ہیں۔ اب پہاڑ کاٹ کر یہاں کشادہ سڑکیں نکال لی گئی ہیں۔

ان میں صرف اخیر کے دو آدمی قبیلۂ اوس سے تھے، بقیہ سب کے سب قبیلۂ خزرج سے تھے۔[۲]
ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے منیٰ میں عقبہ کے پاس ملاقات کی اور آپ ﷺ سے چند باتوں پر بیعت کی۔ یہ باتیں وہی تھیں جن پر آئندہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ کے وقت عورتوں سے بیعت لی گئی۔

عقبہ کی اس بیعت کی تفصیل صحیح بخاری میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آؤ! مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کروگے، چوری نہ کروگے، زنا نہ کروگے، اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے، اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان سے گھڑ کر کوئی بہتان نہ لاؤگے اور کسی بھلی بات میں میری نافرمانی نہ کروگے۔ جو شخص یہ ساری باتیں پوری کرے گا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے گا پھر اسے دنیا ہی میں اس کی سزا دے دی جائے گی تو یہ اس کے لیے کفارہ ہوگی۔ اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے گا پھر اللہ اس پر پردہ ڈال دے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، چاہے گا تو سزا دے گا اور چاہے گا تو معاف کردے گا۔" حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس پر آپ ﷺ سے بیعت کی۔[۳]

مدینہ میں اسلام کا سفیر

بیعت پوری ہوگئی اور حج ختم ہوگیا تو نبی ﷺ نے ان لوگوں کے ہمراہ یثرب میں اپنا پہلا سفیر بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو اسلامی احکام کی تعلیم دے اور انہیں دین کے دروبست سکھائے۔ اور جو لوگ اب تک شرک پر چلے آرہے ہیں ان میں اسلام کی اشاعت کرے۔ نبی ﷺ نے اس سفارت کے لیے سابقین اولین میں سے ایک جوان کا انتخاب فرمایا۔ جس کا نام نامی اور اسم گرامی مُصْعَب بن عُمَیر عَبْدَرِی رضی اللہ عنہ ہے۔

قابلِ رشک کامیابی

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کے گھر نزول فرما ہوئے۔ پھر دونوں نے مل کر

---

[۲] رحمۃ للعالمین ۱/۸۵، ابن ہشام ۱/۴۳۱ تا ۴۳۳

[۳] صحیح بخاری، باب بعد باب علامۃ الایمان ۱/۷، باب وفود الانصار ۱/۵۵۰، ۵۵۱ (لفظ اسی باب کا ہے) باب قولہ تعالیٰ اذا جاءک المؤمنات ۲/۷۲۷، باب الحدود کفارۃ ۲/۱۰۰۳

اہل یثرب میں جوش و خروش سے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ حضرت مُصعبؓ مُقری کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ (مُقری کے معنی ہیں پڑھانے والا۔ اس وقت معلّم اور استاد کو مُقری کہتے تھے۔)

تبلیغ کے سلسلے میں ان کی کامیابی کا ایک نہایت شاندار واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ انہیں ہمراہ لے کر بنی عبد الاشہل اور بنی ظفر کے محلے میں تشریف لے گئے اور وہاں بنی ظفر کے ایک باغ کے اندر مرق نامی ایک کنویں پر بیٹھ گئے۔ ان کے پاس چند مسلمان بھی جمع ہو گئے۔ اُس وقت تک بنی عبد الاشہل کے دونوں سردار یعنی حضرت سعدؓ بن معاذؓ اور حضرت اُسیدؓ بن حُضیرؓ مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ شرک ہی پر تھے۔ انہیں جب خبر ہوئی تو حضرت سعدؓ نے حضرت اُسیدؓ سے کہا کہ ذرا جاؤ اور ان دونوں کو، جو ہمارے کمزوروں کو بیوقوف بنانے آئے ہیں، ڈانٹ دو اور ہمارے محلے میں آنے سے منع کر دو۔ چونکہ اسعدؓ بن زرارہ میری خالہ کا لڑکا ہے (اس لیے تمہیں بھیج رہا ہوں) ورنہ یہ کام میں خود انجام دے دیتا۔

اُسیدؓ نے اپنا حربہ اٹھایا۔ اور ان دونوں کے پاس پہنچے۔ حضرت اسعدؓ نے انہیں آتا دیکھ کر حضرت مصعبؓ سے کہا: "یہ اپنی قوم کا سردار تمہارے پاس آ رہا ہے۔ اس کے بارے میں اللہ سے سچائی اختیار کرنا۔" حضرت مصعبؓ نے کہا: "اگر یہ بیٹھا تو اس سے بات کروں گا۔" اُسیدؓ پہنچے تو ان کے پاس کھڑے ہو کر سخت سست کہنے لگے۔ بولے "تم دونوں ہمارے یہاں کیوں آتے ہو؟ ہمارے کمزوروں کو بیوقوف بناتے ہو؟ یاد رکھو! اگر تمہیں اپنی جان کی ضرورت ہے تو ہم سے الگ ہی رہو۔" حضرت مصعبؓ نے کہا: "کیوں نہ آپ بیٹھیں اور کچھ سنیں۔ اگر کوئی بات پسند آجائے تو قبول کر لیں، پسند نہ آئے تو چھوڑ دیں۔" حضرت اُسیدؓ نے کہا: "بات منصفانہ کہہ رہے ہو۔" اس کے بعد اپنا حربہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔ اب حضرت مصعبؓ نے اسلام کی بات شروع کی اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ ان کا بیان ہے کہ بخدا ہم نے حضرت اُسیدؓ کے بولنے سے پہلے ہی اُن کے چہرے کی چمک دمک سے ان کے اسلام کا پتہ لگا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے زبان کھولی تو فرمایا: "یہ تو بڑا ہی عمدہ اور بہت ہی خوب تر ہے۔ تم لوگ کسی کو اس دین میں داخل کرنا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟" انہوں نے کہا: "آپ غسل کر لیں، کپڑے پاک کر لیں۔ پھر حق کی شہادت دیں، پھر دو رکعت نماز پڑھیں۔" انہوں نے اٹھ کر غسل کیا، کپڑے پاک کیے۔ کلمۂ شہادت ادا کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر بولے: "میرے پیچھے ایک اور شخص ہے، اگر وہ تمہارا پیروکار بن جائے تو اُس کی قوم کا کوئی آدمی پیچھے نہ رہے گا، اور میں اس کو ابھی تمہارے پاس بھیج رہا

ہوں۔ (اشارہ حضرت سعدؓ بن معاذ کی طرف تھا۔)

اس کے بعد حضرت اُسیدؓ نے اپنا حربہ اٹھایا اور پلٹ کر حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ محفل میں تشریف فرما تھے (حضرت اُسیدؓ کو دیکھ کر) بولے: "میں بخدا کہہ رہا ہوں کہ یہ شخص تمہارے پاس جو چہرہ لے کر آرہا ہے یہ وہ چہرہ نہیں ہے جسے لے کر گیا تھا۔" پھر جب حضرت اُسیدؓ محفل کے پاس آن کھڑے ہوئے تو حضرت سعدؓ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے کہا: "میں نے ان دونوں سے بات کی تو واللہ مجھے کوئی حرج تو نظر نہیں آیا۔ ویسے میں نے انہیں منع کر دیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ہم وہی کریں گے جو آپ چاہیں گے۔

اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنی حارثہ کے لوگ اسعدؓ بن زُرارہ کو قتل کرنے گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسعدؓ آپ کی خالہ کا لڑکا ہے لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ آپ کا عہد توڑ دیں۔" یہ سن کر سعد غصے سے بھڑک اُٹھے اور اپنا نیزہ لے کر سیدھے ان دونوں کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو دونوں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ سمجھ گئے کہ اُسیدؓ کا منشا یہ تھا کہ آپ بھی ان کی باتیں سنیں لیکن یہ ان کے پاس پہنچے تو کھڑے ہو کر سخت سست کہنے لگے۔ پھر اسعدؓ بن زرارہ کو مخاطب کر کے بولے: "خدا کی قسم اے ابوامامہ! اگر میرے اور تیرے درمیان قرابت کا معاملہ نہ ہوتا تو تم مجھ سے اس کی امید نہ رکھ سکتے تھے۔ ہمارے محلے میں آکر ایسی حرکتیں کرتے ہو جو ہمیں گوارا نہیں۔"

ادھر حضرت اسعدؓ نے حضرت مُصعبؓ سے پہلے ہی سے کہہ دیا تھا کہ بخدا تمہارے پاس ایک ایسا سردار آرہا ہے جس کے پیچھے اس کی پوری قوم ہے۔ اگر اس نے تمہاری بات مان لی تو پھر ان میں سے کوئی بھی نہ پچھڑے گا۔ اس لیے حضرت مصعبؓ نے حضرت سعد سے کہا: "کیوں نہ آپ تشریف رکھیں اور سنیں۔ اگر کوئی بات پسند آگئی تو قبول کر لیں اور اگر پسند نہ آئی تو ہم آپ کی ناپسندیدہ بات کو آپ سے دُور ہی رکھیں گے۔" حضرت سعد نے کہا: "انصاف کی بات کہتے ہو۔" اس کے بعد اپنا نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔ حضرت مصعبؓ نے ان پر اسلام پیش کیا اور قرآن کی تلاوت کی۔ اُن کا بیان ہے کہ ہمیں حضرت سعد کے بولنے سے پہلے ہی ان کے چہرے کی چمک دمک سے اُن کے اسلام کا پتا لگ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے زبان کھولی اور فرمایا: "تم لوگ اسلام لاتے ہو تو کیا کرتے ہو؟" انہوں نے کہا: "آپ غسل کر لیں کپڑے پاک کر لیں، پھر حق کی شہادت دیں، پھر دو رکعت نماز پڑھیں۔" حضرت سعدؓ نے ایسا ہی کیا۔

اس کے بعد اپنا نیزہ اٹھایا اور اپنی قوم کی محفل میں تشریف لائے۔ لوگوں نے دیکھتے ہی کہا: "ہم بخدا کہہ رہے ہیں کہ حضرت سعدؓ جو چہرہ لے کر گئے تھے اس کے بجائے دوسرا ہی چہرہ لے کر پلٹے ہیں"۔ پھر جب حضرت سعدؓ اہلِ مجلس کے پاس آکر رُکے تو بولے: "اے بنی عبدالاشہل! تم لوگ اپنے اندر میرا معاملہ کیسا جانتے ہو؟" انہوں نے کہا، آپ ہمارے سردار ہیں۔ سب سے اچھی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں اور ہمارے سب سے بابرکت پاسبان ہیں۔ انہوں نے کہا: "اچھا تو سنو! اب تمہارے مردوں اور عورتوں سے میری بات چیت حرام ہے جب تک کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لاؤ"۔ ان کی اس بات کا یہ اثر ہُوا کہ شام ہوتے ہوتے اس قبیلے کا کوئی بھی مرد اور کوئی بھی عورت ایسی نہ بچی جو مسلمان نہ ہوگئی ہو۔ صرف ایک آدمی جس کا نام اُصَیرِم تھا اس کا اسلام جنگِ احد تک موخر ہُوا۔ پھر احد کے دن اس نے اسلام قبول کیا اور جنگ میں لڑتا ہُوا کام آگیا۔ اس نے ابھی اللہ کے لیے ایک سجدہ بھی نہ کیا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس نے تھوڑا عمل کیا اور زیادہ اجر پایا۔

حضرت مصعبؓ، حضرت اسعدؓ بن زرارہ ہی کے گھر مقیم رہ کر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انصار کا کوئی گھرانہ باقی نہ بچا جس میں چند مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوچکی ہوں۔ صرف بنی امیہ بن زید اور خطمہ اور وائل کے مکانات باقی رہ گئے تھے۔ مشہور شاعر قیس بن اسلت انہیں کا آدمی تھا اور یہ لوگ اسی کی بات مانتے تھے۔ اس شاعر نے انہیں جنگ خندق (۵ھ ہجری) تک اسلام سے روکے رکھا۔ بہرحال اگلے موسمِ حج یعنی تیرہویں سال نبوت کا موسم حج آنے سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کامیابی کی بشارتیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مکہ تشریف لائے اور آپ ﷺ کو قبائلِ یثرب کے حالات، ان کی جنگی اور دفاعی صلاحیتوں اور خیر کی لیاقتوں کی تفصیلات سنائیں۔[1]

○

---

[1] ابن ہشام ۱/ ۴۳۵-۴۳۸، ۲/ ۹۰ زاد المعاد ۲/ ۵۱

دُوسری بیعتِ عَقبَہ

نبوت کے تیرہویں سال موسم حج - جون ۶۲۲ء - میں یثرب کے ستر سے زیادہ مسلمان فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ تشریف لائے۔ یہ اپنی قوم کے مشرک حاجیوں میں شامل ہو کر آئے تھے اور ابھی یثرب ہی میں تھے، یا مکے کے راستے ہی میں تھے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم کب تک رسول اللہ ﷺ کو یوں ہی مکے کے پہاڑوں میں چکر کاٹتے، ٹھوکریں کھاتے اور خوفزدہ کیے جاتے چھوڑے رکھیں گے؟

پھر جب یہ مسلمان مکہ پہنچ گئے تو درپردہ نبی ﷺ کے ساتھ سلسلہ اور رابطہ شروع کیا اور آخر کار اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ دونوں فریق ایام تشریق[1] کے درمیانی دن - ۱۲ ذی الحجہ کو - منیٰ میں جمرۂ اولیٰ، یعنی جمرۂ عقبہ کے پاس جو گھاٹی ہے اسی میں جمع ہوں اور یہ اجتماع رات کی تاریکی میں بالکل خفیہ طریقے پر ہو۔

آیئے اب اس تاریخی اجتماع کے احوال، انصار کے ایک قائد کی زبانی سنیں کہ یہی وہ اجتماع ہے جس نے اسلام و بت پرستی کی جنگ میں رفتارِ زمانہ کا رُخ موڑ دیا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ہم لوگ حج کے لیے نکلے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایامِ تشریق کے درمیانی روز عقبہ میں ملاقات طے ہوئی اور بالآخر وہ رات آگئی جس میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات طے تھی۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک معزز سردار عبداللہ بن حرام بھی تھے (جو ابھی اسلام نہ لائے تھے) ہم نے ان کو ساتھ لے لیا تھا۔ ورنہ ہمارے ساتھ ہماری قوم کے جو مشرکین تھے ہم ان سے اپنا سارا معاملہ خفیہ رکھتے تھے ـــــ مگر ہم نے عبداللہ بن حرام سے بات چیت کی اور کہا کہ اے ابو جابر! آپ ہمارے ایک معزز اور شریف سربراہ ہیں اور ہم آپ کو آپ کی موجودہ حالت سے نکالنا چاہتے ہیں تاکہ آپ کل کلاں کو آگ کا ایندھن نہ بن جائیں۔ اس کے بعد ہم نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور بتلایا

---

[1] ماہ ذی الحجہ کی گیارہ، بارہ، تیرہ تاریخوں کو ایام تشریق کہتے ہیں۔

کہ آج عقبہ میں رسول اللہ ﷺ سے ہماری ملاقات طے ہے۔ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور ہمارے ساتھ عقبہ میں تشریف لے گئے اور نقیب بھی مقرر ہوئے۔"

حضرت کعب رضی اللہ عنہ واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہم لوگ حسبِ دستور اس رات اپنی قوم کے ہمراہ اپنے ڈیروں میں سوئے، لیکن جب تہائی رات گذر گئی تو اپنے ڈیروں سے نکل نکل کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ طے شدہ مقام پر جا پہنچے۔ ہم اس طرح چپکے چپکے دبک کر نکلتے تھے جیسے چڑیا گھونسلے سے سکڑ کر نکلتی ہے، یہاں تک کہ ہم سب عقبہ میں جمع ہو گئے۔ ہماری کل تعداد پچھتر تھی۔ تہتر مرد اور دو عورتیں۔ ایک ام عمارہ نسیبہ بنت کعب تھیں جو قبیلہ بنو مازن بن نجار سے تعلق رکھتی تھیں اور دوسری ام منیع اسماء بنت عمرو تھیں۔ جن کا تعلق قبیلہ بنو سلمہ سے تھا۔

ہم سب گھاٹی میں جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرنے لگے اور آخر وہ لمحہ آ ہی گیا جب آپ تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب بھی تھے۔ وہ اگرچہ ابھی تک اپنی قوم کے دین پر تھے مگر چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کے معاملے میں موجود رہیں اور ان کے لیے پختہ اطمینان حاصل کرلیں۔ سب سے پہلے بات بھی انہیں نے شروع کی۔"[۲]

گفتگو کا آغاز اور حضرت عباسؓ کی طرف سے معاملے کی نزاکت کی تشریح

مجلس مکمل ہو گئی تو دینی اور فوجی تعاون کے عہد و پیمان کو قطعی اور آخری شکل دینے کے لیے گفتگو کا آغاز ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ نے سب سے پہلے زبان کھولی۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ وہ پوری صراحت کے ساتھ اس ذمہ داری کی نزاکت واضح کردیں جو اس عہد و پیمان کے نتیجے میں ان حضرات کے سر پڑنے والی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

خزرج کے لوگو! ۔ عام اہلِ عرب انصار کے دونوں ہی قبیلے یعنی خزرج اور اوس کو خزرج ہی کہتے تھے۔ ہمارے اندر محمد ﷺ کی جو حیثیت ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہماری قوم کے جو لوگ دینی نقطۂ نظر سے ہمارے ہی جیسی رائے رکھتے ہیں ہم نے محمد ﷺ کو ان سے محفوظ رکھا ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے شہر میں قوت و عزت اور طاقت و حفاظت کے اندر ہیں مگر اب

---

[۲] ابن ہشام ۱/ ۴۴۰، ۴۴۱

وہ تمہارے یہاں جانے اور تمہارے ساتھ لاحق ہونے پر مصر ہیں؛ لہذا اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم انہیں جس چیز کی طرف بلا رہے ہو اسے نبھا لو گے اور انہیں ان کے مخالفین سے بچا لو گے۔ تب تو ٹھیک ہے۔ تم نے جو ذمے داری اٹھائی ہے اسے تم جانو۔ لیکن اگر تمہارا یہ اندازہ ہے کہ تم انہیں اپنے پاس لے جانے کے بعد ان کا ساتھ چھوڑ کر کنارہ کش ہو جاؤ گے تو پھر ابھی سے انہیں چھوڑ دو۔ کیونکہ وہ اپنی قوم اور اپنے شہر میں بہر حال عزت و حفاظت سے ہیں۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے عباسؓ سے کہا کہ آپ کی بات ہم نے سن لی۔ اب اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ گفتگو فرمائیے۔ اور اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو عہد و پیمان پسند کریں لیجئے۔[۳]

اس جواب سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم ذمے داری کو اٹھانے اور اس کے پُرخطر نتائج کو جھیلنے کے سلسلے میں انصار کے عزم و حکم، شجاعت و ایمان اور جوش و اخلاص کا کیا حال تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی۔ آپؐ نے پہلے قرآن کی تلاوت کی، اللہ کی طرف دعوت دی اور اسلام کی ترغیب دی۔ اس کے بعد بیعت ہوئی۔

بیعت کی دفعات

بیعت کا واقعہ امام احمدؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپؐ سے کس بات پر بیعت کریں۔ آپؐ نے فرمایا "اس بات پر کہ

(۱) چستی اور سستی ہر حال میں بات سنو گے اور مانو گے۔

(۲) تنگی اور خوشحالی ہر حال میں مال خرچ کرو گے۔

(۳) بھلائی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے۔

(۴) اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہو گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کرو گے۔

(۵) اور جب میں تمہارے پاس آجاؤں گا تو میری مدد کرو گے اور جس چیز سے اپنی جان اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو اس سے میری بھی حفاظت کرو گے۔

اور تمہارے لیے جنت ہے۔"[۴]

---

[۳] ابن ہشام ۱/ ۴۴۱، ۴۴۲ [۴] اسے امام احمد بن حنبل نے حسن سند سے روایت کیا ہے (ابن کثیر)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ۔ جسے ابنِ اسحاق نے ذکر کیا ہے ۔ صرف آخری دفعہ (۵) کا ذکر ہے ۔ چنانچہ اس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی تلاوت، اللہ کی طرف دعوت اور اسلام کی ترغیب دینے کے بعد فرمایا: "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اس چیز سے میری حفاظت کرو گے جس سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔" اس پر حضرت براء بن معرور نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہا ہاں! اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے ہم یقیناً اس چیز سے آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے جس سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ لہٰذا اے اللہ کے رسول ﷺ! آپؐ ہم سے بیعت لیجئے ۔ ہم خدا کی قسم جنگ کے بیٹے ہیں اور ہتھیار ہمارا کھلونا ہے ۔ ہماری یہی ریت باپ دادا سے چلی آ رہی ہے ۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ حضرت براءؓ ۔ رسول اللہ ﷺ سے بات کر ہی رہے تھے کہ ابو الہیثمؓ بن تیہان نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے اور کچھ لوگوں ۔ یعنی یہود ۔ کے درمیان ۔ عہد و پیمان کی ۔ رسیاں ہیں ۔ اور اب ہم ان رسیوں کو کاٹنے والے ہیں، تو کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ ہم ایسا کر ڈالیں پھر اللہ آپ ﷺ کو غلبہ و ظہور عطا فرمائے تو آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف پلٹ آئیں۔"

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا، پھر فرمایا: "(نہیں) بلکہ آپ لوگوں کا خون میرا خون اور آپ لوگوں کی بربادی میری بربادی ہے ۔ میں آپ سے ہوں اور آپ مجھ سے ہیں ۔ جس سے آپ جنگ کریں گے اس سے میں جنگ کروں گا اور جس سے آپ صلح کریں گے اس سے میں صلح کروں گا۔"[۵]

خطرناکی بیعت کی مکرر یاد دہانی

بیعت کی شرائط کے متعلق گفت و شنید مکمل ہو چکی اور لوگوں نے بیعت شروع کرنے کا ارادہ کیا تو صفِ اوّل کے دو مسلمان جو ۱۱ھ نبوت اور ۱۲ھ نبوت کے ایام حج میں مسلمان ہوئے تھے، یکے بعد دیگرے اٹھے تاکہ لوگوں کے سامنے ان کی ذمے داری کی نزاکت اور خطرناکی کو اچھی طرح واضح کر دیں اور یہ لوگ معاملے کے سارے پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہی بیعت کریں ۔ اس سے یہ بھی پتہ لگانا مقصود

البتہ نت گزشتہ منز، اور امام حاکم اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے ۔ دیکھئے مختصر السیرہ شیخ عبداللہ نجدی ص ۱۵۵ ۔ ابن اسحاق نے قریب قریب یہی چیز حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے؛ البتہ اس میں ایک دفعہ کا اضافہ ہے جو یہ ہے کہ ہم اہل حکومت سے حکومت کے لیے نزاع نہ کریں گے ۔ دیکھئے ابن ہشام ۱/۴۵۴

۵ ابن ہشام ۱/۴۴۲

تھا کہ قوم کس حد تک قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب لوگ بیعت کے لیے جمع ہو گئے تو حضرت عباسؓ بن عبادہ بن نضلہ نے کہا: "تم لوگ جانتے ہو کہ ان سے (اشارہ نبی ﷺ کی طرف تھا) کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟" جی ہاں کی آوازوں پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا "تم ان سے سرخ اور سیاہ لوگوں سے جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ جب تمہارے اموال کا صفایا کر دیا جائے گا اور تمہارے اشراف قتل کر دیئے جائیں گے تو تم ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو ابھی سے چھوڑ دو؛ کیونکہ اگر تم نے انہیں لے جانے کے بعد چھوڑ دیا تو یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہوگی۔ اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم مال کی تباہی اور اشراف کے قتل کے باوجود وہ عہد نبھاؤ گے جس کی طرف تم نے انہیں بلایا ہے تو پھر بے شک تم انہیں لے لو۔ کیونکہ یہ خدا کی قسم دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔"

اس پر سب نے بیک آواز کہا: ہم مال کی تباہی اور اشراف کے قتل کا خطرہ مول لے کر انہیں قبول کرتے ہیں۔ ہاں! اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم نے یہ عہد پورا کیا تو ہمیں اس کے عوض کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جنت۔ لوگوں نے عرض کی: اپنا ہاتھ پھیلایئے! آپؐ نے ہاتھ پھیلایا اور لوگوں نے بیعت کی۔[۶]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس وقت ہم بیعت کرنے اٹھے تو حضرت اسعدؓ بن زرارہ نے ــــ جو ان ستر آدمیوں میں سب سے کم عمر تھے ــــ آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے: "اہل یثرب ذرا ٹھہر جاؤ! ہم آپ کی خدمت میں اونٹوں کے کلیجے مار کر (یعنی لمبا چوڑا سفر کر کے) اس یقین کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آج آپؐ کو یہاں سے لے جانے کے معنی ہیں سارے عرب سے دشمنی، تمہارے چیدہ سرداروں کا قتل، اور تلواروں کی مار۔ لہٰذا اگر یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہو تب تو انہیں لے چلو، اور تمہارا اجر اللہ پر ہے۔ اور اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو انہیں ابھی سے چھوڑ دو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول عذر ہوگا۔"[۷]

بیعت کی تکمیل

بیعت کی دفعات پہلے ہی طے ہو چکی تھیں، ایک بار نزاکت کی وضاحت بھی ہو چکی تھی۔ اب یہ تاکید مزید ہوئی تو لوگوں نے بیک آواز کہا: "اسعدؓ بن زرارہ! اپنا ہاتھ ہٹاؤ۔ خدا کی قسم ہم اس بیعت کو نہ چھوڑ سکتے ہیں اور نہ توڑ سکتے ہیں۔"[۸]

---

[۶] ایضاً ۱/۴۴۶ [۷] مسند احمد [۸] ایضاً

اس جواب سے حضرت اسعدؓ کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ قوم کس حد تک اس راہ میں جان دینے کے لیے تیار ہے ـــــ درحقیقت حضرت اسعدؓ بن زُرارہ حضرت مُصعبؓ بن عُمیرؓ کے ساتھ مل کر مدینے میں اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تھے، اس لیے طبعی طور پر وہی ان بیعت کنندگان کے دینی سربراہ بھی تھے اور اسی لیے سب سے پہلے انہیں نے بیعت بھی کی۔ چنانچہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے۔ کہ بنو النجار کہتے ہیں کہ ابو امامہ اسعدؓ بن زرارہ سب سے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ سے ہاتھ ملایا[۹] اور اس کے بعد بیعتِ عامہ ہوئی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک ایک آدمی کر کے اُٹھے اور آپ ﷺ نے ہم سے بیعت لی اور اس کے عوض جنّت کی بشارت دی۔[۱۰]

باقی رہیں دو عورتیں جو اس موقعے پر حاضر تھیں تو ان کی بیعت صرف زبانی ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی اجنبی عورت سے مصافحہ نہیں کیا۔[۱۱]

بارہ نقیب

بیعت مکمل ہو چکی تو رسول اللہ ﷺ نے یہ تجویز رکھی کہ بارہ سربراہ منتخب کر لیے جائیں جو اپنی اپنی قوم کے نقیب ہوں اور اس بیعت کی دفعات پر عملدرآمد کے لیے اپنی قوم کی طرف سے وہی ذمے دار اور مکلف ہوں۔ آپ کا ارشاد تھا کہ آپ لوگ اپنے اندر سے بارہ نقیب پیش کیجیے تاکہ وہی لوگ اپنی اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں۔ آپؐ کے اس ارشاد پر فوراً ہی نقیبوں کا انتخاب عمل میں آگیا۔ نو خزرج سے منتخب کیے گئے اور تین اوس سے۔ نام یہ ہیں:۔

خزرج کے نُقباء:

۱۔ اسعدؓ بن زرارہ بن عدس
۲۔ سعدؓ بن ربیع بن عمرو
۳۔ عبداللہؓ بن رواحہ بن ثعلبہ
۴۔ رافعؓ بن مالک بن عجلان
۵۔ براءؓ بن معرور بن صخر
۶۔ عبداللہؓ بن عمرو بن حرام
۷۔ عبادہؓ بن صامت بن قیس
۸۔ سعدؓ بن عُبادہ بن دلیم

---

[۹] ابنِ اسحاق کا یہ بھی بیان ہے کہ بنو عبد الاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ابو الہیثم بن تیہان نے بیعت کی اور حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ براءؓ بن معرور نے کی (ابن ہشام ۱/۴۴۷)۔ راقم کا خیال ہے کہ ممکن ہے بیعت سے پہلے نبی ﷺ سے حضرت ابو الہیثم اور براء کی جو گفتگو ہوئی تھی۔ لوگوں نے اسی کو بیعت شمار کر لیا ہو ورنہ اس وقت آگے بڑھائے جانے کے سب سے زیادہ حقدار حضرت اسعدؓ بن زرارہ ہی تھے۔ واللہ اعلم

[۱۰] مسند احمد [۱۱] دیکھیے صحیح مسلم باب کیفیۃ بیعۃ النساء ۲/۱۳۱

۹۔ مُنذِرؓ بن عَمرو بن خنیس

اَوس کے نُقَباء!

۱۔ اُسَیدؓ بن حُضَیر بن سماک ۲۔ سعدؓ بن خیثمہ بن حارث

۳۔ رِفاعہؓ بن عبدالمنذر بن زبیر[۱۲]

جب ان نقباء کا انتخاب ہو چکا تو ان سے سردار اور ذمے دار ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ نے ایک اور عہد لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "آپ لوگ اپنی قوم کے جملہ معاملات کے کفیل ہیں۔ جیسے حواری حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی جانب سے کفیل ہوئے تھے اور میں اپنی قوم یعنی مسلمانوں کا کفیل ہوں"۔ ان سب نے کہا، جی ہاں۔[۱۳]

شیطان مُعاہدہ کا انکشاف کرتا ہے

معاہدہ مکمل ہو چکا تھا اور اب لوگ بکھرنے ہی والے تھے کہ ایک شیطان کو اس کا پتا لگ گیا۔ چونکہ یہ انکشاف بالکل آخری لمحات میں ہُوا تھا اور اتنا موقع نہ تھا کہ یہ خبر چپکے سے قریش کو پہنچا دی جائے، اور وہ اچانک اس اجتماع کے شرکاء پر ٹوٹ پڑیں اور انہیں گھاٹی ہی میں جا لیں اس لیے اس شیطان نے جھٹ ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر نہایت بلند آواز سے، جو شاید ہی کبھی سُنی گئی ہو، یہ پکار لگائی: "خیمے والو! محمد (ﷺ) کو دیکھو۔ اس وقت بددین اس کے ساتھ ہیں اور تم سے لڑنے کے لیے جمع ہیں"۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ اس گھاٹی کا شیطان ہے اور اللہ کے دشمن! سُن، اب میں تیرے لیے جلد ہی فارغ ہو رہا ہوں"۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ وہ اپنے ڈیروں پر چلے جائیں۔[۱۴]

قریش پر ضرب لگانے کے لیے انصار کی مستعدی

اس شیطان کی آواز سُن کر حضرت عباسؓ بن عبادہ بن نضلہ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ آپؐ چاہیں تو ہم کل اہل منیٰ

---

[۱۲] زبیر، حرف ب سے۔ بعض لوگوں نے ب کی جگہ ن کہا ہے یعنی زنیر۔ بعض اہل سیر نے رفاعہ کے بدلے ابو الہیثم بن تیہان کا نام درج کیا ہے۔

[۱۳] ابن ہشام ۱/۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۶ [۱۴] زاد المعاد ۲/۵۱

پر اپنی تلواروں کے ساتھ ٹوٹ پڑیں"۔ آپ نے فرمایا "ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے بس آپ لوگ اپنے ڈیروں میں چلے جائیں"۔ اس کے بعد لوگ واپس جا کر سو گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔[۱۵]

روسائے یثرب سے قریش کا احتجاج

یہ خبر قریش کے کانوں تک پہنچی تو غم و الم کی شدت سے ان کے اندر کہرام مچ گیا کیونکہ اس جیسی بیعت کے جو نتائج ان کی جان و مال پر مرتب ہو سکتے تھے اس کا انہیں اچھی طرح اندازہ تھا؛ چنانچہ صبح ہوتے ہی ان کے روسا اور اکابر مجرمین کے ایک بھاری بھرکم وفد نے اس معاہدے کے خلاف سخت احتجاج کے لیے اہل یثرب کے خیموں کا رُخ کیا، اور یوں عرض پرداز ہُوا:

"خزرج کے لوگو! ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ آپ لوگ ہمارے اس صاحب کو ہمارے درمیان سے نکال لے جانے کے لیے آئے ہیں اور ہم سے جنگ کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں حالانکہ کوئی عرب قبیلہ ایسا نہیں جس سے جنگ کرنا ہمارے لیے اتنا زیادہ ناگوار ہو جتنا آپ حضرات سے ہے۔"[۱۶]

لیکن چونکہ مشرکین خزرج اس بیعت کے بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ کیونکہ یہ مکمل رازداری کے ساتھ رات کی تاریکی میں زیر عمل آئی تھی اس لیے ان مشرکین نے اللہ کی قسم کھا کھا کر یقین دلایا کہ ایسا کچھ ہُوا ہی نہیں ہے، ہم اس طرح کی کوئی بات سرے سے جانتے ہی نہیں۔ بالآخر یہ وفد عبداللہ بن اُبَیّ ابن سلول کے پاس پہنچا۔ وہ بھی کہنے لگا: "یہ باطل ہے۔ ایسا نہیں ہُوا ہے، اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میری قوم مجھے چھوڑ کر اس طرح کا کام کر ڈالے۔ اگر میں یثرب میں ہوتا تو بھی مجھ سے مشورہ کئے بغیر میری قوم ایسا نہ کرتی۔"

باقی رہے مسلمان تو انہوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ سادھ لی۔ ان میں سے کسی نے ہاں یا نہیں کے ساتھ زبان ہی نہیں کھولی۔ آخر روسائے قریش کا رجحان یہ رہا کہ مشرکین کی بات سچ ہے اس لیے وہ نامراد واپس چلے گئے۔

خبر کا یقین اور بیعت کرنے والوں کا تعاقب

روسائے مکہ تقریباً اس یقین کے ساتھ پلٹے تھے کہ یہ خبر غلط ہے لیکن اس کی کرید میں وہ برابر لگے رہے۔ بالآخر انہیں یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ خبر صحیح ہے اور بیعت ہو چکی ہے۔ لیکن یہ پتا اس وقت چلا جب

---

[۱۵] ابن ہشام ۱/۴۴۸ [۱۶] ایضاً ۱/۴۴۸

حُجّاج اپنے اپنے وطن روانہ ہو چکے تھے، اس لیے ان کے سواروں نے تیز رفتاری سے اہلِ یثرب کا پیچھا کیا لیکن موقع نکل چکا تھا، البتہ انہوں نے سعدؓ بن عبادہ اور مُنذرؓ بن عمرو کو دیکھ لیا اور انہیں جا کھدیڑا لیکن مُنذرؓ زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئے اور نکل بھاگے البتہ سعدؓ بن عبادہ پکڑ لیے گئے اور ان کا ہاتھ گردن کے پیچھے انہیں کے کجاوے کی رسّی سے باندھ دیا گیا، پھر انہیں مارتے پیٹتے اور بال نوچتے ہوئے مکّہ لے جایا گیا، لیکن وہاں مطعم بن عدی اور حارث بن حرب بن امیہ نے آکر چھڑا دیا کیونکہ ان دونوں کے جو قافلے مدینے سے گزرتے تھے وہ حضرت سعدؓ ہی کی پناہ میں گزرتے تھے۔ ادھر انصار ان کی گرفتاری کے بعد باہم مشورہ کر رہے تھے کہ کیوں نہ دھاوا بول دیا جائے مگر اتنے میں وہ دکھائی پڑ گئے۔ اس کے بعد تمام لوگ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔[۱۷]

یہی عقبہ کی دوسری بیعت ہے جسے بیعتِ عقبۂ کبریٰ کہا جاتا ہے۔ یہ بیعت ایک ایسی فضا میں زیرِ عمل آئی جس پر محبت و وفاداری، منتشر اہلِ ایمان کے درمیان تعاون و تناصر، باہمی اعتماد، اور جاں سپاری و شجاعت کے جذبات چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ یثربی اہلِ ایمان کے دل اپنے کمزور مکّی بھائیوں کی شفقت سے لبریز تھے۔ ان کے اندر ان بھائیوں کی حمایت کا جوش تھا اور ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف غم و غصّہ تھا۔ ان کے سینے اپنے اس بھائی کی محبت سے سرشار تھے جسے دیکھے بغیر محض للہ فی اللہ اپنا بھائی قرار دے لیا تھا۔

اور یہ جذبات و احساسات محض کسی عارضی کشش کا نتیجہ نہ تھے جو دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کا منبع ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب تھا۔ یعنی وہ ایمان جو ظلم و عدوان کی کسی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتا، وہ ایمان کہ جب اس کی بادِ بہاری چلتی ہے تو عقیدہ و عمل میں عجائبات کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی ایمان کی بدولت مسلمانوں نے صفحاتِ زمانہ پر ایسے ایسے کارنامے ثبت کیے اور ایسے ایسے آثار و نشانات چھوڑے کہ ان کی نظیر سے ماضی و حاضر خالی ہیں۔ اور غالباً مستقبل بھی خالی ہی رہے گا۔

○

---

[۱۷] زاد المعاد ۲/۵۱، ۵۲۔ ابن ہشام ۱/۴۴۸ - ۴۵۰

ہجرت کے ہراول دستے

جب دوسری بیعتِ عقبہ مکمل ہوگئی۔ اسلام، کفر و جہالت کے لق و دق صحرا میں اپنے ایک وطن کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوگیا ـــــ اور یہ سب سے اہم کامیابی تھی جو اسلام نے اپنی دعوت کے آغاز سے اب تک حاصل کی تھی ـــــ تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ اپنے اس نئے وطن کی طرف ہجرت کر جائیں۔

ہجرت کے معنی یہ تھے کہ سارے مفادات تج کر اور مال کی قربانی دے کر محض جان بچالی جائے اور وہ بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ جان بھی خطرے کی زد میں ہے۔ ابتدائے راہ سے انتہائے راہ تک کہیں بھی ہلاک کی جاسکتی ہے۔ پھر سفر بھی ایک مبہم مستقبل کی طرف ہے۔ معلوم نہیں آگے چل کر ابھی کون کون سے مصائب اور غم و الم رُونما ہوں گے۔

مسلمانوں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے ہجرت کی ابتداء کر دی۔ ادھر مشرکین نے بھی ان کی روانگی میں رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کیں کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس میں خطرات مضمر ہیں۔ ہجرت کے چند نمونے پیشِ خدمت ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے مہاجر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے ابنِ اسحاق کے بقول بیعتِ عقبہ کبریٰ سے ایک سال پہلے ہجرت کی تھی، ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ جب انہوں نے روانہ ہونا چاہا تو ان کے سسرال والوں نے کہا کہ یہ رہی آپ کی بیگم۔ اسکے متعلق تو آپ ہم پر غالب آگئے۔ لیکن یہ بتایئے کہ یہ ہمارے گھر کی لڑکی آخر کس بنا پر ہم آپ کو چھوڑ دیں کہ آپ اسے شہر شہر گھماتے پھریں؟ چنانچہ انہوں نے ان سے ان کی بیوی چھین لی۔ اس پر ابوسلمہ کے گھر والوں کو تاؤ آگیا اور انہوں نے کہا کہ جب تم لوگوں نے اس عورت کو ہمارے آدمی سے چھین لیا تو ہم اپنا بیٹا اس عورت کے پاس نہیں رہنے دے سکتے۔ چنانچہ دونوں فریق نے اس بچے کو اپنی اپنی طرف کھینچا جس سے اس کا ہاتھ اکھڑ گیا۔ اور ابوسلمہؓ کے گھر والے اس کو اپنے پاس لے گئے۔ خلاصہ یہ کہ ابوسلمہؓ نے تنہا مدینہ کا سفر کیا۔ اس کے بعد حضرت ام سلمہؓ کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی روانگی اور اپنے بچے سے محرومی کے

بعد روزانہ صبح صبح ابطح پہنچ جاتیں۔ (جہاں یہ ماجرا پیش آیا تھا) اور شام تک روتی رہتیں۔ اسی حالت میں ایک سال گذر گیا۔ بالآخر ان کے گھرانے کے کسی آدمی کو ترس آگیا اور اُس نے کہا کہ اس بیچاری کو جانے کیوں نہیں دیتے؟ اسے خواہ مخواہ اس کے شوہر اور بیٹے سے جُدا کر رکھا ہے۔ اس پر اُمِ سلمہؓ سے ان کے گھر والوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ۔ حضرت اُمِ سلمہؓ نے بیٹے کو اس کے ددھیال والوں سے واپس لیا اور مدینہ چل پڑیں۔ اللہ اکبر! کوئی پانچ سو کیلومیٹر کی مسافت کا سفر اور ساتھ میں اللہ کی کوئی مخلوق نہیں؛ جب تنعیم پہنچیں تو عثمان بن ابی طلحہ مل گیا۔ اسے حالات کی تفصیل معلوم ہوئی تو مشایعت کرتا ہُوا مدینہ پہنچانے لے گیا اور جب قُبَاء کی آبادی نظر آئی تو بولا "تمہارا شوہر اسی بستی میں ہے اسی میں چلی جاؤ اللہ برکت دے۔" اس کے بعد وہ مکہ پلٹ آیا۔[1]

۲۔ حضرت صُہَیبؓ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو ان سے کفارِ قریش نے کہا: "تم ہمارے پاس آئے تھے تو حقیر و فقیر تھے۔ لیکن یہاں آکر تمہارا مال بہت زیادہ ہو گیا اور تم بہت آگے پہنچ گئے۔ اب تم چاہتے ہو کہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں لے کر چل دو تو بخدا ایسا نہیں ہو سکتا۔" حضرت صہیبؓ نے کہا: "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنا مال چھوڑ دوں تو تم میری راہ چھوڑ دو گے؟" انہوں نے کہا ہاں حضرت صہیبؓ نے کہا اچھا تو پھر ٹھیک ہے، چلو میرا مال تمہارے حوالے ـــــ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہُوا تو آپ نے فرمایا: "صہیبؓ نے نفع اٹھایا۔ صہیبؓ نے نفع اٹھایا۔"[2]

(۳) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، عیّاش بن ابی ربیعہ اور ہشامؓ بن عاص بن وائل نے آپس میں طے کیا کہ فلاں جگہ صبح صبح اکٹھے ہو کر وہیں سے مدینہ کو ہجرت کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ اور عیّاشؓ تو وقتِ مقررہ پر آگئے لیکن ہشامؓ کو قید کر لیا گیا۔

پھر جب یہ دونوں حضرات مدینہ پہنچ کر قُبَا میں اُتر چکے تو عیّاشؓ کے پاس ابوجہل اور اس کا بھائی حارث پہنچے۔ تینوں کی ماں ایک تھی۔ ان دونوں نے عیّاشؓ سے کہا "تمہاری ماں نے نذر مانی ہے کہ جب تک وہ تمہیں دیکھ نہ لے گی سر میں کنگھی نہ کرے گی اور دھوپ چھوڑ کر سائے میں نہ آئے گی۔" یہ سُن کر عیّاشؓ کو اپنی ماں پر ترس آگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کیفیت دیکھ کر عیّاشؓ سے کہا: "عیّاشؓ! دیکھو خدا کی قسم یہ لوگ تم کو محض تمہارے دین سے فتنے میں ڈالنا چاہتے ہیں؛ لہٰذا ان سے ہوشیار رہو خدا کی قسم اگر تمہاری ماں کو جوؤں نے اذیت پہنچائی تو وہ کنگھی کرے گی اور اسے مکہ کی ذرا کڑی دھوپ

---

[1] ابن ہشام ۱/۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰ [2] ایضاً ۱/۴۷۷

لگی تو وہ سائے میں چلی جائے گی" مگر عیاشؓ نہ مانے انہوں نے اپنی ماں کی قسم پوری کرنے کے لیے ان دونوں کے ہمراہ نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اچھا جب یہی کرنے پر آمادہ ہو تو میری یہ اونٹنی لے لو۔ یہ بڑی عمدہ اور تیز رو ہے۔ اس کی پیٹھ نہ چھوڑنا اور لوگوں کی طرف سے کوئی مشکوک حرکت ہو تو نکل بھاگنا۔"

عیاشؓ اونٹنی پر سوار ان دونوں کے ہمراہ نکل پڑے۔ راستے میں ایک جگہ ابوجہل نے کہا: "بھئی میرا یہ اونٹ تو بڑا سخت نکلا، کیوں نہ تم مجھے بھی اپنی اس اونٹنی پر پیچھے بٹھا لو" عیاش نے کہا، ٹھیک ہے۔ اور اس کے بعد اونٹنی بٹھا دی۔ ان دونوں نے بھی اپنی اپنی سواریاں بٹھائیں تاکہ ابوجہل عیاشؓ کی اونٹنی پر پلٹ آئے، لیکن جب تینوں زمین پر آ گئے تو یہ دونوں اچانک عیاشؓ پر ٹوٹ پڑے اور انہیں رسی سے جکڑ کر باندھ دیا اور اسی بندھی ہوئی حالت میں دن کے وقت مکہ لائے اور کہا کہ اے اہل مکہ! اپنے بیوقوفوں کے ساتھ ایسا ہی کرو جیسا ہم نے اپنے اس بیوقوف کے ساتھ کیا ہے۔[۳]

عازمین ہجرت کا علم ہو جانے کی صورت میں ان کے ساتھ مشرکین جو سلوک کرتے تھے اس کے یہ تین نمونے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود لوگ آگے پیچھے پے در پے نکلتے ہی رہے چنانچہ بیعت عقبہ کبریٰ کے صرف دو ماہ چند دن بعد مکہ میں رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے علاوہ کچھ ایسے مسلمان ضرور رہ گئے تھے جنہیں مشرکین نے زبردستی روک رکھا تھا۔ ان دونوں حضرات (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ) کو بھی رسول اللہ ﷺ نے روک رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنا ساز و سامان تیار کر کے روانگی کے لیے حکم خداوندی کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رخت سفر بھی بندھا ہوا تھا۔[۴]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں

---

[۳] ہشامؓ اور عیاشؓ کفار کی قید میں پڑے رہے۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما چکے تو آپ نے ایک روز کہا، کون ہے جو میرے لیے ہشامؓ اور عیاشؓ کو چھڑا لائے۔ ولیدؓ بن ولید نے کہا میں آپ کے لیے ان کو لانے کا ذمہ دار ہوں۔ پھر ولیدؓ خفیہ طور پر مکہ گئے اور ایک عورت نے جو ان دونوں کے پاس کھانا لے جا رہی تھی، اس کے پیچھے پیچھے جا کر ان کا ٹھکانا معلوم کیا۔ یہ دونوں ایک بغیر چھت کے مکان میں قید تھے۔ رات ہوئی تو حضرت ولیدؓ دیوار پھلانگ کر ان دونوں کے پاس پہنچے اور بیڑیاں کاٹ کر اپنے اونٹ پر بٹھایا اور مدینہ بھاگ آئے۔ ابن ہشام ۱/ ۴۷۴ - ۴۷۶ - اور حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ نے بیس صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ صحیح بخاری ۱/ ۵۵۸

[۴] زاد المعاد ۲/ ۵۲

سے فرمایا: "مجھے تمہارا مقامِ ہجرت دکھلایا گیا ہے۔ یہ لاوے کی دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ایک نخلستانی علاقہ ہے۔" اس کے بعد لوگوں نے مدینے کی جانب ہجرت کی۔ عام مہاجرین حبشہ بھی مدینہ ہی آ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی سفرِ مدینہ کے لیے ساز و سامان تیار کر لیا۔ (لیکن) رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: "ذرا رُکے رہو کیونکہ توقع ہے مجھے بھی اجازت دے دی جائے گی۔" ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا "میرے باپ آپؐ پر فدا کیا آپؐ کو اس کی امید ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں۔" اسکے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ رُکے رہے۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کریں۔ ان کے پاس دو اونٹنیاں تھیں۔ انھیں بھی چار ماہ تک ببول کے پتوں کا خوب چارہ کھلایا۔ [۵]

○

---

[۵] صحیح البخاری۔ باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ ۱/۵۵۳

قریش کی پارلیمنٹ، دارالندوہ میں

جب مشرکین نے دیکھا کہ صحابہ کرامؓ تیار ہو ہو کر نکل گئے اور بال بچوں اور مال و دولت کو لاد پھاند کر اوس و خزرج کے علاقے میں جا پہنچے تو ان میں بڑا کہرام مچا۔ غم و الم کے لاوے پھوٹ پڑے اور انہیں ایسا رنج و قلق ہوا کہ اس سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ اب ان کے سامنے ایک ایسا عظیم اور حقیقی خطرہ مجسم ہو چکا تھا جو ان کی بت پرستانہ اور اقتصادی اجتماعیت کے لیے چیلنج تھا۔

مشرکین کو معلوم تھا کہ محمد ﷺ کے اندر کمال قیادت و رہنمائی کے ساتھ ساتھ کس قدر انتہائی درجہ قوتِ تاثیر موجود ہے اور آپ ﷺ کے صحابہؓ میں کیسی عزیمت و استقامت اور کیسا جذبۂ فداکاری پایا جاتا ہے۔ پھر اوس و خزرج کے قبائل میں کس قدر قوت و قدرت اور جنگی صلاحیت ہے۔ اور ان دونوں قبائل کے عقلاء میں صلح و صفائی کے کیسے جذبات ہیں۔ اور وہ کئی برس تک خانہ جنگی کی تلخیاں چکھنے کے بعد اب باہمی رنج و عداوت کو ختم کرنے پر کس قدر آمادہ ہیں۔

انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ یمن سے شام تک بحر احمر کے ساحل سے ان کی جو تجارتی شاہراہ گذرتی ہے۔ اس شاہراہ کے اعتبار سے مدینہ فوجی اہمیت کے کس قدر حساس اور نازک مقام پر واقع ہے۔ دراں حالیکہ ملک شام سے صرف مکہ والوں کی سالانہ تجارت ڈھائی لاکھ دینار سونے کے تناسب سے ہوا کرتی تھی۔ اہل طائف وغیرہ کی تجارت اسکے علاوہ تھی اور معلوم ہے کہ اس تجارت کا سارا دارومدار اس پر تھا کہ یہ راستہ پُرامن رہے۔

ان تفصیلات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یثرب میں اسلامی دعوت کے جڑ پکڑنے اور اہل مکہ کے خلاف اہل یثرب کے صف آرا ہونے کی صورت میں مکے والوں کے لیے کتنے خطرات تھے۔ چونکہ مشرکین کو اس گمبھیر خطرے کا پورا پورا احساس تھا جو ان کے وجود کے لیے چیلنج بن رہا تھا اس لیے انہوں نے اس خطرے کا کامیاب ترین علاج سوچنا شروع کیا۔ اور معلوم ہے کہ اس خطرے کی اصل بنیاد دعوتِ اسلام کے علمبردار حضرت محمد ﷺ ہی تھے۔

مشرکین نے اس مقصد کے لیے بیعتِ عقبۂ کبریٰ کے تقریباً ڈھائی مہینہ بعد ۲۶ صفر ۱۴ سنہ نبوت مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء یوم جمعرات[1] کو دن کے پہلے پہر مکے کی پارلیمنٹ دارالندوہ میں تاریخ کا سب سے خطرناک

[1] / [1] نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے۔

اجتماع منعقد کیا۔ اور اس میں قریش کے تمام قبائل کے نمائندوں نے شرکت کی۔ موضوع بحث ایک ایسے قطعی پلان کی تیاری تھی جس کے مطابق اسلامی دعوت کے علمبردار کا قصہ بہ عجلت تمام پاک کر دیا جائے اور اس دعوت کی روشنی کلی طور پر مٹا دی جائے۔

اس خطرناک اجتماع میں قبائل قریش کے نمایاں چہرے یہ تھے:

۱۔ ابوجہل بن ہشام — قبیلۂ بنی مخزوم سے۔

۲۔ جبیر بن مطعم، طعیمہ بن عدی اور حارث بن عامر، — بنی نوفل بن عبد مناف سے

۳۔ شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب، — بنی عبد شمس بن عبد مناف سے

۴۔ نضر بن حارث، — بنی عبد الدار سے۔

۵۔ ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود اور حکیم بن حزام — بنی اسد بن عبد العزیٰ سے

۶۔ نبیہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج — بنی سہم سے

۷۔ امیہ بن خلف — بنی جمح سے

وقتِ مقررہ پر یہ نمائندگان دار الندوہ پہنچے تو ابلیس بھی ایک شیخ جلیل کی صورت، عبا اوڑھے، راستہ روکے، دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ لوگوں نے کہا یہ کون سے شیخ ہیں؟ ابلیس نے کہا "یہ اہل نجد کا ایک شیخ ہے۔ آپ لوگوں کا پروگرام سن کر حاضر ہو گیا ہے۔ باتیں سننا چاہتا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ آپ لوگوں کو خیر خواہانہ مشورے سے بھی محروم نہ رکھے"۔ لوگوں نے کہا "بہتر ہے آپ بھی آجائیے"؛ چنانچہ ابلیس بھی ان کے ساتھ اندر گیا۔

پارلیمانی بحث اور نبی ﷺ کے قتل کی ظالمانہ قرارداد پر اتفاق

اجتماع مکمل ہو گیا تو تجاویز اور حل پیش کیے جانے شروع ہوئے اور دیر تک بحث جاری رہی۔ پہلے ابوالاسود نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم اس شخص کو اپنے درمیان سے نکال دیں اور اپنے شہر سے جلاوطن کر دیں۔ پھر ہمیں اس سے

(انوث گوشہ صفحہ)

لہ یہ تاریخ علامہ منصور پوری کی دیگر کردہ تحقیقات کی روشنی میں متعین کی گئی ہے۔ رحمۃ للعالمین ۱/۹۵، ۹۷، ۱۰۲۔ ۲/۴۷۱

لہ پہلے پہر اس اجتماع کے منعقد ہونے کی دلیل ابن اسحاق کی وہ روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت جبریلؑ نبی ﷺ کی خدمت میں اس اجتماع کی خبر لے کر آئے اور آپ کو ہجرت کی اجازت دی۔ اس کے ساتھ صحیح بخاری میں مروی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کو ملا لیجئے کہ نبی ﷺ ٹھیک دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے۔ اور فرمایا "مجھے روانگی کی اجازت دے دی گئی ہے"۔ روایت بہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

کوئی واسطہ نہیں کہ وہ کہاں جاتا اور کہاں رہتا ہے۔ بس ہمارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہمارے درمیان پہلے جیسی یگانگت ہو جائے گی۔

مگر شیخ نجدی نے کہا: "نہیں۔ خدا کی قسم یہ مناسب رائے نہیں ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس شخص کی بات کتنی عمدہ اور بول کتنے میٹھے ہیں اور جو کچھ لاتا ہے اس کے ذریعے کس طرح لوگوں کا دل جیت لیتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم نے ایسا کیا تو کچھ اطمینان نہیں کہ وہ عرب کے کسی قبیلے میں نازل ہو اور انہیں اپنا پیرو بنا لینے کے بعد تم پر یورش کر دے اور تمہیں تمہارے شہر کے اندر روند کر تم سے جیسا سلوک چاہے کرے۔ اسکے بجائے کوئی اور تجویز سوچو۔"

ابو البختری نے کہا: "اسے لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر قید کر دو اور باہر سے دروازہ بند کر دو پھر اسی انجام (موت) کا انتظار کرو جو اس سے پہلے دوسرے شاعروں مثلاً زُہَیر اور نابغہ وغیرہ کا ہو چکا ہے۔"

شیخ نجدی نے کہا: "نہیں خدا کی قسم یہ بھی مناسب رائے نہیں ہے۔ واللہ اگر تم لوگوں نے اسے قید کر دیا جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو اس کی خبر بند دروازے سے باہر نکل کر اس کے ساتھیوں تک ضرور پہنچ جائے گی۔ پھر کچھ بعید نہیں کہ وہ لوگ تم پر دھاوا بول کر اس شخص کو تمہارے قبضے سے نکال لے جائیں۔ پھر اس کی مدد سے اپنی تعداد بڑھا کر تمہیں مغلوب کر لیں ـــــ لہٰذا یہ بھی مناسب رائے نہیں۔ کوئی اور تجویز سوچو!"

یہ دونوں تجاویز پارلیمنٹ رد کر چکی تو ایک تیسری مجرمانہ تجویز پیش کی گئی جس سے تمام ممبران نے اتفاق کیا۔ اسے پیش کرنے والا مکے کا سب سے بڑا مجرم ابوجہل تھا۔ اس نے کہا: "اس شخص کے بارے میں میری ایک رائے ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب تک تم لوگ اس پر نہیں پہنچے" لوگوں نے کہا: "ابوالحکم وہ کیا ہے؟" ابوجہل نے کہا: "میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر ہر قبیلے سے ایک مضبوط، صاحبِ نسب اور بانکا جوان منتخب کر لیں، پھر ہر ایک کو ایک تیز تلوار دیں۔ اس کے بعد سب کے سب اس شخص کا رُخ کریں اور اس طرح یکبارگی تلوار مار کر قتل کر دیں جیسے ایک ہی آدمی نے تلوار ماری ہو۔ یوں ہمیں اس شخص سے راحت مل جائے گی اور اس طرح قتل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شخص کا خون سارے قبائل میں بکھر جائے گا اور بنو عبد مناف سارے قبیلوں سے جنگ نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا دیت (خون بہا) لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم دیت ادا کر دیں گے۔"[1]

شیخ نجدی نے کہا: "بات یہ رہی جو اس جوان نے کہی۔ اگر کوئی تجویز اور رائے ہو سکتی ہے تو یہی ہے، باقی سب ہیچ۔"

اس کے بعد پارلیمانِ مکہ نے اس مجرمانہ قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ اور ممبران اس عزمِ مصمم کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس گئے کہ اس قرارداد پر عمل فی الفور کرنا ہے۔

---

[1] ابن ہشام ۱/ ۴۸۰ - ۴۸۲ -

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت

جب نبی ﷺ کے قتل کی مجرمانہ قرارداد طے ہو چکی تو حضرت جبریل علیہ السلام اپنے رب تبارک و تعالیٰ کی وحی لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو قریش کی سازش سے آگاہ کرتے ہوئے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہاں سے روانگی کی اجازت دے دی ہے اور یہ کہتے ہوئے ہجرت کے وقت کا تعین بھی فرما دیا کہ آپ ﷺ یہ رات اپنے اُس بستر پر نہ گذاریں جس پر اب تک گذارا کرتے تھے [1]

اس اطلاع کے بعد نبی ﷺ ٹھیک دوپہر کے وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے تاکہ ان کے ساتھ ہجرت کے سارے پروگرام اور مرحلے طے فرمالیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت ہم لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مکان میں بیٹھے تھے کہ کسی کہنے والے نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا "یہ رسول اللہ ﷺ سر ڈھانکے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ ایسا وقت تھا جس میں آپ ﷺ تشریف نہیں لایا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے کہا" میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ ﷺ اس وقت کسی اہم معاملے ہی کی وجہ سے تشریف لاتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اجازت طلب کی۔ آپؐ کو اجازت دی گئی اور آپ ﷺ اندر داخل ہوئے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا "تمہارے پاس جو لوگ ہیں انہیں ہٹا دو"۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "بس آپؐ کی اہلِ خانہ ہی ہیں آپ ﷺ پر میرے باپ فدا ہوں اے اللہ کے رسول!" (ﷺ) آپ نے فرمایا: "اچھا تو مجھے روانگی کی اجازت مل چکی ہے"۔ ابوبکرؓ نے کہا "ساتھ..... اے اللہ کے رسولؐ! میرے باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہاں" [2]

اس کے بعد ہجرت کا پروگرام طے کر کے رسول اللہ ﷺ اپنے گھر واپس تشریف لائے اور رات کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

---

[1] ابن ہشام ۱/۴۸۲، زاد المعاد ۲/۵۲ [2] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی ﷺ ۱/۵۵۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا گھیراؤ

ادھر قریش کے اکابر مجرمین نے اپنا سارا دن مکے کی پارلیمان دار الندوہ کی پہلے پہر کی طے کردہ قرارداد کے نفاذ کی تیاری میں گذارا اور اس مقصد کے لیے ان اکابر مجرمین میں سے گیارہ سردار منتخب کیے — جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ابوجہل بن ہشام
۲۔ حکم بن عاص
۳۔ عُقبہ بن ابی مُعَیط
۴۔ نضر بن حارث
۵۔ اُمیّہ بن خلف
۶۔ زَمعہ بن الاسود
۷۔ طُعَیمہ بن عدی
۸۔ ابولہب
۹۔ اُبَیّ بن خلف
۱۰۔ نُبَیہ بن الحجاج
۱۱۔ اور اس کا بھائی مُنَبِّہ بن الحجاج [۳]

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب رات ذرا تاریک ہوگئی تو یہ لوگ گھات لگا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر بیٹھ گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو جائیں تو یہ لوگ آپ پر ٹوٹ پڑیں۔ [۴]

ان لوگوں کو پورا وثوق اور پختہ یقین تھا کہ ان کی یہ ناپاک سازش کامیاب ہو کر رہے گی یہاں تک کہ ابوجہل نے بڑے متکبرانہ اور پُرغرور انداز میں مذاق و استہزاء کرتے ہوئے اپنے گھیرا ڈالنے والے ساتھیوں سے کہا: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ اگر تم لوگ اس کے دین میں داخل ہو کر اس کی پیروی کرو گے تو عرب و عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے، پھر مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو تمہارے لیے اردن کے باغات جیسی جنتیں ہوں گی۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ان کی طرف سے تمہارے اندر ذبح کے واقعات پیش آئیں گے۔ پھر تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے اور تمہارے لیے آگ ہوگی جس میں جلائے جاؤ گے۔" [۵]

بہرحال اس سازش کے نفاذ کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت مقرر تھا اس لیے یہ لوگ جاگ کر رات گذار رہے تھے اور وقتِ مقررہ کے منتظر تھے، لیکن اللہ اپنے کام پر غالب ہے، اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جسے بچانا چاہے کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا اور جسے پکڑنا چاہے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

---

[۳] زاد المعاد ۲/۵۲ [۴] ابن ہشام ۱/۴۸۲ [۵] ایضاً ۱/۴۸۳

اس موقع پر وہ کام کیا جسے ذیل کی آیتِ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے کہ

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ (۸:۳۰)

"وہ موقع یاد کرو جب کفار تمہارے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ تمہیں قید کر دیں یا قتل کر دیں یا نکال باہر کریں اور وہ لوگ داؤ چل رہے تھے اور اللہ بھی داؤ چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر داؤ والا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا گھر چھوڑتے ہیں

بہرحال قریش اپنے پلان کے نفاذ کی انتہائی تیاری کے باوجود فاش ناکامی سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ اس نازک ترین لمحے میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ اور میری یہ سبز حضرمی[1] چادر اوڑھ کر سو رہو۔ تمہیں ان کے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔" رسول اللہ ﷺ یہی چادر اوڑھ کر سویا کرتے تھے۔[2]

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے آئے۔ مشرکین کی صفیں چیریں اور ایک مٹھی سنگریزوں والی مٹی لے کر ان کے سروں پر ڈالی لیکن اللہ نے ان کی نگاہیں پکڑ لیں اور وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ سکے۔ اس وقت آپؐ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ○ (۳۶:۹)

"ہم نے ان کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دی اور ان کے پیچھے رکاوٹ کھڑی کر دی پس ہم نے انہیں ڈھانک لیا ہے اور وہ دیکھ نہیں رہے ہیں۔"

اس موقع پر کوئی بھی مشرک باقی نہ بچا جس کے سر پر آپ ﷺ نے مٹی نہ ڈالی ہو۔ اس کے بعد آپؐ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور پھر ان کے مکان کی ایک کھڑکی سے نکل کر دونوں حضرات نے رات ہی رات یمن کا رخ کیا اور چند میل پر واقع ثور نامی پہاڑ کے ایک غار میں جا پہنچے۔[3]

---

[1] حضرموت (جنوبی یمن) کی بنی ہوئی چادر حضرمی کہلاتی ہے۔

[2] ابن ہشام ۱/۴۸۲، ۴۸۳ [3] ایضاً ۱/۴۸۳۔ زاد المعاد ۲/۵۲

ادھر محاصرین وقتِ صفر کا انتظار کر رہے تھے لیکن اس سے ذرا پہلے انہیں اپنی ناکامی و نامرادی کا علم ہو گیا۔ ہُوا یہ کہ ان کے پاس ایک غیر متعلق شخص آیا اور انہیں آپ ﷺ کے دروازے پر دیکھ کر پوچھا کہ آپ لوگ کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا محمد (ﷺ) کا۔ اس نے کہا، آپ لوگ ناکام و نامراد ہوئے۔ خدا کی قسم! محمد (ﷺ) تو آپ لوگوں کے پاس سے گذرے اور آپ کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے اپنے کام کو گئے۔ انہوں نے کہا، بخدا! ہم نے تو انہیں نہیں دیکھا اور اس کے بعد اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اُٹھ پڑے۔

لیکن پھر دروازے کی دراز سے جھانک کر دیکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نظر آئے۔ کہنے لگے، خدا کی قسم! یہ تو محمد (ﷺ) سوئے پڑے ہیں۔ ان کے اوپر ان کی چادر موجود ہے۔ چنانچہ یہ لوگ صبح تک وہیں ڈٹے رہے۔ ادھر صبح ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بستر سے اُٹھے تو مشرکین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا، مجھے معلوم نہیں۔[۹]

گھر سے غار تک

رسول اللہ ﷺ ۲۷ صفر ۱۴ سنہ نبوت مطابق ۱۲-۱۳ ستمبر ۶۲۲ء[۱۰] کی درمیانی رات اپنے مکان سے نکل کر جان و مال کے سلسلے میں اپنے سب سے قابلِ اعتماد ساتھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے تھے اور وہاں سے پچھواڑے کی ایک کھڑکی سے نکل کر دونوں حضرات نے باہر کی راہ لی تھی تاکہ مکہ سے جلد از جلد یعنی طلوعِ فجر سے پہلے پہلے باہر نکل جائیں۔

چونکہ نبی ﷺ کو معلوم تھا کہ قریش پوری جانفشانی سے آپ ﷺ کی تلاش میں لگ جائیں گے اور جس راستے پر پہلے اُن کی نظر اُٹھے گی وہ مدینہ کا کارروانی راستہ ہوگا جو شمال کے رخ پر جاتا ہے اس لیے آپ ﷺ نے وہ راستہ اختیار کیا جو اس کے بالکل اُلٹ تھا یعنی یمن جانے والا راستہ جو مکہ کے جنوب میں واقع ہے۔ آپ ﷺ نے اس راستے پر کوئی پانچ میل

---

۹ ایضاً ایضاً

۱۰ رحمۃ للعالمین ۱/ ۹۵۔ صفر کا یہ مہینہ چودھویں سنہ نبوت کا اس وقت ہوگا جب سنہ کا آغاز محرم کے مہینے سے مانا جائے اور اگر سنہ کی ابتدا اسی مہینے سے کریں جس میں آپ ﷺ کو نبوت سے مشرف کیا گیا تھا تو صفر کا یہ مہینہ قطعی طور پر تیرہویں سنہ نبوت کا ہوگا۔ عام اہل سیر نے کہیں پہلا حساب اختیار کیا ہے اور کہیں دوسرا جس کی وجہ سے وہ واقعات کی ترتیب میں خبط اور غلطی میں پڑ گئے ہیں ہم نے سنہ کا آغاز محرم سے مانا ہے۔

کا فاصلہ طے کیا اور اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جو ثور کے نام سے معروف ہے۔ یہ نہایت بلند، پیچ اور مشکل چڑھائی والا پہاڑ ہے۔ یہاں پتھر بھی بکثرت ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے اور کہا جاتا ہے کہ آپ نشانِ قدم چھپانے کے لیے پنجوں کے بل چل رہے تھے اس لیے آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ بہر حال وجہ جو بھی رہی ہو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر آپ ﷺ کو اٹھا لیا اور دوڑتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار کے پاس جا پہنچے جو تاریخ میں غارِ ثور کے نام سے معروف ہے۔[۱۱]

غار میں

غار کے پاس پہنچ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "خدا کے لیے ابھی آپ ﷺ اس میں داخل نہ ہوں۔ پہلے میں داخل ہو کر دیکھے لیتا ہوں، اگر اس میں کوئی چیز ہوئی تو آپ ﷺ کے بجائے مجھے اس سے سابقہ پیش آئے گا۔" چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر گئے اور غار کو صاف کیا۔ ایک جانب چند سوراخ تھے۔ جنہیں اپنا تہ بند پھاڑ کر بند کیا لیکن دو سوراخ باقی بچ رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں پر اپنے پاؤں رکھ دیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ اندر تشریف لائیں۔ آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئے۔ ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا مگر اس ڈر سے ہلے بھی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر ٹپک گئے (اور آپ ﷺ کی آنکھ کھل گئی) آپ ﷺ نے فرمایا: "ابوبکرؓ تمہیں کیا ہوا؟" عرض کی میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعابِ دہن لگا دیا اور تکلیف جاتی رہی۔[۱۲]

یہاں دونوں حضرات نے تین راتیں یعنی جمعہ، سنیچر اور اتوار کی راتیں چھپ کر گذاریں۔[۱۳] اس دوران ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہؓ بھی یہیں رات گذارتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ وہ گہری سوجھ بوجھ کے مالک، سخن فہم نوجوان تھے۔ سحر کی تاریکی میں ان دونوں حضرات کے پاس سے چلے جاتے اور مکہ میں قریش کے ساتھ یوں صبح کرتے گویا انہوں نے یہیں رات گذاری ہے پھر آپ دونوں کے خلاف سازش کی جو کوئی بات سنتے اُسے اچھی طرح یاد کر لیتے اور جب

---

[۱۱] رحمۃ للعالمین ۱/۹۵ مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ ص ۱۶۷

[۱۲] یہ بات رزین نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ پھر یہ زہر پھوٹ پڑا (یعنی موت کے وقت اس کا اثر پلٹ آیا) اور یہی موت کا سبب بنا۔ دیکھیے مشکوٰۃ ۲/۵۵۶ باب مناقب ابی بکر۔

تاریکی گہری ہو جاتی تو اس کی خبر لے کر غار میں پہنچ جاتے۔

ادھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فُہیرہ بکریاں چراتے رہتے اور جب رات کا ایک حصہ گذر جاتا تو بکریاں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ اس طرح دونوں حضرات رات کو آسودہ ہو کر دودھ پی لیتے۔ پھر صبح تڑکے ہی عامر بن فُہیرہ بکریاں ہانک کر چل دیتے۔ تینوں رات انہوں نے یہی کیا۔[۱۳] (مزید یہ کہ) عامر بن فُہیرہ، حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد انہیں کے نشانات قدم پر بکریاں ہانکتے تھے تاکہ نشانات مٹ جائیں۔[۱۵]

قریش کی تگ و دو

اُدھر قریش کا یہ حال تھا کہ جب منصوبۂ قتل کی رات گذر گئی اور صبح کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں تو ان پر گویا جنون طاری ہو گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنا غصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اتارا آپ کو گھسیٹ کر خانہ کعبہ تک لے گئے اور ایک گھڑی زیر حراست رکھا کہ ممکن ہے ان دونوں کی خبر لگ جائے۔[۱۶] لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ حاصل نہ ہوا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ برآمد ہوئیں۔ ان سے پوچھا تمہارے ابا کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا، بخدا مجھے معلوم نہیں کہ میرے ابا کہاں ہیں۔ اس پر کمبخت خبیث ابوجہل نے ہاتھ اٹھا کر اُن کے رخسار پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ ان کے کان کی بالی گر گئی۔[۱۷]

اس کے بعد قریش نے ایک ہنگامی اجلاس کر کے یہ طے کیا کہ ان دونوں کو گرفتار کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل کام میں لائے جائیں؛ چنانچہ مکے سے نکلنے والے تمام راستوں پر خواہ وہ کسی بھی سمت جا رہا ہو نہایت کڑا مسلح پہرہ بٹھا دیا گیا۔ اسی طرح یہ اعلان عام بھی کیا گیا کہ جو کوئی رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یا ان میں سے کسی ایک کو زندہ یا مردہ حاضر کرے گا اسے ہر ایک کے بدلے سو اونٹوں کا گرانقدر انعام دیا جائے گا۔[۱۸] اس اعلان کے نتیجے میں سوار اور پیادے اور نشانات قدم کے ماہر کھوجی نہایت سرگرمی سے تلاش میں لگ گئے اور پہاڑوں، وادیوں اور نشیب و فراز میں ہر طرف بکھر گئے؛ لیکن نتیجہ اور حاصل کچھ نہ رہا۔

تلاش کرنے والے غار کے دہانے تک بھی پہنچے لیکن اللہ اپنے کام پر غالب ہے چنانچہ صحیح بخاری

---

[۱۳] فتح الباری ۷/۲۳۶ [۱۴] صحیح بخاری ۱/۵۵۲، ۵۵۴ [۱۵] ابن ہشام ۱/۴۸۶
[۱۶] رحمۃ للعالمین ۱/۹۶ [۱۷] ابن ہشام ۱/۴۸۷ [۱۸] صحیح بخاری ۱/۵۵۴

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میں نبی ﷺ کے ساتھ غار میں تھا سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کے پاؤں نظر آرہے ہیں۔ میں نے کہا' اے اللہ کے نبیؐ! اگر ان میں سے کوئی شخص محض اپنی نگاہ نیچی کر دے تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ابوبکرؓ! خاموش رہو (ہم) دو ہیں جن کا تیسرا اللہ ہے"۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں مَا ظَنُّكَ يَا اَبَابَكْرٍ بِاثْنَيْنِ اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا۔ ابوبکرؓ! ایسے دو آدمیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، جن کا تیسرا اللہ ہے"[19]

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مشرف فرمایا چنانچہ تلاش کرنے والے اس وقت واپس چلے گئے جب آپؐ کے درمیان اور ان کے درمیان چند قدم سے زیادہ فاصلہ باقی نہ رہ گیا تھا۔

مدینہ کی راہ میں

جب جستجو کی آگ بجھ گئی، تلاش کی تگ و دو رک گئی اور تین روز کی مسلسل اور بے نتیجہ دوڑ دھوپ کے بعد قریش کے جوش و جذبات سرد پڑ گئے تو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے لیے نکلنے کا عزم فرمایا۔ عبداللہ بن اریقط لیثی سے، جو صحرائی اور بیابانی راستوں کا ماہر تھا، پہلے ہی اجرت پر مدینہ پہنچانے کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ یہ شخص ابھی قریش ہی کے دین پر تھا لیکن قابلِ اطمینان تھا اس لیے سواریاں اس کے حوالے کر دی گئی تھیں اور طے ہوا تھا کہ تین راتیں گذر جانے کے بعد وہ دونوں سواریاں لے کر غارِ ثور پہنچ جائے گا۔ چنانچہ جب دوشنبہ کی رات آئی جو ربیع الاول سنہ ۱ھ کی چاند رات تھی (مطابق ۱۶ ستمبر سنہ ۶۲۲ء) تو عبداللہ بن اریقط سواریاں لے کر آگیا اور اسی موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں افضل ترین اونٹنی پیش کرتے ہوئے گذارش کی کہ آپ میری ان دو سواریوں میں سے ایک قبول فرمالیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیمۃً لوں گا"۔

ادھر اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بھی زادِ سفر لے کر آئیں مگر اس میں لٹکانے والا بندھن لگانا بھول گئیں۔ جب روانگی کا وقت آیا اور حضرت اسماءؓ نے توشہ لٹکانا چاہا تو دیکھا کہ اس میں بندھن ہی نہیں

---

[19] ایضاً ۱/۵۱۶، ۵۵۸۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اضطراب اپنی جان کے خوف سے نہ تھا بلکہ اس کا واحد سبب وہی تھا جو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب قیافہ شناسوں کو دیکھا تو رسول اللہ ﷺ پر آپ کا غم فزوں تر ہو گیا اور آپ نے کہا: کہ اگر میں مارا گیا تو میں محض ایک آدمی ہوں لیکن اگر آپؐ قتل کر دیے گئے تو پوری امت ہی غارت ہو جائے گی۔ اور اسی موقع پر ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ غم نہ کرو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ دیکھئے مختصر السیرۃ للشیخ عبداللہ ص ۱۶۸

ہے۔ انہوں نے اپنا پٹکا (کمر بند) کھولا اور دو حصوں میں چاک کر کے ایک میں توشہ لٹکا دیا اور دوسرا کمر میں باندھ لیا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب ذاتُ النِّطاقین پڑ گیا۔[۲۰]

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کوچ فرمایا۔ عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ رہنما عبداللہ بن اریقط نے ساحل کا راستہ اختیار کیا۔

غار سے روانہ ہو کر اس نے سب سے پہلے یمن کے رُخ پر چلایا اور جنوب کی سمت خوب دُور تک لے گیا پھر پچھم کی طرف مڑا اور ساحلِ سمندر کا رخ کیا؛ پھر ایک ایسے راستے پر پہنچ کر جس سے عام لوگ واقف نہ تھے شمال کی طرف مڑ گیا۔ یہ راستہ ساحلِ بحرِ احمر کے قریب ہی تھا اور اس پر شاذ و نادر ہی کوئی چلتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اس راستے میں جن مقامات سے گذرے ابنِ اسحاق نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب راہنما آپ دونوں کو ساتھ لے کر نکلا تو زیریں مکہ سے لے چلا پھر ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا زیریں عُسفان سے راستہ کاٹا، پھر زیریں امج سے گذرتا ہوا آگے بڑھا، اور قدید پار کرنے کے بعد پھر راستہ کاٹا اور وہیں سے آگے بڑھتا ہوا خرار سے گذرا، پھر ثنیۃ المرۃ سے، پھر لقف سے پھر بیابان لقف سے گذرا، پھر مجاح کے بیابان میں پہنچا۔ اور وہاں سے ہو کر پھر مجاح کے موڑ سے گذرا پھر ذوالغضوین کے موڑ کے نشیب میں چلا پھر ذی کشر کی وادی میں داخل ہوا پھر جداجد کا رُخ کیا پھر اجرد پہنچا اور اس کے بعد بیابان تعہن کے اطراف کی وادی ذو سلم سے گذرا۔ وہاں سے عبابید اور اسکے بعد فاجہ کا رُخ کیا پھر عرج میں اترا پھر رکوبہ کے داہنے ہاتھ ثنیۃ العائر میں چلا یہاں تک کہ وادی رئم میں اترا اور اسکے بعد قباء پہنچ گیا۔[۲۱]

آیئے! اب راستے کے چند واقعات بھی سُنتے چلیں۔

۱۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "ہم لوگ (غار سے نکل کر) رات بھر اور دن میں دوپہر تک چلتے رہے۔ جب ٹھیک دوپہر کا وقت ہو گیا راستہ خالی ہو گیا اور کوئی گذرنے والا نہ رہا تو ہمیں ایک لمبی چٹان دکھائی دی جس کے سائے پر دھوپ نہیں آئی تھی۔ ہم وہیں اُتر پڑے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے نبی ﷺ کے سونے کے لیے ایک جگہ برابر کی اور اس پر ایک پوستین بچھا کر گذارش کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ سو جائیں اور میں آپ کے گرد و پیش کی دیکھ بھال کئے لیتا ہوں۔ آپ ﷺ سو گئے اور میں آپ کے گرد و پیش کی دیکھ بھال کے لیے نکلا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چرواہا

---

[۲۰] صحیح البخاری ۱/۵۵۳، ۵۵۵، ابن ہشام ۱/۴۸۶ [۲۱] ابن ہشام ۱/۴۹۱، ۴۹۲

اپنی بکریاں لیے چٹان کی جانب چلا آرہا ہے۔ وہ بھی اس چٹان سے وہی چاہتا تھا جو ہم نے چاہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا' اے جوان تم کس کے آدمی ہو؟ اس نے مکّہ یا مدینہ کے کسی آدمی کا ذکر کیا۔ میں نے کہا' تمہاری بکریوں میں کچھ دودھ ہے؟ اس نے کہا' ہاں۔ میں نے کہا دوہ سکتا ہوں۔ اُس نے کہا ہاں! اور ایک بکری پکڑی۔ میں نے کہا ذرا تھن کو مٹی، بال اور تنکے وغیرہ سے صاف کرلو۔ پھر اس نے ایک کاب میں تھوڑا سا دودھ دوہا اور میرے پاس ایک چرمی لوٹا تھا جو میں نے رسول اللہ ﷺ کے پینے اور وضو کرنے کے لیے رکھ لیا تھا۔ میں نبی ﷺ کے پاس آیا لیکن گوارا نہ ہوا کہ آپ کو بیدار کروں۔ چنانچہ جب آپ بیدار ہوئے تو میں آپؐ کے پاس آیا اور دودھ پر پانی انڈیلا یہاں تک کہ اس کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے کہا' اے اللہ کے رسول ﷺ! پی لیجیے۔ آپؐ نے پیا یہاں تک کہ میں خوش ہوگیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا' کیا ابھی کوچ کا وقت نہیں ہوا؟ میں نے کہا' کیوں نہیں؟ اس کے بعد ہم لوگ چل پڑے۔[22]

۲۔ اس سفر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نبی ﷺ کے ردیف رہا کرتے تھے یعنی سواری پر حضورؐ کے پیچھے بیٹھا کرتے تھے، چونکہ ان پر بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے اس لیے لوگوں کی توجہ انہیں کی طرف جاتی تھی۔ نبی ﷺ پر ابھی جوانی کے آثار غالب تھے اس لیے آپؐ کی طرف توجہ کم جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی آدمی سے سابقہ پڑتا تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھتا کہ یہ آپ کے آگے کون سا آدمی ہے؟ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کا بڑا لطیف جواب دیتے) فرماتے "یہ آدمی مجھے راستہ بتاتا ہے۔" اس سے سمجھنے والا سمجھتا کہ وہ یہی راستہ مراد لے رہے ہیں حالانکہ وہ خیر کا راستہ مراد لیتے تھے۔[23]

۳۔ اسی سفر میں آپ ﷺ کا گذر اُمّ مَعبَدْ خُزاعیہ کے خیمے سے ہُوا۔ یہ ایک نمایاں اور توانا خاتون تھیں۔ ہاتھوں میں گھٹنے ڈالے خیمے کے صحن میں بیٹھی رہتیں اور آنے جانے والے کو کھلاتی پلاتی رہتیں۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ پاس میں کچھ ہے؟ بولیں: "بخدا ہمارے پاس کچھ ہوتا تو آپ لوگوں کی میزبانی میں تنگی نہ ہوتی، بکریاں بھی دُور دراز ہیں۔" یہ قحط کا زمانہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ خیمے کے ایک گوشے میں ایک بکری ہے۔ فرمایا: "اُمّ مَعبد! یہ کیسی بکری ہے؟" بولیں: "اسے کمزوری نے ریوڑ سے پیچھے چھوڑ رکھا ہے۔" آپ ﷺ نے

---

[22] صحیح البخاری ۱/۵۱۰ [23] صحیح البخاری عن انس ۱/۵۵۶

دریافت کیا کہ اس میں کچھ دودھ ہے؟ بولیں: "وہ اس سے کہیں زیادہ کمزور ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اجازت ہے کہ اسے دوہ لوں؟" بولیں: "ہاں میرے ماں باپ تم پر قربان۔ اگر تمہیں اس میں دودھ دکھائی دے رہا ہے تو ضرور دوہ لو۔" اس گفتگو کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس بکری کے تھن پر ہاتھ پھیرا۔ اللہ کا نام لیا اور دعا کی۔ بکری نے پاؤں پھیلا دیئے۔ تھن میں بھرپور دودھ اتر آیا۔ آپؐ نے اُمِّ معبدؓ کا ایک بڑا سا برتن لیا جو ایک جماعت کو آسودہ کر سکتا تھا اور اس میں اتنا دوہا کہ جھاگ اُوپر آگیا۔ پھر اُمِّ معبدؓ کو پلایا۔ وہ پی کر شکم سیر ہوگئیں تو اپنے ساتھیوں کو پلایا۔ وہ بھی شکم سیر ہوگئے تو خود پیا۔ پھر اسی برتن میں دوبارہ اتنا دودھ دوہا کہ برتن بھر گیا اور اسے اُمِّ معبدؓ کے پاس چھوڑ کر آگے چل پڑے۔

تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ان کے شوہر ابو معبدؓ اپنی کمزور بکریوں کو جو دُبلے پن کی وجہ سے ہریل چال چل رہی تھیں، ہانکتے ہوئے آپہنچے۔ دودھ دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے۔ پوچھا یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ جبکہ بکریاں دور دراز تھیں اور گھر میں دودھ دینے والی بکری نہ تھی۔ بولیں: "بخدا کوئی بات نہیں سوائے اس کے کہ ہمارے پاس سے ایک بابرکت آدمی گذرا جس کی ایسی اور ایسی بات تھی اور یہ اور یہ حال تھا۔" ابو معبدؓ نے کہا یہ تو وہی صاحبِ قریش معلوم ہوتا ہے جسے قریش تلاش کر رہے ہیں۔ اچھا ذرا اس کی کیفیت تو بیان کرو۔ اس پر اُمِّ معبدؓ نے نہایت دلکش انداز سے آپ ﷺ کے اوصاف و کمالات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ گویا سننے والا آپؐ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے ـــــ کتاب کے آخیر میں یہ اوصاف درج کئے جائیں گے ـــــ یہ اوصاف سن کر ابو معبدؓ نے کہا: "واللہ یہ تو وہی صاحبِ قریش ہے جس کے بارے میں لوگوں نے قسم قسم کی باتیں بیان کی ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ آپ ﷺ کی رفاقت اختیار کروں اور کوئی راستہ ملا تو ایسا ضرور کروں گا۔"

ادھر مکے میں ایک آواز ابھری جسے لوگ سن رہے تھے مگر اس کا بولنے والا دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ آواز یہ تھی۔

جزی اللہ رب العرش خیر جزائہ ... رفیقین حلا خیمتی ام معبد

ھما نزلا بالبر وارتحلا بہ ... وافلح من امسی رفیق محمد

فیا لقصیٍ ما زوی اللہ عنکم ... بہ من فعال لا یجازی وسؤدد

لیھن بنی کعب مکان فتاتھم ... ومقعدھا للمومنین بمرصد

سلوا اختکم عن شاتھا وانائھا ... فانکم ان تسألوا الشاۃ تشھد

"اللہ رب العرش ان دو رفیقوں کو بہترین جزا دے جو اُمِّ معبد کے خیمے میں نازل ہوئے۔ وہ دونوں خیر کے ساتھ اُترے اور خیر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اور جو محمد ﷺ کا رفیق ہُوا وہ کامیاب ہُوا۔ ہائے قُصَی! اللہ نے اس کے ساتھ کتنے بے نظیر کارنامے اور سرداریاں تم سے سمیٹ لیں۔ بنو کعب کو ان کی خاتون کی قیام گاہ اور مومنین کی نگہداشت کا پڑاؤ مبارک ہو۔ تم اپنی خاتون سے اس کی بکری اور برتن کے متعلق پُوچھو۔ تم اگر خود بکری سے پوچھو گے تو وہ بھی شہادت دے گی۔"

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں ہمیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کدھر کا رخ فرمایا ہے کہ ایک جن زیریں مکّہ سے یہ اشعار پڑھتا ہُوا آیا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، اس کی آواز سن رہے تھے لیکن خود اسے نہیں دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ وہ بالائی مکّہ سے نکل گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ جب ہم نے اس کی بات سنی تو ہمیں معلوم ہُوا کہ رسول اللہ ﷺ نے کدھر کا رُخ فرمایا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا رُخ مدینہ کی جانب ہے۔[۲۴]

۴۔ راستے میں سُراقہ بن مالک نے تعاقب کیا اور اس واقعے کو خود سُراقہ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "میں اپنی قوم بنی مُدلج کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک آدمی آکر ہمارے پاس کھڑا ہُوا اور ہم بیٹھے تھے۔ اس نے کہا' اے سُراقہ! میں نے ابھی ساحل کے پاس چند افراد دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہیں۔ سُراقہ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا یہ وہی لوگ ہیں، لیکن میں نے اس آدمی سے کہا کہ یہ وہ لوگ نہیں ہیں بلکہ تم نے فلاں اور فلاں کو دیکھا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے گذر کر گئے ہیں۔ پھر میں مجلس میں کچھ دیر تک ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد اٹھ کر اندر گیا اور اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ وہ میرا گھوڑا نکالے اور ٹیلے کے پیچھے روک کر میرا انتظار کرے۔ ادھر میں نے اپنا نیزہ لیا اور گھر کے پچھواڑے سے باہر نکلا۔ لاٹھی کا ایک سرا زمین پر گھسیٹ رہا تھا اور دوسرا اوپری سرا نیچے کر رکھا تھا۔ اس طرح میں اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور اس پر سوار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ حسبِ معمول مجھے لے کر دوڑ رہا ہے یہاں تک کہ میں ان کے قریب آگیا۔ اس کے بعد گھوڑا مجھ سمیت پھسلا اور میں اس سے گر گیا۔ میں نے اُٹھ کر ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پانسے کے تیر نکال کر یہ جاننا چاہا کہ میں انہیں ضرر پہنچا سکوں گا یا نہیں تو وہ تیر نکلا جو مجھے ناپسند تھا، لیکن

---

[۲۴] زاد المعاد ۲/۵۳، ۵۴۔ بنو خزاعہ کی آبادی کے محلِ وقوع کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اغلب یہ ہے کہ یہ واقعہ غار سے روانگی کے بعد دوسرے دن پیش آیا ہوگا۔

میں نے تیر کی نافرمانی کی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر دوڑنے لگا یہاں تک کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی قراءت سن رہا تھا ـــــ اور آپ التفات نہیں فرماتے تھے، جبکہ ابوبکرؓ بار بار مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تو میرے گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے یہاں تک کہ گھٹنوں تک جا پہنچے اور میں اس سے گر گیا، پھر میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے اٹھنا چاہا لیکن وہ اپنے پاؤں بمشکل نکال سکا۔ بہرحال جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس کے پاؤں کے نشان سے آسمان کی طرف دھویں جیسا غبار اڑ رہا تھا۔ میں نے پھر پانسے کے تیر سے قسمت معلوم کی اور پھر وہی تیر نکلا جو مجھے ناپسند تھا۔ اس کے بعد میں نے امان کے ساتھ انہیں پکارا تو وہ لوگ ٹھہر گئے اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا۔ جس وقت میں ان سے روک دیا گیا تھا اسی وقت میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ غالب آ کر رہے گا، چنانچہ میں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ کی قوم نے آپ ﷺ کے بدلے دیت (کا انعام) رکھا ہے اور ساتھ ہی میں نے لوگوں کے عزائم سے آپ ﷺ کو آگاہ کیا اور توشہ اور ساز و سامان کی بھی پیش کش کی مگر انہوں نے میرا کوئی سامان نہیں لیا اور نہ مجھ سے کوئی سوال کیا۔ صرف اتنا کہا کہ ہمارے متعلق رازداری برتنا۔ میں نے آپ سے گذارش کی کہ آپ مجھے پروانۂ امن لکھ دیں۔ آپ ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم دیا اور انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ آگے بڑھ گئے۔ [۲۵]

اس واقعے سے متعلق خود ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بھی ایک روایت ہے ان کا بیان ہے کہ ہم لوگ روانہ ہوئے تو قوم ہماری تلاش میں تھی مگر سُراقہ بن مالک بن جعشم کے سوا، جو اپنے گھوڑے پر آیا تھا، اور کوئی ہمیں نہ پا سکا۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ پیچھا کرنے والا ہمیں آ لینا چاہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

"غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" [۲۶]

بہرحال سُراقہؓ واپس ہوا تو دیکھا کہ لوگ تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کہنے لگا ادھر کی کھوج خبر لے

---

[۲۵] صحیح بخاری ۱/۵۵۴ ـــ بنی مُدلج کا وطن رابغ کے قریب تھا اور سُراقہ نے اس وقت آپ کا پیچھا کیا تھا جب آپ قدید سے اوپر جا رہے تھے (زاد المعاد ۲/۵۳) اس لیے اغلب یہ ہے کہ غار سے روانگی کے بعد تیسرے دن تعاقب کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

[۲۶] صحیح بخاری ۱/۵۱۶ [۲۷] زاد المعاد ۲/۵۳

چکا ہوں۔ یہاں تمہارا جو کام تھا وہ کیا جا چکا ہے۔ (اس طرح لوگوں کو واپس لے گیا) یعنی دن کے شروع میں تو چرواہا آرہا تھا اور آخر میں پاسبان بن گیا۔ [۲۷]

۵۔ راستے میں نبی ﷺ کو بُرَیدہ اسلمی ملے، یہ اپنی قوم کے سردار تھے اور قریش نے جس زبردست انعام کا اعلان کر رکھا تھا اسی کے لالچ میں نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکلے تھے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ سے سامنا ہوا اور بات چیت ہوئی تو نقد دل دے بیٹھے اور اپنی قوم کے ستر آدمیوں سمیت وہیں مسلمان ہو گئے۔ پھر اپنی پگڑی اتار کر نیزہ سے باندھ لی جس کا سفید پھریرا ہوا میں لہراتا اور بشارت سناتا تھا کہ امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، دُنیا کو عدالت و انصاف سے بھرپور کرنے والا تشریف لا رہا ہے۔ [۲۸]

۶۔ راستے میں نبی ﷺ کو حضرت زُبَیر بن عوام رضی اللہ عنہ ملے۔ یہ مسلمانوں کے ایک تجارت پیشہ گروہ کے ساتھ ملک شام سے واپس آرہے تھے۔ حضرت زبیرؓ نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید پارچہ جات پیش کئے۔ [۲۹]

قبا میں تشریف آوری

دوشنبہ ۸ ربیع الاول ۱۴ سنہ نبوت یعنی ۱ سنہ ہجری مطابق ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء کو رسول اللہ ﷺ قبا میں وارد ہوئے۔ [۳۰]

حضرت عروۃ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مسلمانانِ مدینہ نے مکہ سے رسول اللہ ﷺ کی روانگی کی خبر سن لی تھی اس لیے لوگ روزانہ صبح ہی صبح حرّہ کی طرف نکل جاتے اور آپؐ کی راہ تکتے رہتے۔ جب دوپہر کو دھوپ سخت ہو جاتی تو واپس چلے آتے۔ ایک روز طویل انتظار کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو پہنچ چکے تھے کہ ایک یہودی اپنے کسی ٹیلے پر کچھ دیکھنے کے لیے چڑھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے رفقاء سفید کپڑوں میں ملبوس ـــ جن سے چاندنی چھٹک رہی تھی ـــ تشریف لا رہے ہیں۔ اس نے بیخود ہو کر نہایت بلند آواز سے کہا: "عرب کے لوگو! یہ رہا تمہارا نصیب جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔" یہ سنتے ہی مسلمان ہتھیاروں کی طرف دوڑ

---

[۲۸] رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۱ [۲۹] صحیح بخاری عن عروۃ ابن الزبیر ۱/۵۵۴

[۳۰] رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۲۔ اس دن نبی ﷺ کی عمر بغیر کسی کمی بیشی کے ٹھیک ترپن سال ہوئی تھی اور جو لوگ آپؐ کی نبوت کا آغاز ۹ ربیع الاول ۴۱ سنہ عام الفیل سے مانتے ہیں انکے قول کے مطابق آپؐ کی نبوت پر ٹھیک تیرہ سال پورے ہوئے تھے۔ البتہ جو لوگ آپؐ کی نبوت کا آغاز رمضان ۴۱ سنہ عام الفیل سے مانتے ہیں ان کے قول کے مطابق بارہ سال پانچ مہینے اٹھارہ دن یا بائیس دن ہوئے تھے۔

پڑے۔[۳۱] (اور ہتھیار سج دھج کر استقبال کے لیے امنڈ پڑے)

ابن قیم کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی بنی عمرو بن عوف (ساکنان قبا) میں شور بلند ہوا اور تکبیر سنی گئی۔ مسلمان آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے استقبال کے لیے نکل پڑے۔ پھر آپ ﷺ سے مل کر تحیۂ نبوت پیش کیا اور گرد و پیش پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ اس وقت آپ ﷺ پر سکینت چھائی ہوئی تھی۔ اور یہ وحی نازل ہو رہی تھی۔

فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ○ (۶۶:۴)

"اللہ آپ کا مولیٰ ہے اور جبریل علیہ السلام اور صالح مومنین بھی اور اس کے بعد فرشتے آپ کے مددگار ہیں۔"[۳۲]

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ لوگوں سے ملنے کے بعد آپ ان کے ساتھ داہنی جانب مڑے اور بنی عمرو بن عوف میں تشریف لائے۔ یہ دوشنبہ کا دن اور ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آنے والوں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور رسول اللہ ﷺ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ انصار کے جو لوگ آتے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہ تھا وہ سیدھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلام کرتے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ پر دھوپ آگئی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چادر تان کر آپ ﷺ پر سایہ کیا تب لوگوں نے پہچانا کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔[۳۳]

آپ ﷺ کے استقبال اور دیدار کے لیے سارا مدینہ امنڈ پڑا تھا۔ یہ ایک تاریخی دن تھا جس کی نظیر سرزمین مدینہ نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ آج یہود نے بھی حبقوق نبی کی اس بشارت کا مطلب دیکھ لیا تھا "کہ اللہ جنوب سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا۔"[۳۴]

رسول اللہ ﷺ نے قبا میں کلثوم بن ہدم ـــــ اور کہا جاتا ہے کہ سعد بن خیثمہ ـــــ کے مکان میں قیام فرمایا ـــــ پہلا قول زیادہ قوی ہے۔

ادھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مکہ میں تین روز ٹھہر کر اور لوگوں کی جو امانتیں

---

[۳۱] صحیح بخاری ۱/۵۵۵ [۳۲] زاد المعاد ۲/۵۴ [۳۳] صحیح بخاری ۱/۵۵۵
[۳۴] کتاب بائبل، صحیفہ حبقوق ۳، ۳

رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں انہیں ادا کر کے پیدل ہی مدینہ کا رخ کیا اور قبا میں رسول اللہ ﷺ سے آملے اور کلثوم بن ہدم کے یہاں قیام فرمایا [۳۵]

رسول اللہ ﷺ نے قبا میں کل چار دن [۳۶] (دوشنبہ، منگل، بدھ، جمعرات) یا دس سے زیادہ دن یا پہنچ اور روانگی کے علاوہ ۲۴ دن قیام فرمایا اور اسی دوران مسجد قبا کی بنیاد رکھی اور اس میں نماز بھی پڑھی۔ یہ آپ ﷺ کی نبوت کے بعد پہلی مسجد ہے جس کی بنیاد تقوی پر رکھی گئی۔ پانچویں دن (یا بارہویں دن یا چھبیسویں دن) جمعہ کو — آپؐ حکم الٰہی کے مطابق سوار ہوئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ردیف تھے۔ آپؐ نے بنو النجار کو — جو آپ ﷺ کے ماموؤں کا قبیلہ تھا — اطلاع بھیج دی تھی۔ چنانچہ وہ تلواریں حمائل کئے حاضر تھے۔ آپؐ نے (ان کی معیت میں) مدینہ کا رُخ کیا۔ بنو سالم بن عوف کی آبادی میں پہنچے تو جمعہ کا وقت آگیا۔ آپؐ نے بطنِ وادی میں اس مقام پر جمعہ پڑھا جہاں اب مسجد ہے۔ کل ایک سو آدمی تھے۔ [۳۷]

مدینہ میں داخلہ

جمعہ کے بعد نبی ﷺ مدینہ تشریف لے گئے اور اسی دن سے اس شہر کا نام یثرب کے بجائے مدینۃ الرسول۔ شہرِ رسول ﷺ پڑ گیا جسے مختصراً مدینہ کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت تابناک تاریخی دن تھا۔ گلی کوچے تقدیس و تحمید کے کلمات سے گونج رہے تھے اور انصار کی بچیاں خوشی و مسرت سے ان اشعار کے نغمے بکھیر رہی تھیں [۳۸]

اَشْرَقَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

"ان پہاڑوں سے جو ہیں سوئے جنوب چودھویں کا چاند ہے ہم پر چڑھا

---

[۳۵] زاد المعاد ۲/۵۴ - ابن ہشام ۱/۴۹۳ - رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۲

[۳۶] یہ ابن اسحاق کی روایت ہے۔ دیکھئے ابن ہشام ۱/۴۹۴۔ اسی کو علامہ منصور پوری نے اختیار کیا ہے۔ دیکھئے رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۲۔ لیکن صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قبا میں ۲۴ رات قیام فرمایا (۱/۶۱) مگر ایک اور روایت میں دس رات سے چند روز زیادہ (۱/۵۵۵) اور ایک تیسری روایت میں چودہ رات (۱/۵۶۰) بتایا گیا ہے۔ ابن قیم نے اسی آخری روایت کو اختیار کیا ہے مگر ابن قیم نے خود تصریح کی ہے کہ آپؐ قبا میں دوشنبہ کو پہنچے تھے اور وہاں سے جمعہ کو روانہ ہوئے تھے۔ (زاد المعاد ۲/۵۴، ۵۵) اور معلوم ہے کہ دوشنبہ اور جمعہ دو الگ الگ ہفتوں کا لیا جائے تو پہنچ اور روانگی کا دن چھوڑ کر کل مدت دس دن ہوتی ہے اور پہنچ اور روانگی کا دن شامل کر کے ۱۲ دن ہوتی ہے اس لیے کل مدت چودہ دن کیسے ہو سکے گی۔

[۳۷] صحیح بخاری ۱/۵۵۵، ۵۶۰ - زاد المعاد ۲/۵۵ - ابن ہشام ۱/۴۹۴ - رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۲۔

[۳۸] اشعار کا یہ ترجمہ علامہ منصور پوریؒ نے کیا ہے۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ یہ اشعار (باقی اگلے صفحہ پر)

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

کیسا عمدہ دین اور تعلیم ہے شکر واجب ہے ہمیں اللہ کا

اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

ہے اطاعت فرض تیرے حکم کی بھیجنے والا ہے تیرا کبریا[۳۸]

انصار اگرچہ بڑے دولت مند نہ تھے لیکن ہر ایک کی یہی آرزو تھی کہ رسول اللہ ﷺ اس کے یہاں قیام فرمائیں؛ چنانچہ آپ ﷺ انصار کے جس مکان یا محلے سے گذرتے وہاں کے لوگ آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لیتے اور عرض کرتے کہ تعداد و سامان اور ہتھیار و حفاظت فرش راہ ہیں تشریف لائیے؛ مگر آپ ﷺ فرماتے کہ اونٹنی کی راہ چھوڑ دو۔ یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ چنانچہ اونٹنی مسلسل چلتی رہی اور اس مقام پر پہنچ کر بیٹھی جہاں آج مسجد نبوی ہے؛ لیکن آپ ﷺ نیچے نہیں اترے یہاں تک کہ وہ اٹھ کر تھوڑی دور گئی، پھر مڑ کر دیکھنے کے بعد پلٹ آئی اور اپنی پہلی جگہ بیٹھ گئی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نیچے تشریف لائے۔ یہ آپ کے ننہیال والوں یعنی بنو نجار کا محلہ تھا اور یہ اونٹنی کے لیے محض توفیق الٰہی تھی کیونکہ آپ ﷺ ننہیال میں قیام فرما کر ان کی عزت افزائی کرنا چاہتے تھے۔ اب بنو نجار کے لوگوں نے اپنے اپنے گھر لے جانے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے عرض معروض شروع کی لیکن ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے لپک کر کجاوہ اٹھا لیا اور اپنے گھر لے کر چلے گئے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے، آدمی اپنے کجاوے کے ساتھ ہے۔ ادھر حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے آکر اونٹنی کی نکیل پکڑ لی۔ چنانچہ یہ اونٹنی انہیں کے پاس رہی۔[۳۹]

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "ہمارے کس آدمی کا گھر زیادہ قریب ہے؟" حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا، اے اللہ کے رسول! یہ رہا میرا مکان اور یہ رہا میرا دروازہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جاؤ! اور ہمارے لیے قیلولہ کی جگہ تیار

(بقیہ نوٹ صفحہ تبوک سے نبی ﷺ کی واپسی پر پڑھے گئے تھے اور جو یہ کہتا ہے کہ مدینہ میں آپ ﷺ کے داخلے کے موقعے پر پڑھے گئے تھے اسے وہم ہوا ہے (زاد المعاد ۳/۱۰) لیکن علامہ ابن قیم نے اس کے وہم ہونے کی کوئی تشفی بخش دلیل نہیں دی ہے۔ ان کے برخلاف علامہ منصور پوری نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ اشعار مدینہ میں داخلے کے وقت پڑھے گئے اور ان کے پاس اس کے ناقابل تردید دلائل بھی ہیں۔ دیکھئے رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۶

[۳۹] زاد المعاد ۲/۵۵۔ رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۶

کر دو۔ انہوں نے عرض کی کہ آپ دونوں حضرات تشریف لے چلیں اللہ برکت دے۔[۴۰]

چند دن بعد آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور آپ کی دونوں صاحبزادیاں حضرت فاطمہؓ اور ام کلثومؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ اور اُمِّ ایمنؓ بھی آگئیں۔ ان سب کو حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ آل ابی بکر کے ساتھ جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں لے کر آئے تھے؛ البتہ نبی ﷺ کی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ، حضرت ابو العاصؓ کے پاس باقی رہ گئیں۔ انہوں نے آنے نہیں دیا اور وہ جنگِ بدر کے بعد تشریف لا سکیں۔[۴۱]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ کو بخار آگیا۔ میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ۔ ابا جان آپ کا کیا حال ہے؟ اور اے بلال! آپ کا کیا حال ہے؟ وہ فرماتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ کو بخار آتا تو یہ شعر پڑھتے!

كُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ وَالْمَوْتُ أَدْنَى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

"ہر آدمی سے اسکے اہل کے اندر صبح بخیر کہا جاتا ہے حالانکہ موت اُسکے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حالت کچھ سنبھلتی تو وہ اپنی کربناک آواز بلند کرتے اور کہتے:

الا ليت شعري هل ابيتن ليلة بواد وحولي اذخر و جليل

وهل اردن يوما مياه مجنة وهل يبدون لي شامة وطفيل

"کاش میں جانتا کہ کوئی رات وادی (مکہ) میں گذار سکوں گا اور میرے گرد اِذخر اور جلیل (گھاس) ہوں گی۔ اور کیا کسی دن مجنہ کے چشمے پر وارد ہو سکوں گا اور مجھے شامہ اور طفیل (پہاڑ) دکھلائی پڑیں گے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا "اے اللہ! ہمارے نزدیک مدینہ کو اسی طرح محبوب کر دے جیسے مکہ محبوب تھا یا اس سے بھی زیادہ اور مدینہ کی فضا صحت بخش بنا دے اور اس کے صاع اور مُد (غلے کے پیمانوں) میں برکت دے اور اس کا بخار منتقل کر کے جحفہ پہنچا دے۔"[۴۲] اللہ نے آپ ﷺ کی دُعا سُن لی اور حالات بدل گئے۔

یہاں تک حیاتِ طیبہ کی ایک قسم اور اسلامی دعوت کا ایک دور (یعنی مکی دور) پورا ہو جاتا ہے۔

---

[۴۰] صحیح بخاری ۱/۵۵۶ [۴۱] زاد المعاد ۲/۵۵ [۴۲] صحیح بخاری ۱/۵۸۸، ۵۸۹